www.facebook.com/Naat.Research.Centre

www.sabih-rehmani.com/books

نعتیہ ادب کا کتابی سلسلہ

نعت رنگ

شمارہ ۷ | حمد نمبر | اگست ۱۹۹۹ء

مرتب
صبیح رحمانی

منتظم اعلیٰ
صاحب زادہ انور جمال بدخشانی

شعبۂ اشتہارات
عاطف معین قاسمی، عدیل قاسمی

مجلس مشاورت
رشید وارثی — عزیز احسن
نور احمد میرٹھی — سید معراج جامی

بیرون ملک نمائندے
واصل عثمانی : سعودی عرب
رئیس وارثی : امریکا
سید علی مرتضیٰ رضوی : برطانیہ

ہندوستان میں
ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط (کل گاؤں)
ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی (علی گڑھ)
ساجد صدیقی لکھنوی (لکھنؤ)
ندیم صدیقی (ممبئی)

اس شمارے کی قیمت

پاکستان : ۱۰۰ روپے

بیرون ملک
(بذریعہ ایئر میل)

سعودی عرب	:	25 ریال
یو اے ای	:	30 درہم
امریکا	:	8 ڈالر
برطانیہ	:	5 پاؤنڈ

سرورق پر

سورۂ البقرہ آیت ۱۳۸

استاد شفیق الزماں

خطاط مسجد نبویؐ شریف (مدینہ منورہ)

کے فن کا نمونہ ہے۔

ناشر
اقلیم نعت

CONTACT :
E-25, Phase-V, T&T Flats,
Shadman-II, North Karachi, Pakistan.
Tel : (92-21) 6901212
Fax : (92-21) 4941723
Email : fazlee@cyber.net.pk

مرتب و ناشر صبیح رحمانی نے فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ سے چھپوا کر مرکزی دفتر اقلیم نعت
۲۵۔ای، ٹی اینڈ ٹی فلیٹس، فیز ۵، شادمان ٹاؤن نمبر ۲، شمالی کراچی ۷۵۸۵۰ سے شائع کیا۔

پاکستانی ادب کو اوّلین مجموعۂ حمد دینے والے

معروف صاحبِ طرز شاعر

مظفؔر وارثی

کے نام

ہم
اقلیم نعت کو "نعت رنگ" کے
حمد نمبر
کی اشاعت پر
مبارک باد
پیش کرتے ہیں
ناز ٹیکسٹائل (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کراچی

دھنک

ابتدائیہ — صبیح رحمانی — ۹

مقالات و مضامین

۱۔ حمد و مناجات کی دینی و ادبی قدر و قیمت — مولانا سید ابوالحسن علی ندوی — ۱۱

۲۔ مبادیاتِ حمد — رشید وارثی — ۱۸

۳۔ اردو کی حمدیہ شاعری میں فلسفیانہ رجحان — ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط — ۴۸

۴۔ حمد، عبد شکور کا فخر اور عبد مجبور کا سہارا — پروفیسر محمد اقبال جاوید — ۶۰

۵۔ اردو کی متصوفانہ حمدیہ شاعری — ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط — ۷۵

۶۔ حمدیہ شاعری پر تنقید — ڈاکٹر عاصی کرنالی — ۸۳

۷۔ حمد و مناجات ہندی اور اردو ادب میں — ڈاکٹر سید وقار احمد رضوی — ۸۸

۸۔ اردو مثنوی میں حمد و مناجات — ڈاکٹر سید عبدالباری — ۹۵

۹۔ حمد و مناجات بیسویں صدی میں — ڈاکٹر طفیل احمد مدنی — ۱۰۷

۱۰۔ ہندو شعرا کی حمد نگاری — نور احمد میرٹھی — ۱۱۵

حمدیہ نظمیں

۱۳۳

سرشار صدیقی (کراچی) کرامت بخاری (لاہور) عنبر بہرائچی (بھارت)
نصیر احمد ناصر (آزاد کشمیر) سلیم شہزاد (بھارت) رئیس وارثی (امریکا)

فکر و فن

۱۔ ابوالعتاہیہ ابونواس اور اسماعیل صبری کی حمدیہ شاعری — ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی — ۱۴۳

۲۔ سعدیؒ کی حمد و مناجات | ڈاکٹر محمد ثناء اللہ عمری | ۱۷۵
۳۔ فارسی حمد و مناجات میں مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کا مقام | ڈاکٹر محمود الحسن عارف | ۱۸۶
۴۔ کلام اقبال میں حمد و مناجات | مولانا عبیداللہ کوٹی | ۲۰۲
۵۔ بہزاد لکھنوی کی حمد و مناجات کا تنقیدی مطالعہ | ڈاکٹر محمد اقبال حسین | ۲۱۳
۶۔ حافظ لدھیانوی کی حمدیہ شاعری | پروفیسر حفیظ تائب | ۲۲۱
۷۔ مظفر وارثی کا حمدیہ آہنگ | عزیز احسن | ۲۲۶
۸۔ آفتاب کریمی کی حمدیہ شاعری | پروفیسر آفاق صدیقی | ۲۳۷

تجزیاتی مطالعہ

ایک حمد کا تجزیاتی مطالعہ | عزیز احسن | ۲۴۴

حمدیں

عمر خیام/ صبا اکبر آبادی (مرحوم) وقار صدیقی اجمیری (مرحوم) حفیظ تائب (لاہور)
حافظ لدھیانوی (فیصل آباد) حنیف اسعدی (کراچی) شبنم رومانی (کراچی)
اسلم انصاری (ملتان) علیم ناصری (لاہور) ظفر مراد آبادی (بھارت)
قمر عباس وفا کانپوری (کراچی) سید رفیق عزیزی (کراچی) اشفاق انجم (بھارت)
ثنا گھورکھ پوری (کراچی) محمد اظہار الحق (اسلام آباد) عزیز احسن (کراچی)
افضال احمد انور (فیصل آباد) افضل الفت (کراچی) عزیز الدین خاکی (کراچی)
صبیح رحمانی (کراچی)

مطالعہ کتب

۱۔ انتخاب حمد: ایک تبصرہ | مبین مرزا | ۲۷۶
۲۔ قلم سجدے ایک تاثر | ڈاکٹر عبدالغنی فاروق | ۲۸۰

☆☆☆
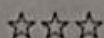
اقلیم نعت کو "نعت رنگ" کے

حمد نمبر

کی اشاعت پر

مبارک باد

پیش کرتے ہیں

منجانب: سید محمد حنیف (کراچی)

نمونۂ خطاطی ماخوذ از

''تذکرۂ خطاطین'' مؤلفہ محمد راشد شیخ

ابتدائیہ

حمد باری تعالیٰ کی دینی اہمیت، افادیت اور فضیلت پر بے شمار آیات قرآنی و ارشادات محبوب سبحانی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے سامنے موجود ہیں جو حمد کو عبادت کا درجہ عطا کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ حمد صرف ایک صنف سخن ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے نطقِ ایمانی کی حیثیت سے بھی سامنے آتی ہے۔

شعر و ادب کے جو خزینے ہمیں اپنے متقدمین کی میراث کی صورت میں ملے ہیں، ان میں حمد کا رنگ و آہنگ نہایت نمایاں ہے۔ عربی و فارسی کے تناظر میں بھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حمد کی ایک توانا روایت شعر و ادب کا حصہ تھی۔ اردو کے تو خیر سبھی شعرا نے اسے اپنا موضوع قرار دیتے ہوئے اپنے دواوین کا آغاز حمد سے کیا یہی نہیں بلکہ اردو پر مسلم تہذیب کے گہرے اثرات کے باعث غیر مسلم شعرا کے ہاں بھی حمد نگاری کے رجحان نے فروغ پایا اور وہ بھی اپنے دواوین کا آغاز حمد سے کرنے لگے۔ اس طرح دامنِ اردو میں ایک کثیر سرمایہ حمد جمع ہوتا گیا، بدقسمتی سے ہمارے نقادان فن نے ادب و دین کو دو خانوں میں بانٹ رکھا ہے اور ان کے یہاں مذہبی شاعری بحیثیت صنف سخن کچھ زیادہ درخور اعتنا نہیں سمجھی گئی، جس کی وجہ سے ہماری دینی شاعری ارتقائی مراحل تو طے کرتی رہی لیکن اپنے فن اور اسلوب کے اعتبار سے دیگر اصنافِ سخن کی ہم پلہ ہوسکی اور نہ ہی اس کی ادبی قدر و قیمت کا تعین ہوسکا۔ حمد پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے اور اسے رسماً اختیار کیا جانے لگا۔

الحمدللہ، ہمارے عہد میں مذہبی شاعری سے کم اعتنائی کا یہ رویہ رفتہ رفتہ ختم ہوتا جارہا ہے، اور ہمارے اربابِ تنقید و اہلِ تحقیق ان جواہر پاروں کی ادبی پرکھ کی جانب توجہ کررہے ہیں۔ نعت اور مرثیہ پر خاصا کام ہوچکا ہے، کئی تحقیقی و تنقیدی مقالے شائع ہوچکے ہیں جو ان اصناف کے ادبی خدوخال کو اُجاگر کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہورہے ہیں۔ ان اصناف کے ساتھ ساتھ اب حمد پر بھی خصوصی توجہ دی جارہی ہے، کئی خالص حمدیہ مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہوچکے ہیں، کئی حمدیہ

منتخبات منظر عام پر آچکے ہیں جو ہمارے حمدیہ ادب کے صدیوں کے سفر کو سامنے لارہے ہیں۔تاہم حمدیہ ادب کے تنقیدی و تحقیقی مطالعے کی صورت میں کوئی کتاب اس وقت تک منظر عام پر نہیں آئی ہے، صرف چند رسائل و جرائد کے حمد نمبر شائع ہوئے ہیں جن میں موضوع کی وسعت اور ہمہ گیریت کا احاطہ کرنے کی مخلصانہ مگر ناتمام کاوش و جستجو دکھائی دیتی ہے۔ اس مجموعی فضا میں ہم ''نعت رنگ'' کا ''حمد نمبر'' پیش کررہے یں اور وہ بھی بغیر کسی دعوے کے۔حمدیہ ادب پہ ہونے والے کام کے تناظر میں ہمارے کام کی اہمیت اور افادیت کا تعین آپ کو کرنا ہے۔ اپنے اس کام کے حوالے سے ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ یہ نمبر مرتب کرتے ہوئے ہم نے اُن سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو عام طور پر بار بار حمد کے حوالے سے سامنے آتے رہے ہیں، چاہے وہ نعت کے مقابلے میں حمد کی طرف عدم توجہی سے متعلق ہوں یا حمد کے موضوعات اس کے رجحانات، اس کی دینی و ادبی اہمیت کے بارے میں۔ہمیں یقین ہے کہ ''نعت رنگ'' کا یہ ''حمد نمبر'' آئندہ حمدیہ ادب پر کام کرنے والوں کے ولیے ایک بنیادی حوالہ ٹھہرے گا اور اس راہ دین و دل کے مسافروں کی منور راستوں کی طرف راہ نمائی کرے گا۔

ہماری دعا ہے کہ ''نعت رنگ'' کا یہ ساتواں شمارہ جو اس کے سجدۂ شکر کے طور پر سامنے آرہا ہے اس کے مصنفین، معاونین، منتظمین اور قارئین کے لیے وسیلہ نجات بن جائے، آمین۔

صبیح رحمانی

☆☆☆

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (بھارت)

حمد و مناجات کی دینی و ادبی قدر و قیمت

ظہور اسلام اور بعثتِ محمدی سے پیشتر عبد و معبود کا رشتہ نہایت کمزور' بے روح' افسردہ و پژمردہ بلکہ بے جان اور مردہ اور ایک سایہ سا بن کر رہ گیا تھا' جس میں نہ یقین کی طاقت تھی' نہ محبت کی حرارت' نہ عبد و معبود کا راز و نیاز تھا اور نہ سازِ دل کا سوز و ساز' نہ اپنے فقر و احتیاج' عجز و درماندگی' بیچارگی و بے بسی' بے مائیگی و بے بضاعتی کا احساس تھا' نہ خدا کی صفتِ جود' قدرت کاملہ اور خزانۂ غیب کی وسعت کا علم' پوری پوری ملتوں اور وسیع وسیع رقبوں میں' خدا کو بس تہواروں اور تقریبوں اور سخت مصیبتوں اور پریشانیوں میں یاد کرنے اور اس سے دعا و سوال کرنے کا رواج رہ گیا تھا۔ مذہبی قوموں میں بھی وہ افراد گنے چنے رہ گئے تھے جو ہر وقت خدا کو یاد کرتے ہوں۔ اس کو حاضر و ناظر سمجھتے ہوں اور اس سے ان کا تعلق ایک ایسا زندہ' محسوس اور جذباتی ہو کہ وہ اس کو اپنا حقیقی کارساز اور مشکل کشا' دست گیر اور فریاد رس سمجھتے ہوں اور ان کو اس کی قدرتِ کاملہ پر ایسا بھروسہ اور اس کی محبت و شفقت پر ایسا ناز ہو جیسا کم از کم ایک بچہ کو اپنی چاہنے والی ماں یا کسی غلام کو اپنے کریم آقا اور طاقت ور بادشاہ پر ہوتا ہے۔

نبوت محمدی ﷺ کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس تعلق کے خیال کو واقعہ' سایہ کو اصل' رسم کو حقیقت' زندگی میں دو چار مرتبہ یا برسوں میں کبھی کبھی ہونے والے عمل کو صبح و شام کا مشغلہ اور روزمرہ کا معمول بنا دیا بلکہ اس کو ایک مومن کے لئے ہوا اور پانی کی طرح ضروری کر دیا جس کے بغیر زندگی محال ہے اور جن کی شان یہ تھی کہ :

ولا یذکرون اللہ الاّ قلیلاً (سورۃ النساء۔ ۱۴۲)

"وہ اللہ کو بہت ہی کم بس کبھی کبھار یاد کر لیتے ہیں۔"

ان کی شان یہ ہو گئی کہ :

الذین یذکرون اللہ قیاماً و قعوداً و علیٰ جنوبھم (سورۃ آل عمران۔ ۱۹۱)

"وہ یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے بیٹھے اور کروٹ پر لیٹنے کی حالت میں بھی۔"

اور جو صرف سخت مصیبت اور جان کے خطرے ہی میں خدا کو یاد کرنے سے آشنا تھے

واذا غشیهم موج کالظلل دعوا الله مخلصین له الدّین (سورۃ لقمان۔۳۲)

"اور جب ان پر چھا جاتی ہیں سمندر کی موجیں سائبانوں کی طرح تو وہ پکارتے ہیں اللہ کو اور دہائی دیتے ہیں اس کی اور اخلاص سے عبادت کرنے لگتے ہیں اسی کی۔"

ان کا حال ہو گیا:

تتجا فی جنوبهم عن المضاجع یدعون ربهم خوفاً و طمعاً (سورۃ السجدہ۔۱۶)

"وہ خواب گاہوں کو چھوڑ کر عبادت میں مصروف رہتے ہیں اپنے پروردگار کے عذاب کے خوف سے اور رحمت کی امید میں۔"

جن کے لئے خدا کا یاد کرنا ایک مجاہدہ اور خلافِ طبیعت عمل تھا اور اس وقت ان کی کیفیت وہ ہوتی تھی جس کو قرآن مجید میں:

کانما یصعد فی السمآء "جیسے کہ ان کو آسمان پر چڑھنا پڑ رہا ہے۔" (سورۃ الانعام۔۱۲۶)

کے بلیغ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کے لئے خدا کو بھلانا اس کی یاد سے غافل رہنا شدید ترین مجاہدہ اور نہایت تکلیف دہ سزا بن گئی جو ذکر و عبادت کی فضا میں اس طرح بے چین رہتے تھے جیسے پرندہ قفس میں ان کا حال یہ ہو گیا کہ ان کو اگر ذکر و دعا سے باز رکھا جائے اور اس پر پابندی عائد کی جائے تو ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگیں۔

عبد و معبود کے رشتہ کے اس استحکام اور دوام کے لئے نبوت محمدی ﷺ اور تعلیمات محمدی ﷺ نے جو ذرائع اختیار کئے ان کے دو عنوان ہیں ایک ذکر و حمد خداوندی دوسرے دعا و مناجات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی جس طرح حمد کی ذکر کی تاکید فرمائی اس کے جو فضائل و منافع بیان فرمائے اس کے جن اسرار و حکم کی نقاب کشائی فرمائی اس کے بعد حمد و ذکر محض ایک فریضہ اور ضابطہ نہیں رہ جاتے بلکہ وہ زندگی کی ایک بنیادی ضرورت فطرت انسانی کا ایک خاصہ روح کی غذا اور دل کی دوا بن جاتے ہیں۔ پھر اس کے لئے الہامِ خداوندی سے جو اوقات و مواقع جو اسباب و محرکات تجویز فرمائے اور ان کے لئے جو صیغے اور الفاظ تعلیم فرمائے وہ توحید کی تکمیل کرنے والے عبدیت کے قالب میں روح ڈالنے والے قلب کو نور سے زندگی کو سکینت و سرور سے اور فضا کو برکت و نورانیت سے بھرپور کرنے والے ہیں پھر وہ اس قدر عمومی پوری زندگی کی وسعت و تنوعات اور شب و روز کے اوقات پر محیط ہیں کہ اگر ان کا ذرا بھی اہتمام کیا جائے تو پوری زندگی ایک مسلسل حمد اور مکمل ذکر میں تبدیل ہو جاتی ہے اور مشکل سے کوئی وقت کوئی کام کوئی نقل و حرکت اور کوئی پیش آنے والی حالت و تبدیلی اس کی رفاقت اور شمولیت سے محروم رہتی ہے۔

اس حمد و ذکر میں اگرچہ ہر وہ چیز شامل ہے جس میں اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کا استحضار ہو اور ہر

وہ کام داخل ہے جو غفلت سے آزاد ہو کر کیا جائے اور اس کا سب سے بڑا مظہر اور اعلیٰ نمونہ حمد و مناجات ہے۔

نبوتِ محمدی ﷺ نے دعا و مناجات کو دین کا ایک مستقل شعبہ بنا دیا اور مذاہب و ملل اور نبوت و روحانیت کی وسیع تاریخ کو سامنے رکھ کر بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ نبوت محمدی ﷺ نے اس شعبہ کا جس طرح احیاء و تجدید اور اس کی ترقی و تکمیل فرمائی اور اس کو جو زندگی، قوت، وسعت، عمومیت، دل آویزی و دل کشی، تازگی و رعنائی، توانائی و برنائی عطا فرمائی، وہ نہ اس سے پہلے دیکھنے میں آئی نہ اس کے بعد، در حقیقت نبوت محمدی ﷺ جہاں کئی اور چیزوں کی مکمل اور خاتم ہے، وہاں اس شعبہ کی بھی، اور یہ شعبہ بھی آپؐ کے ختم نبوت کی ایک دلیل اور آپؐ کے خاتم النبیین ہونے کا ایک ثبوت ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (ارواحنا و نفوسنا فداہ) نے محروم و محجوب انسانیت کو دوبارہ دعا و مناجات کی دولت عطا فرمائی اور بندوں کو خدا سے ہم کلام کر دیا اور دعا کی کیا دولت عطا فرمائی، بندگی کی بلکہ زندگی کی لذت اور عزت عطا فرمائی اس مطرود انسانیت کو پھر اذن باریابی ملا اور آدم کا بھاگا ہوا فرزند پھر اپنے خالق و مالک کے آستانہ کی طرف یہ کہتا ہوا واپس ہوا۔

بندہ آمد بر درت بگریختہ
آبروئے خود بہ عصیاں ریختہ

نبوت محمدی ﷺ کی تجدید اور اس کا عملِ تکمیل اسی پر ختم نہیں ہوتا۔ آپؐ نے ہمیں دعا و مناجات کرنا بھی سکھایا۔ آپؐ نے انسانیت کے خزانے کو اور دنیا کے ادب کو دعاؤں کے ان جواہرات سے مالا مال کیا جن کی نظیر اپنی آبداری و درخشانی میں صحفِ سماوی کے بعد مل نہیں سکتی۔ آپ نے اپنے مالک سے ان الفاظ میں دعا کی جن سے زیادہ مؤثر اور بلیغ الفاظ، جن سے زیادہ موزوں و مناسب الفاظ انسان لا نہیں سکتا۔ یہ دعائیں مستقل معجزات اور دلائل نبوت ہیں۔ ان کے الفاظ شہادت دیتے ہیں کہ وہ ایک پیغمبر ہی کی زبان سے نکلے ہیں۔ ان میں نبوت کا نور ہے۔ پیغمبر کا یقین ہے۔ عبد کامل کا نیاز ہے۔ محبوب رب العالمین کا اعتماد و ناز ہے۔ فطرت نبوت کی معصومیت و سادگی ہے۔ دل درد مند اور قلبِ مضطر کی بے تکلفی اور بے ساختگی ہے، صاحب غرض اور حاجت مند کا اصرار و اضطرار بھی ہے، اور بارگاہِ الوہیت کے ادب شناس کی احتیاط بھی، دل کی جراحت اور درد کی کسک بھی ہے، اور چارہ ساز کی چارہ سازی اور دل نوازی کا یقین و سرور بھی، درد کا اظہار بھی ہے اور اس حقیقت کا اعلان بھی کہ۔

درد ما دادی و درمانی ہنوز

پھر پیغمبر انسانیت نے دعا میں انسانوں کی طرف سے انسانی ضروریات کی بھی ایسی مکمل نیابت کی ہے کہ قیامت تک آنے والے انسانوں کو ہر زمان و مکان میں ان دعاؤں میں اپنے دل کی ترجمانی اپنے حالات کی نمائندگی اور اپنے اطمینان کا سامان ملے گا اور بہت سی وہ ضرورتیں ملیں گی جن کی طرف آسانی سے ہر

انسان کے ذہن کا جانا مشکل ہے۔ یہ دعائیں اپنی روحانی و معنوی قدر و قیمت کے علاوہ اعلیٰ ادبی قدر و قیمت کی حامل ہیں اور دنیا کے ادبی ذخیرے کے وہ نوادر اور شہ پارے ہیں جن کی نظیر انسانی لٹریچر میں نہیں مل سکتی۔

بہت سے ناقدینِ ادب نے نجی خطوط کو اس وجہ سے ادب میں اعلیٰ مقام دیا ہے کہ وہ بے ساختہ اور تکلفات سے دور ہوتے ہیں اور ان میں دلی جذبات کی بے تکلف ترجمانی ہوتی ہے لیکن ان کو معلوم نہیں کہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ادب کی ایک صنف اور بھی ہے، جس میں خطوط سے زیادہ بے تکلفی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے، جس میں سارے حجابات اور اصطلاحات اٹھ جاتے ہیں، جس میں صاحبِ کلام اپنا دل کھول کر رکھ دیتا ہے اور اس کی زبان اس کے دل کی حقیقی ترجمان بن جاتی ہے، جب متکلم داد و تحسین سے بے پرواہ ہوتا ہے، سامعین کی خاطر بات نہیں کرتا بلکہ اپنے دل کے تقاضے سے گویا ہوتا ہے، ادب عالی کی یہ صنف "دعا یا مناجات" ہے۔

ادب کا ایک اہم عنصر جس کو اکثر ناقدین فن نے نظر انداز کیا ہے اور جو ادب میں حقیقی روح اور طاقت پیدا کرتا ہے اور اس کو بقائے دوام بخشتا ہے، صداقت اور خلوص ہے اور اس عنصر کی جیسی نمود "دعا و مناجات" میں پائی جاتی ہے، ادب کی کسی اور صنف میں نہیں پائی جا سکتی ہے۔ پھر جب صاحب دعا، صاحب درد بھی ہو اور اس کو اپنے دردِ دل کے اظہار پر اعلیٰ درجہ کی قدرت بھی ہو تو پھر اس کی زبان سے نکلے ہوئے لفظ ادب کا معجزہ بن جاتے ہیں اور وہ الفاظ نہیں ہوتے بلکہ دل کے ٹکڑے اور آنکھ کے آنسو ہوتے ہیں اور وہ صدیوں تک ہزاروں انسانوں کو تڑپاتے رہتے ہیں، پھر جب ان مطالب کو ادا کرنے والی زبان وہ ہو جو وحی کی گذرگاہ اور فصاحت و بلاغت کی بادشاہ ہو، تو پھر ان کی تاثیر و اعجاز کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔

حدیث و سیرت کے دفتر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو دعائیں منقول ہیں، ان پر نظر ڈالئے کیا کوئی بڑے سے بڑا ادیب اپنی بے بسی و کمزوری کا نقشہ کھینچنے کے لئے، اپنا فقر و احتیاج بیان کرنے کے لئے اور دریائے رحمت کو جوش میں لانے کے لئے اس سے زیادہ مؤثر اس سے زیادہ دل آویز اور اس سے زیادہ جامع الفاظ لا سکتا ہے؟ ایک بار سفر طائف کا نقشہ سامنے لائیے اور مسافر طائف کے شکستہ دل اور خون آلود پاؤں پر نظر ڈالئے، پھر غربت و مظلومیت کی اس فضا میں ان الفاظ کو پڑھئے:

اللهم اليك اشكو ضعف قوتى و قلّة حيلتى و هوانى على الناس رب المستضعفين الى من تكلنى الى بعيد يتجهّمنى. او الى عدو ملكة امرى ان لم يكن بك علّى غضب فلا ابالى غيران عافيتك هى اوسع لى اعوذ بنور وجهك والكريم الذى اشرقت له الظلمات. وصلح عليه امرالدنيا والآخرة. من ان يحلّ بى غضبك اوينزل

على سخطك لك العتبىٰ حتى ترضى ولا حول ولا قوة الا بك (۱)

"الٰہی اپنی کمزوری ' بے سرو سامانی اور لوگوں میں تحقیر کے باعث تیرے سامنے فریاد کرتا ہوں ' تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے ' درماندہ اور عاجزوں کا مالک تو ہی ہے اور میرا مالک بھی تو ہی ہے ' مجھ کس کے سپرد کیا جاتا ہے ' کیا بیگانہ ترش رو کے یا اس دشمن کے جو کام پر قابو رکھتا ہے ' اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں تو مجھے اس کی کچھ پروا نہیں لیکن تیری عافیت میرے لئے زیادہ وسیع ہے ' میں تیری ذات کے نور سے پناہ چاہتا ہوں جس سے سب تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں۔ اور دنیا و دین کے کام اس سے ٹھیک ہو جاتے ہیں کہ تیرا غضب مجھ پر اترے یا تیری نارضامندی مجھ پر وارد ہو ' مجھے تیری ہی رضامندی اور خوشنودی درکار ہے اور نیکی کرنے یا بدی سے بچنے کی طاقت مجھے تیری ہی طرف سے ملتی ہے۔"

کیا کبھی جب آپ کو ایسا وقت پیش آئے اور آپ کے دل کی کیفیت بھی یہی ہو تو آپ ان سے بہتر اور ان سے زیادہ مؤثر الفاظ لا سکتے ہیں ' آپ کو دنیا کے ادبی ذخیرے میں اپنے دل کی ترجمانی کے لئے اس سے بہتر الفاظ مل سکتے ہیں ؟

اسی طرح میدان عرفات کا تصور کیجئے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار کفن بردوش انسانوں کا مجمع ہے۔ لبیک کی صداؤں اور حجاج کی دعاؤں سے فضا گونج رہی ہے۔ خدا کی شان بے نیازی اور عظمت و جبروت کا نقشہ سامنے ہے۔ انسانوں کے اس جنگل میں ایک برہنہ سر ' احرام پوش ایسا بھی (فداہ ابی وامّی) جس کے کاندھوں پر ساری انسانیت کا بار ہے۔ جو ہر دیکھنے والے سے زیادہ خدا کی عظمت و جلال کا مشاہدہ کر رہا ہے اور ہر جاننے والے سے زیادہ انسانوں کی درماندگی ' بے حقیقتی اور بے بسی سے واقف ہے ' اس پر تاثیر اور پرہیبت فضا میں اس کی آواز بلند ہوتی ہے اور سننے والے سنتے ہیں :

اللهم انك تسمع كلامى و ترى مكانى۔ و تعلم سرى و علانيتى لا يخفى عليك شئى من امرى۔ وانا البائس الفقير۔ المستغيث المستجير۔ الوجل المشفق۔ المقر المعترف بذنوبى۔ اسالك مسالة المسكين وابتهل اليك ابتهال المذنب الذليل۔ وادعوك دعاء الخائف الضرير۔ ودعاء من خضعت لك رقبته۔ وفاضت لك عبرته۔ وذل لك جسمه۔ ورغم لك انفه۔ اللهم لا تجعلنى بد عائك شقياً و

۱۔ یہ الفاظ تاریخ طبری کے ہیں ' الفاظ کے ذرا فرق کے ساتھ یہ دعا کنز العمال میں حضرت عباسؓ سے مروی ہے

كن لي رؤفاً رحيما. يا خير المسئولين و يا خير المعطين (۱)

"اے اللہ! تو میری سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا ہے اور میرے پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے۔ تجھ سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ میں مصیبت زدہ ہوں۔ محتاج ہوں' فریادی ہوں' پناہ جو ہوں' پریشان ہوں' ہراساں ہوں' اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے والا ہوں' تیرے آگے سوال کرتا ہوں جیسے بیکس سوال کرتے ہیں تیرے آگے گڑگڑاتا ہوں جیسے گنہگار و ذلیل و خوار گڑگڑاتا ہے' اور تجھ سے طلب کرتا ہوں' جیسے خوفزدہ آفت رسیدہ طلب کرتا ہے اور جیسے وہ شخص طلب کرتا ہے جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہو اور اس کے آنسو بہہ رہے ہوں اور تن بدن سے وہ تیرے آگے فروتنی کیے ہو اور وہ اپنی ناک تیرے سامنے رگڑ رہا ہو۔ اے اللہ! تو مجھے اپنے سے دعا مانگنے میں ناکام نہ رکھ اور میرے حق میں بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہو جا۔ اے سب مانگے جانے والوں سے بہتر' اے سب دینے والوں سے اچھے۔

کیا خدا کی کبریائی اور عظمت اور اپنی ناتوانی اور بے نوائی' فقر و احتیاج' عجز و مسکنت کے اظہار و اقرار کے لئے اور رحمتِ خداوندی کو جوش میں لانے کے لئے ان سے زیادہ پر اثر' پر خلوص اور دل نشین الفاظ انسان کے کلام میں مل سکتے ہیں؟ اور اپنے دل کی کیفیت اور عجز و مسکنت کا نقشہ اس سے بہتر کھینچا جا سکتا ہے؟ یہ الفاظ تو دریائے رحمت میں تلاطم پیدا کرنے کے لئے کافی ہیں۔ آج بھی ان کو ادا کرتے ہوئے دل امنڈ آتا ہے' آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں اور رحمت خداوندی صاف متوجہ معلوم ہوتی ہے۔ رحمۃ للعالمین پر اللہ کی ہزاروں رحمتیں ہوں کہ ایسی پر کیف اور اثر آفریں دعا امت کو سکھا گئے اور بابِ رحمت پر اس طرح دستک دینا بتا گئے۔

"اللهم صل وسلم عليه و على عترته بعدد كل معلوم لك۔"

یہ ہیں حدیث کی وہ دعائیں جن میں نبوت کا نور و یقین' انبیاء کا علم و حکمت اور اس معرفت و محبت کی پوری تجلیاں ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی خصوصیت اور سید الانبیاء علیہ السلام کا امتیاز خاص ہے۔ جس طرح چہرہ نبویؐ پر نظر پڑتے ہی عبداللہ بن سلام کی طبع سلیم نے شہادت دی تھی "والله هذا ليس بوجه كذاب" (خدا یہ کسی دروغ گو کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔) اسی طرح ان دعاؤں کو پڑھ کر قلب سلیم شہادت دیتا ہے کہ یہ نبی معصومؑ کے سوا کسی کا کلام نہیں ہو سکتا۔ عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں کے متعلق شہادت

۱۔ کنز العمال عن ابن عباس اس مقالہ کی اکثر ادعیہ کا ترجمہ "مناجات مقبول" سے ماخوذ ہے' جو مولانا عبدالماجد دریابادی کے ترجمہ و شرح کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

دی ہے۔

در دل ہر کس دانش را مزہ است

رو د آواز پیمبر معجزہ است

کمال نبوت اور علومِ نبوت کی معرفت وشناخت کے لئے جس طرح سیرت کے ابواب اور اعمال واخلاق وعبادات ہیں اسی طرح ایک دلیلِ نبوت اور معجزۂ نبوی ﷺ یہ ادعیۂ ماثورہ ہیں۔

کتنی خوش قسمت ہے وہ امت جس کو نبوت کی وراثت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل میں دین ودنیا کا خزانہ اور غیب کی نعمتوں اور دولتوں کی یہ کنجیاں ملیں اور کتنی بدقسمتی اور پست ہمتی ہے اگر اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔(۱)

۱۔ یہاں یہ بات بے تکلف زبان وقلم پر آتی ہے کہ منکرینِ حدیث کی بہت سی محرومیوں میں سے ایک محرومی یہ بھی ہے کہ وہ ان مسنون دعاؤں اور الفاظِ محمدی ﷺ سے محروم ہیں۔ جو حدیث میں وارد ہوئے ہیں۔ حدیث کی صحت وثبوت میں ان کو جو شبہات ہیں وہ قدرتی طور پر اس بیش بہا ذخیرہ سے فائدہ اٹھانے اور اس کو دعا اور اظہار مدعا کا ذریعہ بنانے سے مانع ہیں۔ وکفی بہ عقاباً

مبادیاتِ حمد

حمد باری تعالیٰ بیان کرنا انسانی فطرت میں شامل ہے۔ انسان کی زبانی حمد باری تعالیٰ کے بیان کی تاریخ اتنی قدیم ہے کہ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام نے عدم سے وجود میں آنے کے بعد جو پہلا کلمہ اپنی زبان سے ادا کیا وہ "الحمد للہ" تھا۔ یہی وہ کلمہ ہے جو سب سے پہلے انسان اول کے قلب پر ذات حق تعالیٰ کی جانب سے القا کیا گیا۔ امام بیہقی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ واقف اسرار کائنات حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے (مٹی سے) آدم (علیہ السلام) کا پُتلا بنایا ____ اور ان کی صورت بنائی۔ پھر اس کو چھوڑ دیا۔ حتیٰ کہ وہ پتلا خشک ہو کر کھنکھناتی ہوئی مٹی کی طرح ہو گیا۔ (خلق الانسان من صلصال كالفخار) یعنی انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی مٹی سے بنایا۔ سورۃ رحمٰن۔ ۱۴) پھر ذات باری تعالیٰ نے اس پُتلے میں اپنی پسندیدہ روح پھونکی۔ جس کا اثر سب سے پہلے ان کی آنکھوں اور نتھنوں میں ظاہر ہوا۔ ان کو چھینک آئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو "الحمد للہ" کہنے کا القا فرمایا۔ انہوں نے "الحمد للہ" کہا (تبیان القرآن حوالہ دُرِ منثور) یہ سنت آج تک جاری ہے اور ہر مسلمان کو چھینک آنے پر الحمد للہ کہنے کا حکم ہے۔

تخلیقِ آدم کے بعد مالک عرش عظیم نے ملائکہ پر اپنے اس ارادہ کا اظہار فرمایا کہ "میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔" (البقرہ۔ ۳۰) اس پر فرشتوں نے اظہار تعجب کرتے ہوئے کہا:

نحن نسبح بحمدك و نقدس لك یعنی ہم تیری تسبیح و تحمید اور تقدیس بیان کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔

ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی "فیوض القرآن" میں اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ "فرشتے علم نہ رکھتے تھے اس لئے خلیفہ کے معنی نہ سمجھے۔ ان کی نظر صرف تقدیس و تحمید پر گئی۔ آدمؑ کی جامعیت پر ان کی نظر نہ پڑی۔ (کہ انسان کو علم سے مشرف کیا گیا ہے) یہاں یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ عبادت تو خاصہؑ مخلوقات ہے خدا کی صفت نہیں۔ جبکہ علم اللہ تعالیٰ کی اُمّ الصفات میں شامل ہے جس سے انسان کو مشرف کیا گیا اور انسان اللہ تعالیٰ کی نیابت کا مستحق ٹھہرایا گیا۔

یہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا نور ہے۔ جس طرح سورج اندھی آنکھ پر مشہود نہیں ہوتا' اسی طرح قرآن کریم اندھے قلب پر مشہود نہیں ہوتا۔ اہل ایمان اپنے نور علم و یقین ہی کے ذریعے قرآن کریم کی معنویت کا مشاہدہ و ادراک کر سکتے ہیں۔ قرآنی تعلیمات میں مشاہدہ انفس و آفاق پر بھی بہت زور دیا گیا ہے۔ مشاہدۂ نفس سے انسان کو ایک طرف اپنی ذات کے حقائق کا علم ہوتا ہے تو دوسری جانب اللہ تبارک و تعالیٰ کی صفات و آیات کی معرفت حاصل ہوتی ہے جیسا کہ امام فخر الدین رازی نے لکھا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا "من عرف نفسه فقد عرف ربه" یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا اور اس کے معنی یہ ہیں کہ جس نے اپنے حادث ہونے کو جان لیا اس نے اپنے رب کے قدم کو جان لیا اور جس نے اپنے نفس کے امکان کو جان لیا اس نے اپنے رب کے وجوب کو جان لیا اور جس نے اپنے نفس کی احتیاج کو جان لیا اس نے اپنے رب کے استغنا کو جان لیا (تفسیر کبیر)۔ امام ماوردی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ لوگوں میں اپنے رب کا سب سے زیادہ عارف کون ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو اپنے نفس کا سب سے زیادہ عارف ہو۔ (تبیان القرآن)

مشاہدۂ آفاق سے جو علم حاصل ہوتا ہے اسے ہم دور جدید میں سائنس سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ قرآنی اصطلاح میں علم سے مراد علم الاسماء یا حقائق اشیاء کا مشاہدہ و ادراک اور معرفت الٰہی ہے۔ یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ علم اپنی اصل میں ایک وحدت یا اکائی ہے (اگرچہ اس کے فروع بے شمار ہیں) لہٰذا قرآن و سنت کی تعلیمات کی رو سے اس میں دینی اور دنیوی کی تقسیم کا کوئی جواز نہیں۔ علم کے اصل معانی میں سائنس' فلسفہ' ریاضی' جملہ معاشرتی' طبعی اور مابعد الطبیعاتی علوم شامل ہیں۔ اسلام کے نزدیک ارتقائے علم کے امکانات لامتناہی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ شیون الٰہیہ کا سلسلہ ازل سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا اور دوسری بات کہ اس کی تخلیقات اور حقائق بے حد حساب اور لامتناہی ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے کل یوم ھو فی شان۔ ہر روز اس کی نئی شان ہے (سورۂ رحمٰن۔ ۲۹) یعنی ہر وقت وہ اپنی قدرت کے آثار ظاہر فرماتا ہے۔

مشاہدۂ انفس و آفاق انسانی سرشت کا ایک نمایاں اور امتیازی پہلو ہے۔ تاریخ ادیان گواہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے انبیاء علیہم السلام گزرے ہیں تقریباً سبھی کو مشاہدۂ انفس و آفاق ہی سے ذات حق تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوئی۔ انہی آیات بینات پر غور و فکر کرتے ہوئے وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں سرگرداں رہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے عشق و محبت میں اس تحیر و سرگردانی کی قدر فرماتے ہوئے انہیں اپنے قرب و معرفت کی راہ دکھائی اور اسی معرفت کے فیضان سے ان کی پیروی کرنے والے مقدس گروہ کی عقل سلیم اور نفوس قدسیہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید بیان کرنے پر مائل ہوئے۔

یوں تو روئے زمین کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی انبیائے سابقین کی مختلف امتوں کے سعید و سعادت مند افراد کسی نہ کسی طرح حمد باری تعالیٰ بیان کرتے رہے لیکن ملکہ شعری چونکہ عربوں کی خصوصیات میں سے ہے لہٰذا اس سرزمین مقدس پر آباد مختلف آسمانی مذاہب سے تعلق رکھنے والے نیک افراد معبود برحق سے اپنے قلبی لگاؤ اور اس کی عنایات کے شکر و سپاس میں اس کی حمد و ثناء پیکر شعر میں ڈھال کر بیان کرتے تھے جن کی تمثیلات و شواہد عربی ادب میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔

دور فترت میں حمدیہ اشعار کی روایت

دور فترت اسلامی ادب کی ایک معروف اصطلاح ہے جس سے مراد وہ لوگ ہیں جو دو رسولوں کے درمیانی زمانے میں ہوئے ہیں۔ یعنی نہ ان کے پاس پہلا رسول آیا اور نہ انہوں نے دوسرے رسول کا زمانہ پایا مگر فقہائے اسلام جب فترت کے متعلق گفتگو کرتے ہیں تو اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور اکرم خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت مبارکہ کا درمیانی عرصہ مراد لیتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اجداد کرام دین ابراہیمی علیہ السلام (دین حنیف) کے پیروکار تھے۔ ۵۰۰ سال سے زائد اس طویل عرصے میں ان کے بعض حمدیہ اور آپ کی رسالت کے بارے میں مبشرات پر مبنی نعتیہ اشعار سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں۔ آپ کی ولادت باسعادت سے لیکر بعثت مبارکہ تک کا درمیانی عرصہ بھی دور فترت ہی میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس مبارک دور میں عرب کے کئی فحول شعراء کے کلام میں ایسے اشعار ملتے ہیں جو توحید باری تعالیٰ، یوم آخرت اور محاسن اخلاق کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ ان شعراء میں لبید (قبل اسلام)، زہیر اور امیہ بن الصلت، ابو قیس ابن الصلت، طالب ابن ابو طالب، علاف بن شہاب التمیمی، قیس بن ساعدہ، زید بن عمرو بن نفیل اور عسقلان بن عوالم کے نام شامل ہیں۔

حضرت آمنہ بنت وہب سلام اللہ علیہا کے اشعار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ ماجدہ نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت آپ ﷺ کے معصوم چہرہ اقدس کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔

بارك الله فيك من غلامِ . ان صبح مالصرة فی المنامِ
فانت مبعوث الی الانامِ من عند ذی الجلال والاكرامِ

ترجمہ: اے بیٹے اللہ تعالیٰ آپ کو برکتیں عطا فرمائے۔ میں نے خواب میں جس بات کا مشاہدہ کیا ہے اگر وہ سچ ہے تو آپ رب ذوالجلال والاکرام کی جانب سے تمام لوگوں کے لئے مبعوث ہونے والے ہیں۔

(شواہد نبوت۔ مولانا جامی)

حضرت عبدالمطلب کے حمدیہ و نعتیہ اشعار

حضور اکرم ﷺ کی ولادت باسعادت کی خبر جب آپ کے دادا جان حضرت عبدالمطلب کو دی گئی تو اس وقت وہ حطیم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ مبارک خبر سن کر گھر آئے اور اپنے نومولود پوتے ﷺ کو گود میں اٹھا کر بیت اللہ شریف کے اندر لے گئے اور اللہ تعالیٰ سے یوں دعا کرتے ہوئے اور اس نعمت عظمیٰ پر اس کا شکر ادا کرتے رہے:

الحمد لله الذی اعطانی هذا الغلام الطیب الاردان

"سب حمد و سپاس اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جس نے مجھے یہ پاکیزہ لباس اور منزہ ذات والا یہ مقدس بیٹا عطا فرمایا۔"

قد ساد فی المهد علی الغلمان اعیذه بالبیت ذی الارکان

"جو پنگوڑے میں ہوتے ہوئے سب بچوں پر فوقیت لے گئے ہیں۔ میں ان کو (اللہ تعالیٰ کے) مبارک ارکان والے گھر کی پناہ میں دیتا ہوں۔" (الوفا۔ ابن جوزی)

حضرت عبدالمطلب نے واقعہ فیل کے موقع پر جو مناجات بارگاہ الٰہی میں پیش کی اس کا آغاز اس طرح ہے:

یارب لا ارجولهم سواك یارب وامنع منهم حماك

ترجمہ: اے پروردگار! ان (اہل مکہ) کی حفاظت کے لئے تیرے سوا میں کسی اور سے امیدوار نہیں۔ اے پروردگار ان (ہاتھی والوں کے لشکر) کو اپنی حمایت سے محروم فرما۔ (الوفا)

نفیل بن حبیب کے اشعار

واقعہ فیل کے بعد نفیل بن حبیب نے جو اشعار کہے ان کا آغاز اس طرح ہے:

حمدت الله اذا ابصرت طیرا و خفت حجارة تلقی علینا

ترجمہ: جب میں نے پرندوں (ابابیل) کو دیکھا تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور ڈر بھی رہا تھا کہ پتھر ہم پر نہ آگریں۔ (ابن ہشام)

دور فترت کی دو نادر حمدیں

فکر میں سوز محبت، ذوق، تجسس اور عزم تخلیق کے عناصر شامل ہوں تو وہ تخلیقی بنتی ہے۔ فکر کا بیج اگر ذہن رسا کی کشت زرخیز میں خوابیدہ ہو تو مشاہدہ، مطالعہ، تجربہ اور علم و حکمت کی آبیاری سے یہ پوری طرح نشوونما پا کر اپنی تکمیل کرتا ہے۔ تخلیقی فکر حکیمانہ انداز سے مشاہدہ اور غور و خوض کرنے سے پیدا

ہوتی ہے اور اس کے لئے کسی موضوع فکر کے متعلق ضروری معلومات کا ہونا بھی ضروری ہے۔ خلقت کائنات پر خالق کائنات کے حوالے سے غور و فکر کرنا عقل سلیم کا تقاضا ہے۔ اس قسم کی سوچ کو ہم تفکر بالحق سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس قسم کی سوچ سے ایک طرف انسان میں اللہ تعالیٰ کی قدرت، شان خلاقیت، عظمت و جلال اور غلبہ واقتدار کا ادراک پیدا ہوتا ہے اور دوسری جانب اپنی عبودیت اور عجز و درماندگی کا احساس و شعور بیدار ہوتا ہے جس کی ایک اعلیٰ مثال زید بن عمرو بن نفیل کا حمدیہ کلام ہے جن کے ذہن میں دین ابراہیمی کی تعلیمات کا مبہم سا تصور موجود تھا اور وہ توحید باری تعالیٰ پر یقین رکھتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ یا اللہ! اگر میں جانتا کہ کون سا طریقہ تجھے زیادہ پسند ہے تو اسی کے مطابق تری پرستش کرتا۔ پھر وہ اپنی ہتھیلیوں پر سجدہ کرتے۔ نشہ عشق الٰہی سے سرشار ہو کر بےخودی شوق میں ان کا حمدیہ کلام تخلیقی فکر کی عمدہ مثال ہے۔

زید بن عمر بن نفیل کی حمد

الی اللہ اھدی مدحی و ثنائیا و قولا رضیا لاینی الدھر باقیا

اللہ تعالیٰ کی جناب میں، میں اپنی مدح و ثناء اور ایک ایسی محکم بات کا ہدیہ پیش کرتا ہوں جو باقی زمانے (ابد) تک کمزور نہ ہو۔

الی الملك الاعلی الذی لیس فوقه اله ولا رب یکون مدانیا

اس شہنشاہ اعظم کی جانب میں جس پر کوئی معبود نہیں اور نہ ایسا کوئی رب ہے جو اس کی سی صفتیں رکھنے والا ہے۔

الا ایھا الانسان ایاك والردی فانك لاتخفی من اللہ خافیا

خبردار! اے انسان اپنے آپ کو ہلاکت سے بچا کیونکہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بھی بھید چھپا نہیں سکتا۔

حنانیك ان الجن کانت رجاء ھم وانت الھی ربنا و رجائیا

اے میرے معبود! میں تیرے الطاف و کرم کا طالب ہوں۔ دوسرے لوگوں کے لئے تو جنات امید و رجا کا مرجع بنے ہوتے ہیں اور ہم سب کا پروردگار اور میری امید و رجا کا مرجع تو تو ہی ہے۔

رضیت بك اللھم ربا فلن اری ادین الھا غیرك اللہ ثانیا

یا اللہ! میں تیری ربوبیت سے راضی ہوں۔ ترے سوا کسی دوسرے معبود کو پرستش کے لائق نہ سمجھوں گا۔

وانت الذی من فضل من و رحمة بعثت الی موسیٰ رسولاً منادیا

تو ہی وہ ذات ہے جس نے بے انتہا احسان و رحمت سے موسیٰ (علیہ السلام) کی جانب رشد و ہدایت کی۔ منادی کرنے والے پیامبر (جبرائیل علیہ السلام) کو بھیجا۔

فقلت له یاذهب و هرون فادعوا الی الله فرعون الذی کان طاغیا

اور تو نے ان سے کہا (اے موسیٰ) تم ہارون کو ساتھ لے جاؤ اور اس فرعون کو جو سرکش ہے اللہ کی طرف بلاؤ۔

و قولا له أ انت سویت هذه بلاو تد حتی اطما نت کما هیا

اور تم دونوں اس سے دریافت کرو کہ کیا تو نے اس (زمین) کو بغیر کسی میخ کے قائم رکھا کہ وہ اس حالت پر برقرار ہو گئی، جیسی کہ وہ اب تمہیں نظر آ رہی ہے۔

وقولا أ انت رفعت هذه بلا عمد ارفق اذا بك بانیا

اور تم دونوں اس سے پوچھو کہ کیا تو نے اس (آسمان) کو بغیر ستونوں کے اونچا کر دیا ہے؟ تو تو بڑا لطیف کاریگر ہے۔

وقولا لا له أ انت سویت وسطها منیرا اذا ماجنه اللیل هادیا

اور اس سے پوچھو کہ کیا تو نے اس (آسمان) کے درمیان روشن (چاند) بنایا ہے کہ جب رات چھا جاتی ہے تو وہ راستہ دکھاتا ہے۔

و قولا له من یرسل الشمس غدوة فیصبح ما مست من الارض ضاحیا

اور اس سے کہو کہ صبح سویرے اس آفتاب کو کون بھیجتا ہے جس سے زمین کے جس حصے تک روشنی پہنچتی ہے وہ روشن ہو جاتا ہے۔

و انی لو سبحت باسمك ربنا لاکثر الا ما غفرت خطائیا

اے ہمارے پروردگار! اگرچہ میں نے ترے نام کی تسبیح کی پھر بھی میں بہت ہی خطاکار ہوں۔ مگر یہ کہ تو نے معاف فرما دیا۔

فوب العباد الق سیبا ورحمة علی و بارك فی نبیّ و مالیا

اے بندوں کو پالنے والے! مجھ پر اپنی رحمت کا مینہ برسا اور میری اولاد اور میرے مال میں برکت عطا فرما۔

(ابن ہشام۔ مواہب لدنیہ)

امیہ بن ابو الصلت کی حمد

معرفت الٰہی قدرت کی جانب سے انسان کو مشاہدے کے ذریعہ بھی حاصل ہوتی ہے۔ یہ جوہر خاص انسانی فطرت کے مضمرات میں سے ہے۔ لہٰذا انسان وجود باری تعالیٰ کا فطری طور پر شعور رکھتا ہے اور اس کی نشانیوں کو دیکھ کر یا محسوس کرتے ہوئے انہیں پہچان لیتا ہے اور اس طرح اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہو کر اسے ذکر الٰہی اور یاد مولا میں مستغرق رکھتی ہے جس کی دوسری مثال امیہ بن ابو الصلت کی

درج ذیل حمد ہے:

ان آیات ربنا ثاقبات لایمادی فیھن الا الکفور

بیشک ہمارے پروردگار کی نشانیاں چمک رہی ہیں۔ جن کے بارے میں کسی سخت منکر کے سوا کسی کو اختلاف کی مجال نہیں۔

خلق اللّیل والنّھار فکل مستبین حمابه مقدور

اس نے رات اور دن کو پیدا کیا۔ پس ان میں سے ہر ایک دن اور ہر ایک رات کا حساب مقرر و معین ہے اور یہ بات بالکل ظاہر ہے۔

ثم یجلوا النّھار رب رحیم بھماة شعاعھا منشور

وہ مہربان پروردگار روزانہ شفاف و منور آفتاب کے ذریعے سے جس کی کرنیں پھیلی ہوئی ہیں دن کو جلوہ گاہ ظہور پر لاتا ہے۔

کل دین یوم القیامه عند اللّٰہ الا دین الحنیفه بور

روز قیامت اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین حنیفہ (دین ابراہیمیؑ) کے سوا ہر دین ناکارہ ہو گا۔

(طبقات ابن سعد)

دور فترت کا تتمّہ اور آغاز اسلام

حضور اکرم ﷺ کے اعلان نبوت کے ساتھ دور فترت ہمیشہ کے لئے رخصت ہوا۔ چونکہ قیامت تک آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا لہٰذا آپ ﷺ ہی کے عہد رسالت میں لوگ محشور ہوں گے۔ نزول قرآن کے بعد تلاش حق میں سرگرداں لوگوں کے قلب و فکر دین ابراہیمیؑ کی مبہم سی تعلیمات کے بجائے قرآن کریم کی واضح تعلیمات اور اسلامی عقائد سے روشن و منور ہوئے۔ قرآن کریم کی آیات ہر سطح کے افراد کے لئے ہدایت کا ایک جامع اور وسیع تر خزانہ ہیں۔ اس کے علوم ایک دریائے ناپید اکنار ہیں۔ جس کے عجائبات کبھی ختم نہ ہوں گے۔ اس کے معارف و حقائق بے حد و حساب ہیں۔ اس کے حسن بیان اور معیار فصاحت و بلاغت نے میدان بلاغت کے شہسواروں کو اظہار عجز پر مجبور کر دیا اور وہ متحیر ہو کر پکار اٹھے کہ بلاشبہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں۔

نزول قرآن کے بعد تمام صحابہ کرام کی طرح سرزمین عرب کے مسلمان شعرائے کرام کی تمام تر توجہ قرآن کریم کی تلاوت' اعجاز قرآن اور اس کے اسرار و معارف پر غور و فکر پر مرکوز رہتی تھی۔ چنانچہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے سرشار ہو کر آپ ﷺ کی محبت اور مدافعت میں نعتیہ قصائد کہتے تھے۔ اس دور میں ان کی حمد نگاری کے شواہد نہیں ملتے۔ البتہ ان کے نعتیہ قصائد اور رجزیہ کلام میں حمدیہ اشعار کثرت سے ملتے ہیں جن میں حضور اکرم ﷺ کی نعت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا' شکر و سپاس اور

دعا و مناجات کے مضامین بھی نظم کیے گئے ہیں۔ اس کی مثالیں کتب سیرت میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ ہم اس مقالے کے طویل ہو جانے کے خوف سے یہاں ان مثالوں کو نقل کرنے سے قاصر ہیں۔

اردو میں حمد نگاری

عربی اور فارسی زبان کے عارفانہ کلام اور صوفیانہ شاعری کے زیر اثر اردو ادب میں حمد نگاری کی روایت اگرچہ ابتدا ہی سے موجود رہی ہے لیکن اردو شاعری میں نعت نگاری کے مقابلے میں حمدیہ نگارشات کی مقدار کم ہی نظر آتی ہے۔ اس کی وجوہات اور اسباب جاننے کے لئے سنجیدگی کے ساتھ تحقیق و تدقیق کے بجائے بعض اہل قلم کی جانب سے نہ صرف حیرت و استعجاب کا اظہار کیا جاتا ہے بلکہ بعض حضرات حد اعتدال سے اس قدر تجاوز کر جاتے ہیں کہ اسے ممدوحین محبوب کردگار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں ہدیۂ عقیدت پیش کرنے والے شعرائے کرام کی بد نصیبی سے تعبیر کر بیٹھتے ہیں۔

اس صورتحال کی نزاکت کے پیش نظر نفس مضمون پر براہ راست گفتگو سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں محض تردد کا اظہار فرمانے والے حضرات کی خدمت میں مندرجہ ذیل سوالات پیش کیے جائیں تاکہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں پوری ذمہ داری اور مومنانہ بصیرت کے ساتھ ان سوالوں کے جواب تلاش کرتے ہوئے ان کے اطمینان قلب کا سامان فراہم ہو۔

سوالات

(۱) کیا دور رسالت مآب ﷺ میں نعتیہ قصائد اور رجزیہ کلام میں ذات باری تعالیٰ جل جلالہٗ کی حمد و سپاس اور دعا و مناجات پر مشتمل کچھ اشعار شامل کرنے کے علاوہ دور حاضر کی مروجہ حمد نگاری یا باقاعدہ حمدیہ شاعری کا رواج تھا؟

(۲) کیا توحید باری تعالیٰ کے سب سے بڑے علمبردار اور مبلّغ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دربار رسالت کے شعرائے کرام کو (نعت گوئی کی طرح) حمدیہ شاعری کا بھی حکم دیا تھا؟

(۳) کیا نذرانۂ نعت کی طرح شاعران رسول انام نے آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں حمدیہ شاعری کے نذرانے بھی پیش کیے؟

(۴) کیا مشرکین مکہ حضور اکرم ﷺ کی ہجو کے ساتھ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کی شان میں بھی گستاخی پر مبنی اشعار کہتے تھے۔ جس کے جواب میں حمدیہ شاعری کی ترویج کو ضروری قرار دیا جاتا؟

(۵) کیا حضور اکرم ﷺ کے پردہ فرمانے کے بعد خلافت راشدہ کے دور میں نعت گوئی کی طرح حمدیہ شاعری بھی کی گئی؟

ان سوالات کے اطمینان بخش جواب حاصل کرنے کے لئے آپ کو پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ کتب حدیث و سیر کے ہزاروں صفحات کی ورق گردانی کرنی ہوگی۔ سر دست مضمون کے تسلسل کو

برقرار رکھتے ہوئے ہم کسی قدر اجمال کے ساتھ ان سوالات کا جائزہ ذیل میں پیش کرتے ہیں :

(ا) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارک کے ظاہری دور میں حمد نگاری کی کوئی علیحدہ صنفی حیثیت نہ تھی اور نہ اس کا علیحدہ اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس دور مسعود میں سنت یہ تھی کہ منظوم یا منثور کلام کا آغاز حمد و نعت اور مناجات سے کیا جاتا تھا اس کے بعد نفس مضمون یا کسی موضوع کو شامل کلام کیا جاتا تھا جس کی کچھ مثالیں اختصار کے ساتھ ملاحظہ فرمایئے :

(الف) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت کے بعد جب مدینہ منورہ میں جلوہ افروز ہوئے تو آپ نے لوگوں کو خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا" بے شک تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں۔ میں اس کی حمد کرتا ہوں اور اس کی مدد کا طلبگار ہوں۔ اور ہم اپنے نفسوں کی شرارتوں اور اپنے اعمال کی برائیوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ کے طالب ہیں ـــــ سن لو کہ بہترین کلام اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کی خوبی جس کے دلنشیں کردی اور اسے کفر کے بعد اسلام میں داخل کردیا اور اس شخص نے دوسرے تمام لوگوں کی باتوں پر اس کتاب کو ترجیح دی۔ بلاشبہ وہ پھولا پھلا اور اس نے ترقی حاصل کرلی۔ بلاشبہ قرآن کریم بہترین اور نہایت بلیغ کلام ہے جس چیز سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہے تم بھی اس سے محبت رکھو اور پورے دل سے اللہ تعالیٰ سے محبت رکھو اور اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کی یاد سے بیزار نہ ہو جاؤ ـــــ" (سیرت ابن ہشام)

(ب) عہد رسالت میں بعض صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے رجزیہ کلام سے بعض منتخب اشعار

☆ اعوذ برب الناس من کل طاعن علینا بسوء او ملح بباطل

میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ لیتا ہوں۔ ہر اس شخص سے جو ہم پر برائی کے الزامات لگاتے والا اور ناحق پر اصرار کرنے والا ہے۔

فلا ذال فی الدنیا جمالا لاھلھا و زینا لمن والاہ رب المشاکل

ایک دوسرے سے مشابہ شکلیں (حضور اکرم ﷺ اور حضرت جعفر بن ابی طالبؓ) بنانے والا پروردگار اس (احمد ﷺ) سے محبت رکھنے والوں کے لئے جمال دینوی ہمیشہ باقی رکھے اور ان کی زینت کو دوام عطا فرمائے۔ (حضرت ابو طالب)

☆ حمدت اللہ حین ھذا فوادی الی الاسلام والدین الحنیف

جب اللہ تعالیٰ نے دین اسلام اور دین حنیف کی طرف میری رہبری کی تو میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

لدین جاء من رب العزیز خبیر باالعباد بھم لطیف

جو دین خدائے غالب کی جانب سے آیا ہے جو اپنے بندوں سے باخبر اور ان پر مہربان ہے۔

(حضرت حمزہؓ بن عبد المطلب)

الم ترا ان الله ابلی رسوله بلاء عزیز ذی الاقتدار و ذی فضل

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کا امتحان لیا ہے؟ ایسا امتحان جیسے صاحبان فضل واقتدار کا (ان کی عزت وفضیلت کو زیادہ کرنے کیلئے) امتحان لیا جاتا ہے۔

فجاء بفرقان من الله منزل مبینة ایاته لذوی العقل

اور آپ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کی ہوئی کتاب فرقان (قرآن کریم) لے کر آئے۔ جس کی آیات صاحبان عقل کے لئے واضح ہیں۔

فامن اقوام بذاك ایقنوا فامسوا بحمد الله مجتمعی الشمل

تو جو لوگ اس پر ایمان لائے اور یقین کر لیا تو بحمد اللہ وہ اپنی منتشر قوتوں کو یکجا کرنے والے ہو گئے۔

(حضرت علی کرم اللہ وجہ)

☆ عجبت لامر الله والله قادر علی ما اراد لیس لله قاهر

میں اللہ تعالیٰ کے کاموں پر حیران وششدر رہ گیا۔ اور اللہ تعالیٰ تو ان باتوں پر قادر ہے جن کا اس نے ارادہ کر لیا۔ اللہ کو کوئی مجبور کرنے والا نہیں۔

شهدنا بان الله لارب غیره وان رسول الله بالحق ظاهر

ہم نے اس بات کی گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی پروردگار نہیں اور اس کا رسول برحق غلبہ حاصل کرنے والا ہے۔

(کعب بن مالک رضی اللہ عنہ)

☆ فما نخشی بحول الله قوما و ان کثروا و اجمعت الزحوف

اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم کسی قوم سے نہیں ڈرتے اگرچہ وہ کتنے ہی زیادہ ہوں اور لشکر کے لشکر جمع ہو جائیں۔

☆ جحدوا القرآن وکذبوا بمحمد والله یظهر دین کل رسول

انہوں نے قرآن کا انکار کیا اور محمد (ﷺ) کو جھٹلایا۔ اللہ تو اپنے ہر رسول کے دین کو غلبہ دیا ہی کرتا ہے۔

(حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ)

ہم نے مذکورہ بالا تمام اشعار سیرت ابن ہشام، طبقات ابن سعد اور الوفا (ابن جوزی) سے نقل کئے ہیں۔ ان کتب میں کثرت سے ایسے اور اشعار بھی ملتے ہیں جو خالصتاً حمدیہ کلام تو نہیں لیکن ان میں اللہ تعالیٰ کی حمد وسپاس اور مناجات کے مضامین بیان ہوئے ہیں۔ جس سے یہ ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ حضور

اکرم ﷺ کی حیات ظاہری کے دور میں حمد نگاری کی کوئی باقاعدہ صنفی حیثیت نہ تھی اور نہ اس دور میں حمدیہ شاعری کا رواج تھا۔

(۲) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ صحابہ کرام جو اچھے اور نمایاں شعری ذوق کے حامل تھے اور انہوں نے جوش محبت و عقیدت سے سرشار ہو کر محبوب کردگار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توصیف میں قصائد (ہدیۂ نعت) کہہ کر خدمت اقدس میں پیش کیا۔ اہل سیر نے ان کی تعداد ۱۲۰ (مرد) اور بارہ خواتین شمار کی ہے۔ ان خوش نصیب صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو شاعر رسولؐ کہا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ صحابہ کرام میں سے حضرت حسان بن ثابت، حضرت عبداللہ بن رواحہ اور حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہم ایسے خوش نصیب شاعر تھے جو آپ ﷺ کے حکم پر اپنے اشعار سے مشرکین کی ہجو گوئی کا منہ توڑ جواب دے کر اسلام اور مسلمانوں کی مدافعت کرتے تھے۔ یعنی سرکاری طور پر اس کام پر مقرر و مامور تھے۔ ان حضرات کو شاعر دربار رسالت کہلانے کا اعزاز حاصل ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے کسی بھی صحابی شاعر کو حمد باری تعالیٰ کا منظوم نذرانہ پیش کرنے کا حکم نہیں فرمایا کیونکہ کفار کے شعراء اسلام دشمنی اور قبائلی عصبیت کے زیر اثر آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے قبیلے بنی ہاشم کی ہجو کرتے تھے اور مسلمان شعراء اس ہجو گوئی کا جواب دیتے ہوئے حضور اکرم ﷺ کی توصیف و نعت اور آپ ﷺ کے مبارک قبیلے بنی ہاشم کی عظمت و فضیلت کے مضامین پر مشتمل اشعار کہہ کر مجمع عام میں سناتے تھے۔ انہی اشعار میں اللہ تعالیٰ کے شکر و سپاس کا بیان بھی ہوتا تھا۔ جیسے حضرت حسان بن ثابت کے یہ اشعار:

فما زال فی الاسلام من آل هاشم و عائم عزلا یزلن و مفخر

آل ہاشم کے قابل فخر اور عزو وقار کے غیر فانی عظیم ستون۔ اسلام میں ہمیشہ کے لئے شامل ہیں۔

هم جبل الاسلام والناس حولهم رضام الی طود یروق ویقهر

یہ (بنی ہاشم) اسلام کا پہاڑ ہیں دوسرے لوگ ان کے ارد گرد ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے پتھروں کا ڈھیر ایک ایسا پہاڑ جس کے مقابلے میں ہو۔ جو بہر صورت بلند و غالب ہے۔

حضرت کعب بن مالک کے اشعار

قوم بهم عصم الا له عباده و علیهم نزل الکتاب المنزل

یہ بنی ہاشم وہ لوگ ہیں جن کے ذریعے سے معبود برحق نے اپنے بندوں کو سنبھالا ہے اور جن میں آسمان سے نازل ہونے والی کتاب آئی ہے۔

و بهديهم رضى الا له لخلقه وبجد هم نصر النبى المرسل

معبود حقیقی اپنی مخلوق کے لئے ان کی سیرت و اخلاق کو پسند فرماتا ہے انہی کی سعی و کوشش سے نبی مرسل (ﷺ) کو نصرت پہنچائی گئی۔

نکتہ : یہاں یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ ہدیۂ نعت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ آپ ﷺ کی عترت پاک کی منقبت کا بیان نعت ہی کا ایک حصہ ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سنت ہے۔

(۳) کتب حدیث وسیرت میں ہماری نظر سے ایسا کوئی واقعہ نہیں گزرا کہ شاعران رسول ﷺ نے مطلقاً حمدیہ ابیات لکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کئے ہوں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ نے لکھا ہے "ایک مرتبہ عرب کے شاعر ابو عبداللہ اسود بن سریع ساعدی تمیمی رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کے دربار میں حاضر ہوئے تو عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! کیا میں آپ ﷺ کے لئے ایک حمد لکھوں؟ جس میں اپنے رب کی تعریف ہو؟ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا بیشک تمہارے رب ہی کی تعریف کی جاتی ہے۔ گویا اس بات کی ادائیگی حضور ﷺ پر گراں گزری۔ مطلب یہ کہ تم کیا حمد کروگے سارا جہان حق تعالیٰ کی حمد کرتا ہے۔وان من شی ، الا یسبح بحمده یا ان کی تقریر و تحسین مراد ہے یعنی اچھا کیا سارا جہان اس کی حمد بیان کرتا ہے۔ اس سے زیادہ آپ نے کچھ نہیں فرمایا" ابن کثیر نے بھی یہ واقعہ ترمذی اور نسائی کے حوالے سے تغیر الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حمد گوئی کا حکم نہیں فرمایا۔ البتہ جب کوئی اچھا حمدیہ شعر سماعت فرماتے تو اس کی حوصلہ افزائی بھی فرماتے تھے۔ جیسے لبید بن ربیعہ عامری (زمانۂ جاہلیت کے) اس مصرعے کی آپ ﷺ نے بر سر منبر توصیف فرمائی:

"الا کل شی ، ما خلا الله باطل"

ترجمہ :یاد رکھو ہر وہ چیز جو اللہ سے دور ہو گئی باطل ہے۔ (مسلم شریف)

اسی طرح غزوۂ خندق کے موقع پر حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اپنے اشعار سناتے ہوئے جب اس شعر پر پہنچے :

جأت سخينة كى تغالب ربها فليغلبن مغالب الغلاب

ترجمہ : یہ (کفار مکہ) اس خیال سے آئے تھے کہ غلبہ حاصل کرنے میں اپنے رب سے مقابلہ کریں گے لیکن سب سے غلبے والی ہستی سے جو مقابلہ کرتا ہے وہ ضرور بالضرور مغلوب ہو کر رہتا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کعب! تمہارے اس شعر پر اللہ تعالیٰ نے تمہاری تحسین فرمائی ہے۔ (ابن ہشام)

مختصر یہ کہ حضور اکرم ﷺ کے صحابی شعرائے کرام میں سے کسی نے خالصتاً حمدیہ ابیات

آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں پیش نہیں کیے اور جب کسی شاعر کے کلام میں جب کوئی اچھا حمدیہ شعر آپ ساعت فرماتے تو دیگر اچھے اشعار کی طرح اس پر بھی اظہار پسندیدگی فرماتے تھے۔ رہا حضرت اسود بن سریع بن ساعدی تمیمی کا معاملہ تو انھوں نے کوئی حمدیہ کلام پیش نہیں کیا تھا صرف اس کی اجازت چاہی تھی۔ اس کے بعد اس بارے میں سکوت ہے۔

(۴) سرزمین عرب میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ آباد تھے۔ جن میں بڑے مذاہب یہودیت 'نصرانیت' صابئیت 'مجوسیت اور بت پرست تھے۔ ان تمام مذاہب کے پیروکار اگرچہ شرک کرتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی الوہیت کے قائل تھے۔ قرآن کریم کے حوالے سے ان کے عقائد کا مختصر بیان درج ذیل ہے:

یہودیت: "یہود نے کہا عزیر (علیہ السلام) خدا کے بیٹے ہیں۔" (توبہ۔ ۳۰)

عیسائیت: "اے اہل کتاب (نصاریٰ) ____ خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور تین خدا نہ کہو اس سے باز آؤ۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہے اور خدا تو ایک ہی ہے اور اس سے پاک ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔ (نساء ۱۷۱)

(یہ لوگ اللہ تعالیٰ، مسیح علیہ السلام اور روح القدس تینوں کی الوہیت کا عقیدہ رکھتے تھے۔)

مجوسیت: مجوس کا نام قرآن کریم کی سورۂ حج میں آیا ہے۔

یہ دو خداؤں یعنی خدائے خیر (یزداں) اور خدائے شر (اہرمن) کا عقیدہ رکھتے تھے۔ سورۂ نحل میں اس اعتقاد کا رد آیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "دو خدا نہ بناؤ۔ خدا تو ایک ہی ہے۔"

صابئیت: قرآن کریم کی سورۂ بقرہ 'سورۂ مائدہ اور سورۂ حج میں یہ نام آیا ہے۔ تفاسیر میں بیان ہوا ہے کہ صابی لوگ خدا کے اقرار کے ساتھ رسالت کے منکر تھے۔ خدا اور بندوں کے درمیان ستاروں کو خدا تعالیٰ کا مظہر جان کر ان کی پرستش کرتے تھے۔ سورۂ حٰم سجدہ اور سورۂ لقمان میں ان کے عقائد کا رد آیا ہے۔

بت پرستی: گنتی کے چند افراد کے علاوہ جو دین ابراہیمؑ کی تعلیمات کا مبہم سا تصور رکھتے تھے 'عرب کا سب سے وسیع الاثر مذہب بت پرستی تھا۔ یہ لوگ اگرچہ مختلف دیوتاؤں اور دیویوں کے قائل تھے 'بتوں کو پوجتے تھے۔ جنات کو نذرانے چڑھاتے تھے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کی الوہیت کا تصور ان میں موجود تھا۔ آسمان و زمین کی پیدائش اور اس کارخانہ قدرت کے بڑے بڑے کاموں کو وہ اللہ تعالیٰ ہی کے دست قدرت کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شعرائے جاہلیت کے کلام میں اکثر اللہ تعالیٰ کا نام آیا ہے اور اسی کی طرف تمام افعال کی نسبت ہوتی ہے اور اس کے ساتھ بتوں اور دیوتاؤں کے نام بھی جا بجا ان کے کلام میں ملتے ہیں۔ ان بتوں اور دیوتاؤں اور فرشتوں کو وہ اللہ تعالیٰ کے اقارب یا اسکی بارگاہ کے مقرب درباری سمجھتے تھے اسی وجہ سے ان کی پرستش کرتے تھے۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر ان کو مخاطب کیا ہے کہ جب تم جانتے ہو کہ

اصلی قوت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے تو اوروں کو کیوں پوجتے ہو؟ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"آپ فرمائیے کس کا مال ہے جو کچھ زمین اور جو کچھ اس میں ہے اگر تم جانتے ہو تب کہیں گے کہ اللہ کا۔ آپ فرمائیے پھر کیوں نہیں سوچتے۔ آپ فرمائیے کون ہے مالک ساتوں آسمانوں کا اور مالک عرش عظیم کا۔ پس وہ کہیں گے یہ اللہ ہی کی شان ہے۔ آپ فرمائیے پھر کیوں نہیں ڈرتے۔ آپ فرمائیے کس کے ہاتھ ہے ہر چیز کی حکومت اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے خلاف کوئی پناہ نہیں دے سکتا اگر تمہیں علم ہو۔ اب کہیں گے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی شان ہے۔" (المومنون: ۸۴ تا ۸۹)

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"آپ ان سے پوچھئے تم کو آسمان اور زمین سے کون رزق دیتا ہے۔ کون تمہارے حاسۂ سمع اور حاسۂ بصارت پر قدرت رکھتا ہے۔ کون ذی حیات چیز سے مُردہ (جامد) شئے اور جامد شئے سے ذی حیات چیز پیدا کرتا ہے اور کون دنیا کا انتظام چلاتا ہے۔ وہ جواب دیں گے کہ اللہ۔ فرمائیے کہ پھر اس سے ڈرتے نہیں؟" (سورہ یونس: ۳۱)

ان قرآنی آیات سے یہ ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ مشرکین اللہ کے وجود اس کی قدرت، عظمت و جلالت اور افعال الٰہی پر یقین رکھتے تھے۔ البتہ وہ اس کی عبادت میں بتوں، جنات اور فرشتوں کو شریک کرتے تھے جس کا ثبوت اس آیت سے فراہم ہوتا ہے۔

"جب تنہا خدا کا نام پکارا جاتا ہے تو تم انکار کرتے ہو اور اگر اس کا کوئی شریک کیا جائے تو مانتے ہو۔" (مومن۔ ۱۲)

اسی طرح سورۂ نمل میں نہایت بلیغانہ انداز میں قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور صفات کو بیان کیا ہے اور ہر جملے کے بعد پوچھا ہے "۔ اللہ مع اللہ" (کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور بھی معبود ہے۔)

مشرکین عرب اللہ تعالیٰ کی الوہیت کے اقرار کے ساتھ عقیدۂ آخرت اور عقیدۂ رسالت کے سخت منکر تھے۔ کیونکہ ان کو تعجب ہوتا تھا کہ مر کر بھی کوئی دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے اور آدمی ہو کر کوئی خدا کا فرستادہ ہو سکتا ہے؟ ارشاد باری تعالیٰ ہے (مشرکین کہتے ہیں) "یہ تو تمہاری ہی طرح ایک آدمی ہے جو تم کھاتے ہو وہی وہ کھاتا ہے جو تم پیتے ہو وہی وہ پیتا ہے۔ اپنی ہی طرح کے ایک آدمی کی تم نے پیروی کی تو تم گھاٹے میں رہو گے۔" (المومنون۔ ۳۳) اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے "بلکہ ان کو تعجب ہے کہ ان ہی میں سے ایک ڈرانے والا ان کے پاس آیا۔" (سورہ ق۔ ۲)

ان تمام آیات سے یہ ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ مشرکین وجود باری تعالیٰ، قدرت الٰہیہ اور افعال باری تعالیٰ کے قائل تو تھے لیکن اس کے ساتھ اپنے معبودان باطل کی پرستش بھی کرتے تھے۔ بہر حال

چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی سے کسی قدر آشنا تھے لہٰذا ان میں سے کسی نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان میں کسی ایسی گستاخی کی جرأت نہ کی جس کا حمدیہ اشعار کے ذریعہ ان کو جواب دیا جاتا۔ چنانچہ اس دور میں حمد نگاری کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔

اس کے برعکس دورِ رسالت میں نعت نگاری کی ترویج اشاعت دین کے حوالے سے وقت کی اہم ضرورت تھی جس کے مندرجہ ذیل اسباب تھے:

(الف) مشرکین چونکہ عقیدہ رسالت کے منکر تھے اور رسول اکرم ﷺ کو اپنی ہی طرح ایک آدمی سمجھتے تھے لہٰذا اسلام کی اعلانیہ تبلیغ کے بعد قریش کے تمام قبائل حضور اکرم ﷺ کے جانی دشمن ہو گئے۔ قریش کے قبائل نے آپ کے خلاف ایک دوسرے کو ابھارا۔ جس کے نتیجے میں ہر قبیلہ اپنے میں کے مسلمانوں پر پل پڑا اور انہیں ایذائیں دے کر اسلام سے برگشتہ کرنے کی تدبیریں کرنے لگا۔

حضور اکرم ﷺ کے شفیق و جاں نثار چچا جناب ابو طالب نے قریش کی یہ معاندانہ کارروائیاں دیکھیں تو آپ کی حفاظت کے لئے سینہ سپر ہو گئے۔ انہوں نے آپؐ کی حمایت کے لئے بنی ہاشم کو متحد کر کے ان پر حضور اکرم ﷺ کی فضیلت و مرتبہ واضح کیا تاکہ حضورؐ کی محبت میں آپ کی مدافعت کے لئے بنی ہاشم کو متحد کر کے ان کی رائے کو مستحکم بنائیں۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی فضیلت، آپؐ کے بارے میں مبشرات، آپ کی دلنوازیوں اور اعلیٰ اخلاق کے مضامین اور بنی ہاشم کی روایتی شجاعت اور وفاداری کے مضامین پر مشتمل قصائد کہے۔ جس کے نتیجے میں بنی ہاشم دل و جان سے حضور ﷺ کی مدافعت کے لئے کمربستہ ہو گئے۔ اس طرح اللہ پاک و تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو قریش کی ایذا رسانیوں سے محفوظ رکھا۔ دورِ رسالتؐ میں نعت گوئی کا یہ نقطۂ آغاز تھا۔ جو وقت کی ضرورت کے تحت ایک روایت بن گیا۔

(ب) اسلام کے مدنی دور میں مشرکین مکہ سمیت عرب کے دیگر قبائل کے شعراء حضور اکرم ﷺ کی دشمنی میں اس قدر آگے بڑھ گئے تھے کہ آپ کی ہجو کرتے تھے (قرآن میں کئی مقامات پر اس کا تذکرہ آیا ہے۔) اس ہجو کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور حضرت کعب بن مالکؓ مقرّر و مامور کر لیا۔ اور حضرت حسانؓ کے لئے دعا فرمائی "اے اللہ! روح القدس کے ذریعہ اس کی تائید فرما۔" (مسلم) اسلامی ریاست کے قائم ہونے کے بعد (فتح مکہ کے بعد بھی) آپؐ حضرت حسانؓ کے لئے مسجد نبوی میں ایک علیٰحدہ منبر رکھواتے تھے جس پر کھڑے ہو کر وہ آپؐ کی توصیف بیان کرتے تھے۔

مختلف غزوات کے مواقع پر مسلمان شعراء کفار کی ہجو گوئی کا منہ توڑ جواب دیتے تھے اس کی تائید سورۂ شعراء کی ۲۲۷ ویں آیت سے بھی ہوتی ہے یعنی "اور انتقام لیتے ہیں اس کے بعد کہ ان پر ظلم کیا گیا" اس آیت میں "وانتصروا" سے مراد یہ ہے کہ جن لوگوں نے مسلمانوں کی ہجا کی ہو اور مومن

شاعروں نے اس کے مقابلے میں کافروں کی ہجا کی ہو اور اس طرح کافروں کے ظلم کا انتقام لیا ہو۔ (تفسیر مظہری)

(ج) جناب ممدوح کردگار کی توصیف پر مبنی اشعار سے نہ صرف مسلمانوں اور اسلام کی قوت مدافعت کا کام لیا جاتا تھا بلکہ یہ تبلیغ دین کا بھی ایک مؤثر اور اہم ذریعہ بھی تھے۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد جب رؤسائے بنی تمیم مدینہ منورہ آئے اور فخر و تعلّی کی مجلسوں اور اپنی دولت و ثروت کے نشے میں مدہوش ہو کر ایک روز کاشانہ رسالت پر آکر مفاخرت کی دعوت دی۔ اسد الغابہ میں مذکور ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے یہ فرماتے ہوئے ان کی درخواست منظور کی کہ میں شعر بازی اور فخاری کے لئے مبعوث نہیں کیا گیا لیکن اگر تم اسی لئے آئے ہو تو بسم اللہ۔ اجازت ملنے پر بنی تمیم کی جانب سے ان کا خطیب کھڑا ہوا اور بڑے فخر و مباہات کے ساتھ اپنے قبیلے کی دولت و ثروت اثر و اقتدار اور شجاعت و بہادری کی داستان پر جوش انداز میں سنائی۔ جس کے بعد بارگاہ رسالت ؐ کے خطیب حضرت ثابت بن قیس ؓ کھڑے ہوئے اور حضور اکرم ﷺ کی ایک (نثری) نعت فی البدیہہ سنائی۔ (اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نعت منثور کلام کو بھی کہا جاتا ہے) اس کے بعد بنی تمیم کا مغرور شاعر زبرقان بن بدر اٹھا اور ایک ہزار بند پر مشتمل غرور آمیز قصیدہ سنایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان بن ثابت ؓ کو حکم دیا کہ اس کا بھرپور جواب دیا جائے۔ انہوں نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توصیف میں نہایت اثر انگیز اور صداقتوں سے لبریز فی البدیہہ اشعار سنائے۔ جس کے بعد بنی تمیم کا سردار فراس پکار اٹھا کہ محمد (ﷺ) کا خطیب ہمارے خطیب سے اور ان کا شاعر ہمارے شاعر سے بہت افضل ہیں۔ ان کی دلکش آوازیں ہم پر جادو کئے دیتی ہیں۔ (اس سے لحن کے ساتھ نعت پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے) میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں ____ فراس کے ایمان لانے کے ساتھ ان کا پورا قبیلہ مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ یہ تفصیلات قرآن کریم کی سورۃ الحجرات کی ابتدائی آیات کے ذیل میں مختلف تفاسیر اور کتب احادیث میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

(د) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف و نعت پر مبنی اشعار مختلف غزوات کے مواقع پر ابتلاء آزمائش کے لمحات میں لشکر اسلام کی ثابت قدمی اور بلند حوصلگی کا باعث ہوتے تھے جس کے تذکروں سے کتب سیر کے اوراق زرنگار ہیں۔

(ہ) نعت گوئی سے گروہ اسلام میں فدویت و جاں نثاری باہمی محبت و اخوت اور عشق و وفا کے جذبات ابھرتے تھے۔ اس کے علاوہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلق عظیم کی یہ بڑی دلکش و مؤثر تبلیغ ہوتی تھی۔ جو مسلمانوں کے دلوں کو عشق خدا اور عشق رسول ﷺ سے گرماتی رہی۔ اس طرح عہد رسالت میں حمد گوئی سے قطع نظر نعت گوئی وقت کی اہم ترین ضرورت تھی۔

(۵) خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا دور محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

پردہ فرمانے کے زمانے سے متصل اور قریب تر تھا۔ فطرتاً آپ کے جانثاروں اور عشاق کے غمگین دلوں کو آپ کے ذکر سے قلبی لگاؤ تھا اور تلاوت قرآن کریم کے بعد نعت ممدوح خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے ان کے قلوب تسکین پاتے تھے۔ اس دور میں حسب سابق حضرت حسان بن ثابتؓ مسجد نبوی میں ایک علیحدہ منبر پر کھڑے ہو کر آپ ﷺ کی بدرجہ توصیف بیان کرتے تھے۔ اور ان کے نعتیہ اشعار مسلمانوں کے دلوں کو زندگی عطا کرتے تھے۔ اس دور میں قرآن کریم کو جمع کرنے' قرآنی آیات کی تفسیر اور اسباب نزول پر زیادہ توجہ دی گئی۔ چنانچہ صحابہ کرام کی اکثریت حضرت علی کرم اللہ وجہہ 'حضرت ابی بن کعب اور سید المفسرین حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے قرآن کریم کے اسرار و رموز کا درس لیکر اللہ تبارک و تعالیٰ کی معرفت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان محبوبیت اور احادیث کی تدوین میں مستغرق رہے۔ ان میں سے جو شعر گوئی سے شغف رکھتے تھے وہ قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت نظم و معانی پر غور و فکر میں محو رہے اور اعجاز قرآن کے سامنے سجدہ ریز ہو کر شعر گوئی پر توجہ کم دی یا شعر گوئی ترک کر دی۔ چنانچہ ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرب کے ہر دلعزیز شاعر لبید سے فرمایا اے ابو عقیل ! اپنے کچھ اشعار تو سناؤ۔ انہوں نے کہا اب شعر گوئی نہیں کرتا' جب سے میں نے حق تعالیٰ کا کلام سورۃ البقرہ اور آل عمران میں پڑھا ہے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے وظیفے میں پانچ سو درہم بڑھا دیئے۔ (مدارج نبوت) اسی طرح ایک روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد میں تشریف فرما تھے کہ یمن کے پختہ گو شاعر حضرت سواد بن قارب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہاں سے گزر ہوا۔ جو اہل یمن میں بڑا مقام رکھتے تھے۔ ایک شخص نے کہا امیر المومنین! آپ کو معلوم ہے کہ یہ گزرنے والا شخص کون ہے؟ انہوں نے کہا کہ تم خود بتاؤ کہ یہ کون ہے۔ عرض کیا یہ سواد بن قارب ہیں۔ یہی وہ شخص ہیں جن کو ان کے تابع جن نے حضور اکرم ﷺ کے ظہور بعثت کی خبر دی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں بلا کر تفصیلی گفتگو فرمائی۔ اور تابع جن کا پورا واقعہ سماعت فرمایا۔ جب سواد بن قارب رضی اللہ عنہ اپنے اسلام لانے کا قصہ سنا چکے تو حضرت عمر نے اٹھ کر گلے لگایا۔ اور کہا کہ میں چاہتا تھا کہ اس واقعے کی تفصیل خود تمہاری زبانی سنوں۔ پھر کہا اچھا یہ تو بتاؤ کہ اب بھی وہ جن تمہارے پاس آتا ہے۔ تو آپ نے فرمایا جب سے میں نے قرآن کریم کی تلاوت شروع کی ہے' وہ نہیں آتا اور جنوں کو حاضر کرنے کے لئے پڑھے جانے والے کلمات کے عوض قرآن مجید کتنا اچھا بدل ہے۔

(الوفا۔ ابن جوزی)

اس کے علاوہ خلافت راشدہ کے ابتدائی دور میں اسلامی سیاست کی توسیع اور فتوحات کے نتیجے میں مسلمانوں کو نت نئے مسائل اور مختلف العقائد لوگوں کا سامنا پڑا۔ اس میں شک نہیں کہ صحابہ کرام اہل دور صاحب سرور تھے۔ گریہ نیم شبی اور آہ سحر گاہی کی لذت سے آشنا تھے۔ لیکن یہ زمانہ امت مسلمہ کے لئے تنازع للبقا اور معرکۂ حق و باطل اور اقامت دین کا دور تھا۔ لہٰذا وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو جہاد پیہم اور اجتہاد

مسلسل کے لئے بروئے کار لانے پر مجبور تھے (رہانیت کوئی کا معاملہ تو یہ اس دور کی اہم ترین ضرورت تھی تاکہ منافقوں اور مرتدین کے فتنوں سے عامتہ المسلمین کی حفاظت کی جا سکے) اور چونکہ تقریباً تمام مذاہب کے پیروکار وجود باری تعالیٰ کے قائل تھے۔ لہٰذا حمد نگاری کی اس دور میں بھی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ البتہ خلافت راشدہ کے آخری دور میں جب رسول ﷺ کے خلیفۂ برحق امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہ کے خلاف حضرت معاویہ بن سفیانؓ نے علم بغاوت بلند کر کے شام میں ملوکیت کی بنیاد رکھی تو مسلمانوں کے اخلاقی رویہ پر اس کے بڑے منفی اثرات مرتب ہوئے اور وہ زر و مال کی ہوس میں جائز ناجائز اور حق و ناحق میں تفریق کو بھی فراموش کرنے لگے۔ اس اخلاقی زوال کے ساتھ بعض مسلمانوں کے عقائد و اعمال میں بھی بگاڑ پیدا ہونے لگا۔ اس پُر آشوب صورتحال میں ایک خلیفہ راشد کی حیثیت سے باب مدینۂ علم و حکمت حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ تعالیٰ وجہ الکریم نے اقامت دین اور امر بالمعروف کی ذمہ داریاں انجام دیتے ہوئے جو فصیح و بلیغ خطبات دیئے اور جو پند و نصائح پر مبنی اشعار کہے ان میں حمد باری تعالیٰ، صفات باری تعالیٰ اور دعا و مناجات کے اعلیٰ ترین شواہد ملتے ہیں۔ یہ شواہد علم الٰہیات کے نقش اول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمتہ اللہ علیہ "حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہ الکریم کی بلاغت نہ صرف اپنے زمانہ کی حد تک بلکہ ادب و بلاغت کے بین الاقوامی ریکارڈ اور تاریخ ادب کے مختلف ادوار کے لحاظ سے بھی ایک جداگانہ شان رکھتی ہے۔" (المرتضیٰ)

ماحیِ رفض و تفضیل و نصب و خروج
حامیِ دین سنت پہ لاکھوں سلام

(مولانا احمد رضا خاں بریلوی علیہ رحمہ)

خلاصہ

اس مقالے میں حمد نگاری کی فقہی حیثیت کا جائزہ لینے کے لئے قائم کردہ سوالات کے جوابات کا خلاصہ یہ ہے کہ دور رسالت میں اگرچہ عہد جاہلیت کے بعض فحول شعراء کے حمدیہ کلام کی قابل قدر مثالیں موجود تھیں لیکن نزول قرآن کے بعد مسلمان شعرائے کرام کلام الٰہی کی معجز نما فصاحت و بلاغت، خوبیٔ مضامین اور حقائق توحید کے بیان سے اس قدر متحیر و متاثر تھے کہ وہ فہم قرآن ہی میں مستغرق رہے اور حمد نگاری پر انہوں نے طبع آزمائی نہیں کی۔ البتہ حضور اکرم ﷺ کے حکم پر یا آپ ﷺ کی محبت میں انہوں نے جو نعتیہ قصائد کہے ان میں اللہ تعالیٰ کی حمد و سپاس اور دعا و مناجات کے مضامین پر مشتمل اشعار شامل ہوئے تھے۔ اس دور مبارک میں دور حاضر کی مروجہ حمد نگاری یا خالصتاً حمدیہ شاعری کی مثالیں سامنے نہیں آتیں۔ نہ ہی حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حمدیہ شاعری کا حکم دیا تھا جس کی تعمیل میں حمد نگاری کو وجوب کا درجہ حاصل ہوتا۔ نہ ہی نذرانۂ نعت کی طرح حمدیہ شاعری کے نذرانے آپ ﷺ کی خدمت

اقدس میں پیش کیے گئے۔ چونکہ مشرکین اللہ تعالیٰ کی الوہیت کے قائل تھے لہٰذا انہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجو کی طرح اللہ تعالیٰ کی شان میں ایسے نازیبا اشعار نہیں کہے جن کے جواب دینے کے لئے حمدیہ شاعری کو ضروری سمجھا جاتا۔ اس لئے دور رسالت میں حمدیہ شاعری کی مثالیں نہیں ملتیں اور خلافت راشدہ کے ادوار ثلاثہ میں بھی باقاعدہ حمد نگاری کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ البتہ خلافت راشدہ کے چوتھے اور آخری دور میں چونکہ بعض مسلمانوں کے عقائد میں بگاڑ پیدا ہونے لگا تھا اس صورتحال کی اصلاح کے لئے حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم نے اقامت دین اور امر بالمعروف کی ذمہ داریاں انجام دیتے ہوئے اپنے خطبات اور پند و نصائح پر مبنی کلام میں حمد باری تعالیٰ، صفات باری تعالیٰ اور شکر و مناجات کو موضوع کلام بنایا ہے۔ جسے دور اسلام میں حمد باری تعالیٰ (حمدیہ شاعری) کے نقش اول سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مروجہ حمد نگاری نہ فرض ہے نہ واجب ہے اور نہ سنت مؤکدہ۔ فقہی اعتبار سے یہ مستحب ہے۔ اور اس کی بنیاد استحسان پر ہے۔ (واللہ اعلم)

(لہٰذا جو حضرات اپنے مضامین میں حمد گوئی کو فرض قرار دیتے ہیں ان کو چاہئے کہ فقہی اصطلاحات استعمال کرتے ہوئے وہ محتاط رویہ اختیار کریں)

حمد باری تعالیٰ اور تصوف

خلافت راشدہ کو اس کی خصوصیات کی بنا پر "خلافت علیٰ المنہاج النبوۃ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس مبارک دور کے ختم ہونے کے بعد دور ملوکیت میں عالم اسلام کو جو صدمات پیش آئے تاریخ کا ہر طالب علم ان سے واقف ہے۔ اس دور کے متعلق نبی پاک علیہ السلام نے جو پیش گوئیاں فرمائیں وہ کتب حدیث میں موجود ہیں۔ مثلاً حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ میری امت کو قریش کا یہ قبیلہ ہلاک کرے گا۔ صحابہ نے عرض کیا پھر حضور ہم کو کیا حکم دیتے ہیں۔ فرمایا کاش لوگ ان سے کنارہ کش رہیں۔ (صحیح مسلم۔ جلد دوم) اسی طرح حضرت عامر بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ اپنے اونٹوں میں موجود تھے، ان کا بیٹا عمر آیا حضرت سعد بن وقاص نے عمر کو دیکھ کر کہا کہ اس سوار کے شر سے میں خدا کی پناہ چاہتا ہوں۔ عمر گھوڑے سے اتر آیا اور باپ سے کہا تم اپنے اونٹوں اور بکریوں میں آپڑے اور لوگوں کو حکومت اور کشاکش کرتے چھوڑ دیا۔ حضرت سعد بن وقاص نے اس کے سینے پر مکا مارا اور فرمایا خاموش رہ۔ میں نے حضور علیہ السلام سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پرہیزگار، بے لوث اور گوشہ نشین بندے سے محبت کرتا ہے۔ (مسلم شریف) اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم علیہ السلام کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ علیہ السلام! کون شخص سب سے افضل ہے؟ فرمایا جو شخص اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کرتا ہے۔ اس نے عرض کیا پھر کون؟

فرمایا وہ مومن جو پہاڑ کی کسی گھاٹی میں اپنے رب کی عبادت کرتا ہے اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھتا ہے۔ (مسلم شریف۔ جلد دوم)

خلافت راشدہ کے بعد دور ملوکیت میں مسلمان حکمراں اپنی تین بنیادی ذمہ داریوں یعنی تعلیم کتاب وحکمت' تزکیۂ نفس اور اجتہاد سے عہدہ برآنہ ہو سکے کیونکہ ان میں اس کی استعداد نہ تھی۔ جس کے نتیجے میں معاشرے میں فسق و فجور اور فتنہ و فساد نے سر اٹھایا اور اموی خلیفوں کی بے لگامیاں اسلامی سوسائٹی میں عام ہونے لگیں ان اسباب نے اہل علم اور مخلص بندگان خدا کو مجبور کیا کہ وہ گوشۂ اعتکاف میں بیٹھ کر یاد خدا میں مصروف رہیں اور بندگان خدا کی مذہبی رہنمائی کرتے رہیں۔ ان حالات میں مسلک تصوف کی پوری نشوونما ہوئی۔ روحانی ترقی کے بارے میں صوفیائے کرام کا جو نظریہ تھا وہ ترک نفس اور ذکر و فکر الٰہی اور معرفت حق تعالیٰ میں پورے استغراق و انہماک پر مبنی ہے۔ اس انجذاب اور توجہ قلب سے انہوں نے ذات باری تعالیٰ کا قرب اور معرفت حق کے ثمرات حاصل کئے اور بندگان خدا کے عقائد داعی کی اصلاح کا فریضہ انجام دیا۔ مختصر یہ کہ ملوکیت میں تصوف کی تحریک (جو زیر زمین آب رواں کی طرح) جاری تھی' عالمگیر محبت و احسان کی صورت میں ابھری اور سوز محبت کی اس تحریک سے افراد معاشرہ میں جمالیاتی تخلیقی استعداد اور بڑی تیزی سے نشوو ارتقاء کرنے لگی۔ آئمہ اہلبیت اطہار نے اس دور میں ضرورت وقت کے تحت معرفت حق' صفات باری تعالیٰ اور حمد و سپاس حق تعالیٰ کے عنوان کے تحت بڑے مؤثر منثور و منظوم کلام سے اس دور کی فلسفیانہ موشگافیوں کا جواب دیا اور عقائد اسلام کی حفاظت کی۔ جس کی ایک مثال حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کے درج ذیل حمدیہ اشعار ہیں۔

الحمدللّٰہ علی ماعر فنا من نفسه والهمنا من شكره و حمده

تمام تعریفیں اور شکر و سپاس اس اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں اپنی معرفت عطا فرمائی اور اپنے شکر اور حمد کو ہمارے دلوں میں ڈالا۔

الذی قصرت عن رویته ابصار الناظرین و عجزت عن نعته اوهام الواصفین

وہ ایسا ہے کہ اس کے دیدار سے دیکھنے والوں کی نگاہیں قاصر ہیں اور اس کے اوصاف بیان کرنے سے توصیف و ثناء کرنے والوں کا تخیل قاصر ہے۔

ابتدع بقدرته الخلق ابتدعا و اخترع علی مشیه اختراعا

اس نے اپنی قدرت سے مخلوق کو ایجاد کر کے وجود بخشا اور اپنی مرضی سے ہستی کے سانچے میں ڈھالا۔

آئمہ اہل بیت اطہار میں حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ ایک عارف حق' فقیہہ' عالم' شاعر' فلسفی' غیر ملکی زبانوں پر قادر اور بے حد وسیع المشرب بزرگ تھے۔ جدید علم کیمیا کے بانی جابر بن حیان نے اپنے انکشافات و ایجادات کی بنیاد اس مواد پر رکھی جو امام جعفر صادقؓ نے فراہم کیا تھا۔ (اسپرٹ آف

اسلام) وہ عموماً یہودی، عیسائی اور زرتشی ارباب فضل سے تبادلۂ خیال اور مابعد الطبیعاتی مباحث میں مصروف رہتے تھے۔ اس طرح انہوں نے فلسفیوں اور اہل کلام منطقیوں کی موشگافیوں کو انہی علوم کے مباحث سے رد فرمایا اور اسلامی عقائد کی عقل کی بنیاد پر تفہیم کی راہیں استوار کیں۔ ان کے حمد و مناجات پر مبنی کلام کی متعدد مثالیں ہمارے سامنے ہیں انشاء اللہ کسی اور موقع پر ان کو ہدیۂ قارئین کیا جائے گا۔

پہلی صدی ہجری میں بعض مسلمان اہل علم و دانش میں یہ رجحان پیدا ہوا کہ وہ اعمال ظاہر کی پابندی کے ساتھ ساتھ خیالات و محرکات کی نشو و نما پر بھی توجہ دیں جو امتداد زمانہ کے ساتھ بتدریج کمزور پڑتے جا رہے تھے۔ اس زمانے میں شاعری اور نظم کا وجود اہل تصوف کے گرد پایا جاتا رہا۔ پھر دوسری اور تیسری صدی ہجری میں صوفیاء کرام کی عارفہ شاعری میں حمد باری تعالیٰ کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اس دور میں عامۃ المسلمین شریعت مطہرہ کے اوامر و نواہی پر ہی توجہ دیتے رہے لیکن بعض مردان حق (صوفیاء کرام) نے باطنی احوال و کیفیات کو اپنا نصب العین بنا کر جذب تک رسائی حاصل کی۔ جس کے نتیجے میں ہمہ اوست اور ہمہ از اوست میں وہ اس قدر مستغرق ہو گئے کہ قرآن کریم کی آیت "صبغة الله ۔ و من احسن من الله صبغته" (البقرہ: ۱۳۸) یعنی ہم نے اللہ تعالیٰ کا رنگ اختیار کیا اور کس کا رنگ ہے اللہ تعالیٰ سے بہتر اور ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں کا مصداق بن گئے۔ کنزالایمان میں اس آیت کی تفسیر یہ بیان کی گئی ہے "یعنی جس طرح رنگ کپڑے کے ظاہر و باطن میں نفوذ کرتا ہے اسی طرح دین الٰہی کے اعتقادات کماحقہٗ ہمارے رگ و پے میں سما گئے۔ ہمارا ظاہر و باطن قلب و قالب اس کے رنگ میں رنگ گیا۔ ہمارا رنگ ظاہری رنگ نہیں جو کچھ فائدہ نہ دے بلکہ یہ نفوس کو پاک کرتا ہے"

ان بزرگوں نے اپنی روحانیت اور معرفت الٰہی سے ہزاروں دلوں کو منور کیا، تخلیق کائنات کے مدارج اور تنزلات ستہ کی تعبیرات کو سمجھا اور ان کو اہل علم و عرفان میں اپنے عارفانہ کلام کے ذریعہ عام کیا۔ عارفان حق کا یہی دور ہے جس میں عارفانہ کلام (نظم و نثر) حقائق کائنات اور حقیقت محمدیہ (علیہ السلام) کے بیان کے ذریعہ حمدیہ شاعری کی ترویج ہوئی جس کا تسلسل زمان و مکان کی جزئیات سے قطع نظر کسی نہ کسی طرح موجودہ دور تک قائم ہے اور یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ عالم اسلام کے شعری شہکار صوری و معنوی ہر لحاظ سے رنگ تصوف سے مزین ہیں۔

حمد نگاری میں تفکر بالآیات حق کی اہمیت

ارشاد باری تعالیٰ ہے "بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات و دن کے اختلاف میں (ان) اہل عقل کے لئے نشانیاں ہیں۔ جو کھڑے ہوئے بیٹھے ہوئے اور کروٹ کے بل لیٹے ہوئے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہتے ہیں اور غور و فکر کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں۔" (آل عمران ۱۹۱۔۱۹۰)

ان آیات قرآنی میں اہل علم و دانش کو ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنے اور عالم موجودات پر خالق کائنات کے حوالے سے غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے کیونکہ اس کارخانۂ قدرت کی نیرنگیوں اور رعنائیوں میں وہ جتنا فکر و تدبیر کریں گے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت' اس کے علم محیط اور حکمت کاملہ پر ان کا ایمان پختہ ہوگا اور ایمان کی یہ پختگی تقلیدی نہیں ہوگی بلکہ تحقیقی ہوگی۔ آیات حق (اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں) پر غور و فکر کے حوالے سے قرآن کریم میں سورۃ الرعد کی آیت ۳' سورۃ النحل کی آیت ۱۰' ۱۱' ۲۴' سورۃ الروم کی آیت ۸ اور سورۃ الحشر کی آیت ۲۱ کے مطالعے اور ان کی تفسیری حواشی پر بھی توجہ فرمانے کی سفارش کی جاتی ہے تاکہ تفکر بالا آیات حق کی اہمیت ہمارے ذہنوں میں پوری طرح واضح ہو سکے۔

باب شہر علم و حکمت مولائے کائنات حضرت علی ابن ابو طالب کرم اللہ تعالیٰ وجہ الکریم سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا (آیات قدرت پر) غور کرنے کے برابر کوئی عبادت نہیں (تفسیر مظہری)۔ اسی طرح علامہ بیضاوی علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے کہ مظاہر کائنات میں غور و تدبر کرتے رہنا سب عبادتوں سے افضل ہے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ تفکر و تدبر کے ہم پایہ کوئی عبادت نہیں۔

تفکر کی حقیقت

عقل کے نقطۂ نظر سے قوت مفکرہ کو تحریک میں لانے کو تفکر کہا جاتا ہے یعنی کسی شے میں اطمینان و یکسوئی کے ساتھ غور و فکر کرنے اور عقل و نظر سے کام لینے کو تفکر کہا جاتا ہے۔ جوہری کا قول ہے فکرۃ وہ قوت ہے جو معلوم تک پہنچنے کے لئے علم کی رہنمائی کرتی ہے اور تفکر کا معنی ہے قوت' فکر کی حرکت جو عقلی نظر کے موافق ہو۔ البتہ تفکر کا دائرہ صرف ان چیزوں تک محدود ہے جن کے نقوش انسان کے دل و دماغ پر مرتسم ہو سکتے ہوں۔ امام راغب کے نزدیک فکر میں ذات الٰہی کے ادراک کی صلاحیت نہیں کیونکہ ذات الٰہی کی کوئی مثل نہیں۔ (لیس کمثلہ شی۔ کوئی چیز اس کی مثل نہیں۔ سورۃ الشوریٰ۔ ۱۱) اور جب وہ کسی چیز کے مثل نہیں اور اس کی کوئی شکل و صورت ہی نہیں' اس کی ذات مجرد و بسیط' بے کیف و کم اور بے عدیل و بے مثال ہے' اس لئے عقل و فکر' تخیل و تصور اور وہم و گمان سے وراء الوراء ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے تفکروا فی الآء اللہ ولا تفکروا فی اللہ (طبرانی) یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور کرو اس کی ذات میں غور نہ کرو۔ اور ابو نعیم نے "حلیہ" حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کی روایت ان الفاظ کے ساتھ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں غور کرو اور اللہ تعالیٰ کی ذات میں غور نہ کرو۔ ان احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات میں غور کرنے کی اسلامی تعلیمات میں ممانعت ہے۔ صرف افعال الٰہی اور اس کے اسماء و صفات پر غور و تفکر کرنا چاہیے۔

قاضی محمد ثناء اللہ مجددی پانی پتی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں "چونکہ دوام ذکر (الٰہی) اصل مقصد ہے اور اس کا مرتبہ بہت بلند ہے اور تفکر ہی ایک ایسا طریقہ ہے جو ذکر تک پہنچاتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اولی الالباب (ارباب عقل سلیم) کی صفت دوام ذکر کو قرار دیا ہے اور اس کے بعد تفکر کا ذکر کیا جو علم (ذکر) تک پہنچاتا ہے۔ اس کے علاوہ فکر سے پہلے ذکر کو بیان کرنے سے اس امر پر تنبیہ بھی ہوتی ہے کہ عقل تنہا کوئی صحیح حکم اور فیصلہ نہیں کر سکتی جب تک کہ نور ذکر اور ہدایت الٰہی سے ضیا چیں نہ ہو (یعنی تفکر سے پہلے نور ذکر کی ضرورت ہے۔" (تفسیر مظہری)

فکر کی اساس جب ایمان پر استوار ہوتی ہے تو اس کے اثرات کی بدولت فکر میں قوت' سکینت' استحکام اور فعالیت پیدا ہوتی ہے۔ قرآنی تعلیمات پر یقین رکھنے سے فکر میں ابعاد (دور اندیشی) اور ابعاد میں وسعت و آفاقیت پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تفکر بالآیات حق کی جولانگاہ صرف اس کائنات تک محدود نہیں۔

ہے	بڑی محدود	فکر	وارثیؔ
اسیر	حلقۂ ارض	و	سما ہے

حمد باری تعالیٰ کے بارے میں کچھ اہم نکات

تمام موجودات اللہ کی حمد و تسبیح بیان کر رہی ہیں

خالق کائنات جل جلالہٗ نے اپنی تمام مخلوقات کو ان کی مخصوص عبادت اور تسبیح سکھا دی ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنے مخصوص انداز میں اظہار بندگی اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کر رہا ہے۔ سورۃ النور کی ۴۱ ویں آیت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے "کیا تم غور نہیں کرتے کہ بلاشبہ اللہ ہی ہے جس کی تسبیح سب آسمانوں والے اور زمین والے اور پرندے پر پھیلائے ہوئے بیان کرتے ہیں۔ ہر ایک (ان میں سے) جانتا ہے اپنی صلات (دعا) اور اپنی تسبیح کو۔" اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے "اسی (اللہ) کی تسبیح بیان کرتے ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور جو چیز بھی ان میں موجود ہے اور کوئی بھی ایسی چیز نہیں مگر وہ اس کی حمد کرتے ہوئے اس کی پاکی بیان کرتی ہے۔ لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے۔" (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۴۴) یعنی آسمانوں اور زمین میں موجود تمام ملائکہ' جنات' انسان' حیوانات' نباتات اور جمادات غرض ہر چیز زبان حال اور زبان قال سے اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید بیان کر رہی ہے لیکن ہم ان کی تسبیح و تحمید کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ البتہ انبیاء علیہ السلام ان کی حمد و ثنا سن سکتے تھے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "اور ہم نے تابع کیے پہاڑ اس (داؤد علیہ السلام) کے ساتھ تسبیح بیان کرتے تھے شام کے وقت اور صبح کے وقت اور اڑتے پرندے جمع ہو کر اس کے ساتھ (بارگاہ رب العزت میں) رجوع رہتے۔" (سورۂ ص۔ آیت ۱۹) اور بلا استثناء بعض غیر

انبیاء سے بھی (بصورت کرامت) جمادات کی تسبیح کی سماعت کے شواہد موجود ہیں۔ جیسے صاحب تفسیر ضیاء القرآن نے بخاری شریف کے حوالے سے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب کھانا کھایا جارہا ہوتا تھا ہم اس کی تسبیح سنا کرتے تھے۔

حمد کے موضوعات بیکراں ہیں

ازل سے ابد تک تمام موجودات کی تسبیح و تحمید کے باوجود حمد کے موضوعات و امکانات لامحدود اور بے انتہا و بے حساب ہیں۔ اس مقالے کے آغاز میں سورۃ الکہف کی آیت ۱۰۹ اور سورۃ لقمان کی آیت ۲۷ کے حوالے سے یہ حقیقت بیان کی جاچکی ہے کہ دنیا کے سب سمندروں کے پانی کی روشنائی بنائی جائے اور اتنے ہی اور سمندروں کی مزید روشنائی مہیا کی جائے تو شان الٰہی کے کلمات رقم کرتے ہوئے ان سب سمندروں کا پانی ختم ہو جائے گا لیکن کلمات الٰہی کما حقہ رقم نہ ہو پائیں گے اور یہ مضمون تشنہ تحریری رہے گا۔

سنت الٰہیہ ہے کہ وہ کسی شخص کو اس کی طاقت و استطاعت سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتا (دیکھیے سورۃ البقرہ آیت ۲۸۶) خداوند کریم جانتا تھا کہ بندے کو اس کی حمد بیان کرنے سے عاجز ہیں اور اس کی استطاعت نہیں رکھتے۔ لہٰذا ذات باری تعالیٰ نے قرآن کریم کے ذریعہ انسان کو اپنی حمد و ثنا کے کلمات خود ہی تعلیم فرمائے۔ حضور اکرم ﷺ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء میں رطب اللسان رہنے والا اور کون ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود آپ حالت سجدہ میں فرماتے تھے کہ اے اللہ! میں تیری ایسی ثنا نہیں کر سکا جیسی تو خود اپنی ثنا کرتا ہے۔ (مسلم شریف)

ارشاد باری تعالیٰ ہے کتب ربکم علی نفسه الرحمة یعنی تمہارے پروردگار نے رحمت فرمانا خود پر لازم کر لیا ہے۔ (الانعام ۵۴) لہٰذا اس نے اپنے بندوں کو اپنی حمد کے کلمات اور اس کا طریقہ خود تعلیم فرمایا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے تم اپنے رب کی تسبیح و تحمید بیان کرو اور ہو جاؤ سجدہ کرنے والوں میں (الحجر۔۹۸) اس آیت مبارکہ کی روشنی میں حمد کی اعلیٰ ترین صورت نماز ہے جس کے دوران انسان اپنی زبان و ارمکمل وجود کے ساتھ حمد باری تعالیٰ کا اظہار کرتا ہے اور یہی حمد کے بیان اور اظہار بندگی کا طریقہ تا دم حیات انسان پر فرض کیا گیا ہے چنانچہ قیام نماز اور تلاوت قرآن نے افضل القرآن میں صحابہ کرام کو حمدیہ شاعری کی جانب متوجہ ہونے سے بے نیاز رکھا۔

باری تعالیٰ کا اسم ذات "اللہ" مکمل حمد ہے

صاحب لغات القرآن نے لفظ "اللہ" کی تفسیر و تعبیر کرتے ہوئے لکھا ہے "بلاشبہ (عربی زبان کا لفظ) الٰہ ہے جو حرف تعریف کے اضافے کے بعد "اللہ" ہو گیا ہے اور (حرف) تعریف نے اسے صرف

پس خالق کائنات کے لئے یہ لفظ اس لئے اسم قرار پایا کہ خالق کائنات کے لئے مخصوص کر دیا ہے ____ اس بارے میں انسان جو کچھ جانتا اور جان سکتا ہے وہ عقل کے تحیر اور ادراک کی درماندگی کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ وہ جس قدر بھی اس ذات مطلق کی ہستی میں غور و خوض کرے گا اس کی عقل کی حیرانی اور درماندگی بڑھتی ہی جائے گی۔ یہاں تک کہ وہ معلوم کر لے گا کہ اس راہ کی ابتدا میں عجز و حیرت سے ہوئی ہے اور انتہا بھی عجز و حیرت ہی ہے ____ اگر خدا تعالیٰ کو اس کی صفتوں میں پکارنا ہے تو بلاشبہ اسُ کی صفتیں بے شمار ہیں لیکن اگر صفات سے الگ ہو کر اس کی ذات کی طرف اشارہ کرنا ہے تو اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ وہ ایک متحیر کر دینے والی ذات ہے اور جو کچھ اس کی نسبت کہا جا سکتا ہے وہ عجز و درماندگی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی اس راہ میں عرفان و بصیرت کی کوئی بڑی سے بڑی بات کہی گئی تو وہ یہی تھی کہ زیادہ سے زیادہ خود درماندگیوں کا اعتراف کیا گیا اور ادراک کا منتہی مرتبہ ہمیشہ یہی قرار پایا کہ ادراک کی نارسائی کا ادراک ہو جائے۔"

چونکہ یہ اسم خداوند کریم کے لئے بطور اسم ذات استعمال کیا جاتا ہے لہٰذا یہ ان تمام اسمائے صفات پر محیط ہے جن سے خداوند کریم کی صفات کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ہم "اللہ" کہتے ہیں تو ہمارا ذہن ایک ایسی ہستی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو خالق کائنات معبود برحق کی تمام صفات جمال، صفات جلال اور صفات کمال سے متصف ہے۔

کسی بھی ذات کی توصیف و ستائش کا کمال یہ ہوتا ہے کہ انسان اس کے کمال فن سے متاثر ہو کر عاجزی کے ساتھ اسکی بڑائی کے اعتراف میں اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائے۔ یہ سجدہ ریزی صرف معبود برحق الٰہ العالمین کے حضور ہی کی جا سکتی ہے اور ماسوا کو سجدہ حرام ہے۔ خداوند کریم کو الالٰہ یعنی اللہ کہنے سے اس کے معبود مطلق و برحق ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔ لہٰذا لفظ اللہ مکمل حمد ہے۔

حمد کی اساس شکر ہے

الحمد قرآن کریم کی ایک جامع اور متعدد معانی کی حامل اصطلاح ہے۔ اس کی معروف معنی تعریف و ثنا اور شکر و سپاس ہیں۔ جیسا کہ گذشتہ سطور میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ تعریف و ثنا کے معنی میں حمد الٰہی کے ادراک و بیان سے انسان عاجز ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے احسانات 'انعامات' اور کارخانۂ قدرت کے عجائبات پر غور و فکر کر کے انسان کو شکر بجا لا کر اس کی حمد بیان کرنی چاہیے۔ شکر کی ضد کفر ہے اس کے لغوی معنی چھپانے اور انکار کرنے کے ہیں۔ اسلام کی رو سے جس طرح کفر بدترین خصلت ہے اس کے مقابل شکر سب سے بہتر اور اعلیٰ صفت ہے۔ قرآن کریم کی سورت النساء آیت ۱۴۷ میں ارشاد ربانی ہے "اگر تم (اللہ کا) شکر ادا کرو اور ایمان لاؤ تو خدا تعالیٰ تمہیں عذاب دیکر کیا کرے گا اور اللہ تو قدردان اور سب کچھ جاننے والا

ہے۔ "شکر و امتناں کے احساس کو زبان سے ادا کرنے کو قرآنی اصطلاح میں حمد سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سنن و شمائل میں ہر وقت اور ہر موقع و محل کی دعاؤں میں اللہ تعالیٰ کا شکر بیان کرنا نمایاں ہے۔

قرآن کریم کی متعدد آیات میں مختلف نعمتوں کے ذکر کے بعد شکر الٰہی کی تعلیم دی گئی ہے مثلاً ارشاد ربانی ہے "بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس نے بنائے آسمان میں بروج اور رکھا ان میں چراغ (سورج) اور ماہ منیر اور وہی ہے جس نے بنائے رات اور دن بدلنے والے۔ جو شخص ان پر دھیان رکھے اسے چاہئے کہ شکر ادا کرے (الفرقان ۶۱ تا ۶۲) یعنی چاند سورج اور دن ورات کے یکے بعد دیگرے آنے میں فکر و تدبر کر کے لوگ خداوند کریم کی معرفت کا سراغ لگائیں کہ یہ سب تفرقات و تقلبات اسی کے دست قدرت کی نشانیاں اور کارسازیاں ہیں اور رات و دن کے فوائد والقامات کو دیکھ کر اس کی شکر گزاری کی جانب متوجہ ہوں۔

سورۃ النحل کی پانچویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے "اللہ کی نعمت کا شکر کرو اگر تم اس کی بندگی کرتے ہو۔ اسی طرح دیگر آیات میں اللہ تعالیٰ کے احسانات کو بیان کرنے اور ان پر شکر کا حکم دیا گیا ہے یعنی جس طرح ہمارا کوئی محسن ہمیں کوئی مدد بہم پہنچاتا ہے تو ہم اگر یہ کہتے ہیں کہ آپ بہت عظیم ہیں 'آپ بہت مخلص ہیں یا آپ بہت فیاض ہیں۔ تو بظاہر یہ تعریفی الفاظ نظر آتے ہیں لیکن ان کی بنیاد جذبۂ تشکر ہوتی ہے۔ اسی طرح ذات واہب العطایا کی تعریف و توصیف کی اساس جذبہ شکر ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات خاص طور پر پیش نظر رہنی چاہئے کہ رسول اکرم ﷺ کی بعثت مبارکہ کو قرآن کریم میں مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان فرمایا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "بیشک اللہ کا بڑا احسان ہوا مسلمانوں پر کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔" (آل عمران۔ ۱۶۴) اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کثرت سے اپنی نعمتوں کا ذکر تو فرمایا ہے لیکن انکو اس طرح احسان نہیں کہا۔ بڑا احسان کہہ کر صرف حضور اکرم ﷺ کی تشریف آوری کی نعمت عظیمہ کا تذکرہ فرمایا ہے۔ لہذا جب اللہ تعالیٰ کی عام نعمتوں کے اظہار و بیان اور ان پر شکر ادا کرنے کا حکم ہے جو حمد باری تعالیٰ ہی کی ایک صورت بیان کی گئی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہر ثنا اور ہر تعریف اس کا شکر ہے اور اسکی ہر حمد شکر کے ضمن میں ہے تو اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت اور احسان عظیم کے بیان اور اس حوالے سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا حمد نگاری میں کس قدر اہمیت کا حامل ہے۔ اسی بنیاد پر نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حمد باری تعالیٰ میں شامل ہے۔ اسی طرح دعا و مناجات میں چونکہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت اور شان کبریائی اور بندے کی عبودیت و عجز کا اظہار ہوتا ہے لہذا قرآن کریم کی تعلیمات کی روشنی میں یہ بھی حمد باری تعالیٰ ہی کا ایک انداز ہے۔

تسبیح و تقدیس حمد باری تعالیٰ کے لوازم ہیں

سورۃ البقرہ کی ۳۰ ویں آیت میں فرشتوں کا قول بیان کیا گیا ہے نحن نسبح بحمدك و نقدس لك یعنی ہم تیری تسبیح کرتے ہیں تری حمد کے ساتھ اور پاکی بیان کرتے ہیں ترے لئے۔ اس ایک جملے میں ذات باری تعالیٰ کی تسبیح، تحمید اور تقدیس کو وظیفہ ملائکہ بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ تسبیح، حمد و ثنا اور تقدیس مطلقاً اللہ تعالیٰ ہی کی شان ہے۔ بعض مفسرین کرام نے ان تینوں الفاظ کو ایک دوسرے کا مترادف لکھا ہے لیکن اس میں تفصیل ہے لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ کی مختصر تشریح بالترتیب ہدیہ قارئین کی جائے۔

تسبیح : تسبیح کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ تنزیہہ بیان کرنے کو کہتے ہیں یعنی خلوص وایقان کے ساتھ اس حقیقت کا زبان سے اظہار یا اعتراف کرنا کہ اس کی ذات پاک ہر قسم کے نقص، عیب اور شرک سے اور ہر اس چیز سے پاک و منزہ اور وراء الوراء ہے جو اس کی عظمت و کبریائی کے منافی یا اس کی شایان شان نہ ہو۔ اس کے ایک معنی عبادت الٰہی میں تواتر کے ہیں اسی لئے وہ مالا جس کے موتیوں پر یکے بعد دیگرے تسلسل کے ساتھ مقدس کلمات کا ورد کیا جاتا ہے اسے استعارۃً تسبیح کہا جاتا ہے۔ غرض تسبیح کا لفظ قولی، فعلی اور قلبی ہر اس عبادت کے لئے بولا جاتا ہے جسے مسلسل اور سرگرمی کے ساتھ کیا جائے۔ علامہ راغب اصفہانی مفردات میں لکھتے ہیں کہ کسی کام کو پوری سعی و جہد یا تگ و تاز کے ساتھ کرنے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اور عربی ادب میں یہ لفظ قیام صلوٰۃ اور فرمانبرداری کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔

تحمید (حمد) : حمد کے معانی اللہ تعالیٰ کی ثنا اور شکر کے ہیں البتہ حمد شکر سے عام ہے اور تحمید اللہ تعالیٰ کی بار بار حمد کرنے کو کہا جاتا ہے اسی طرح محمد (ﷺ) کے معنی ہیں جس کی بار بار حمد (تعریف و توصیف) کی گئی ہو۔ صاحب تبیان القرآن علامہ غلام رسول سعیدی نے علامہ سید شریف کے حوالے سے حمد کی مندرجہ ذیل اقسام نقل کی ہیں :

حمد : کسی خوبی کی بطور تعظیم ثنا کرنا۔

حمد قولی : زبان سے اللہ تعالیٰ کی وہ تعریف کرنا جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی زبانوں کے ذریعہ خود اپنی تعریف فرمائی ہے۔

حمد فعلی : اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لئے بدن سے نیک اعمال کرنا۔

حمد حالی : روح اور قلب کے اعتبار سے ثناء کرنا مثلاً علمی اور عملی کمالات سے متصف ہونا اور اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے متخلق ہونا۔

حمد عرفی : منعم کے انعام کی وجہ سے کوئی ایسا فعل کرنا جس سے اس کی تعظیم ظاہر ہو، عام ازیں کہ زبان

سے ہو یا دیگر اعضاء سے (تفسیر بتیان القرآن جلد اول)

عزیزم سید صبیح الدین رحمانی نے غوث میاں کے مرتب کردہ انتخاب حمد میں شامل اپنے مضمون میں حمد گوئی کو ایک فنی عبادت سے تعبیر کیا ہے۔ میری نظر میں ان کی یہ تعبیر حمد عرنی کے ایک معتبر ذیلی عنوان کی حیثیت رکھتی ہے۔

تقدیس: تقدیس اللہ تعالیٰ کی بزرگی پاکی اور برکتوں کے بیان کرنے کو کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم مبارک القدوس (سورۃ الحشر) بھی ہے۔ یہ مبالغے کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت پاک اور بڑی برکتوں والی اور برکتیں عطا فرمانے والی ذات۔ حمد باری تعالیٰ میں اللہ تعالیٰ کی ثناء اور شکر و سپاس کے ساتھ اس کی تنزیہہ و تمریک اور بزرگی بیان کرنا وظیفہ ملائکہ ہے لہٰذا حمد نگاروں کو ان نکات کے بیان پر بھی توجہ دینی چاہیے۔

عصر حاضر میں حمد نگاری کی ضرورت و اہمیت اور تقاضے

اردو زبان کے قدیم و جدید شعرائے کرام نے اپنی حمدیہ شاعری میں اب تک جن ارفع و اعلیٰ خیالات اور علم و وجدان کے حوالے سے مضمون آفرینی کی ہے وہ بڑی پر تاثیر اور قابل تحسین ہے جو بلاشبہ مسلمانوں کے دلوں کو گرماتی رہی ہے لیکن ہر زمانے کے عقلی تقاضے مختلف ہوتے ہیں اور ہر کمال کو زوال ہے کے مصداق کمال کسی ایسے نقطۂ عروج کا نام ہیں جو ختمی ہو۔ ہر کمال کے بعد ایک نیا کمال ہوتا ہے اور یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ لہٰذا جدت افکار یا نو بہ نو کمال کی طلب و جستجو ہر دور میں ناگزیر رہتی ہے۔

آج کا دور سائنس کا جدید ترقیاتی دور کہلاتا ہے۔ موجودہ صدی کے گذشتہ چند عشروں کے دوران حیرت انگیز سائنسی ایجادات نے انسان کو مشینی زندگی کے پہیے میں الجھا رکھا ہے جس کے نتیجے میں ملحدانہ اور مادیت پرست نظریات ہماری سوسائٹی میں عام ہوتے جا رہے ہیں اور مذہبی تشکیک ہمارے معاشرے میں جگہ بناتی جا رہی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ اس حقیقت سے بے خبری نظر آتی ہے کہ قرآن کریم ہی تمام قدیم و جدید علوم کا منبع و مصدر ہے۔ البتہ اس حوالے سے قرآن کریم کی آیات پر غور و فکر کے نتیجے میں دور حاضر کے وہ مفکرین اسلام جو قرآن فہمی کے ساتھ جدید سائنسی علوم کے کسی شعبے سے وابستہ ہیں' یہ دیکھ کر انکے ایمان و ایقان میں حیرت انگیز طور پر مزید پختگی اور وسعت و آفاقیت پیدا ہوتی ہے کہ جدید تجرباتی علوم کی دریافتوں کے نتائج قرآنی انکشافات و حقیقتوں کے ترجمان ہیں۔ قرآن کریم کی وہ آیات جنہیں متشابہات سے تعبیر کیا جاتا ہے' ان آیات کے معانی آج کے مفکرین اسلام کے ذہنوں پر ٹھوس حقائق کی شکل میں روشن ہو رہے ہیں۔ چنانچہ ان کلمہ اعتقاد مشاہدے میں ڈھلتا جا رہا ہے کہ کائنات کے سائنسی علوم ایک مرد مومن کی گم گشتہ میراث ہیں بقول رئیس وارثی سلمہ۔

اسرار مشیت کے جو قرآن میں آئے
اس دور میں وہ عالم امکان میں آئے

قرآن کریم میں کم وبیش ۷۵۰ مقامات پر قاری کی توجہ سائنسی حقائق اور مشاہدات کی جانب مبذول کرائی گئی ہے اور اسی سے روگردانی کے سبب تقریباً گزشتہ دو صدیوں سے عالم اسلام علمی انحطاط کا شکار ہے۔ کاش مسلمان طلباء قرآن کریم کی روشنی میں جدید سائنسی علوم کا مطالعہ کریں تاکہ ان کے ذہنوں میں مذہب اور سائنس کی وہ باہمی مطابقت اجاگر ہو سکے جس کا آج تصور تقریباً محال ہے۔ یہ مسلمان محققین اپنی ان تحقیقی کاوشوں سے ملت اسلام کو ایسا مواد فراہم کریں جس کے مطالعے سے افراد ملت کے قلوب کو اطمینان واعتماد نصیب ہو اور ان کے افکار عصری تخلیقی شاہکاروں میں ڈھل کر ایک نئے محققانہ انداز سے مشاہدات کی اساس پر حمد باری تعالیٰ کے لئے محرک ثابت ہوں۔

یہاں یہ بات کہنا بھی ضروری ہے کہ جو راسخ العقیدہ مسلمان ایمان بالغیب کی سعادت سے بہرہ مند ہیں ان کے لئے تو وجدانی حمدیہ شاعری ازدیاد شوق کا باعث ہوتی ہے لیکن ملت اسلام کے وہ افراد جو کسی ایسے ماحول میں زندگی گزار رہے ہیں جہاں قدم قدم پر انہیں مادیت پرستی اور ملحدانہ افکار' نظریات کا سامنا رہتا ہے ان کی تسکین قلب اور تقویت ایمان کے لئے حمد نگاری کی ترویج کی راہیں اس طرح بھی استوار کی جائیں کہ قرآن کریم کی آیات میں مضمر سائنسی حقائق کو جس قدر ممکن ہو حمدیہ شاعری میں بیان کیا جائے تاکہ جدید ایجادات واختراعات کی حیران کن تاثیرات اور اس میں مضمر کسی بدیع نظام پر ہماری نگاہ پڑے تو ہم اس میں کھو کر نہ رہ جائیں بلکہ اس احسن الخالقین کی حمد وثناء اور شکر وسپاس کی جانب راغب ہوں جس نے انسان کو ان نوبہ نو دریافتوں کی اہلیت وصلاحیت عطا فرمائی ہے اور اس حوالے سے ذات باری تعالیٰ کی عظمت و جلالت' علم وقدرت اور مشیت وحکمت کی جانب بیتابانہ متوجہ ہوں۔ لیکن ایسے حقائق کے بیان کے لئے حمد نگار میں نور ایمان کے ساتھ ذوق تجسس کا ہونا لازمی ہے کیونکہ اعلیٰ ترین فکر کی جڑیں ہمارے ذوق تجسس میں ہی پیوست ہوتی ہیں اور کسی اعلیٰ تخلیقی فکر کو تحریک دینے کا باعث ومحرک ہمارا ذوق تجسس ہی ہوتا ہے۔

بلاشبہ یہ ایک حوصلہ آزما اور ہمت طلب سلسلہ عمل ہے جسے مسلسل جاری رکھنے کے لئے مفکر کا رجائیت پسند ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص طبعزاد (Original) کام کرنا چاہتا ہے تو اسے یہ یقین رہنا چاہئے کہ وہ بہر حال درپیش مسائل کا مستقل مزاجی کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے اپنے مقاصد کو حاصل کر کے رہے گا۔ خواہ اس راہ میں اسے کتنی ہی مخالفت اور ناکامیوں کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔

قرآنی تعلیمات کے حوالے سے حمد باری تعالیٰ کے امکانات لامحدود ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور شیون الٰہیہ کا سلسلہ ازل سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ چنانچہ اس کی تخلیقات اور ان تخلیقات کے حقائق بے حد حساب اور انگنت وبے شمار ہیں لہٰذا جدید ترقی یافتہ دور کی یہ ایک اہم ترین

ضرورت ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی نشانیوں اور مظاہر قدرت پر غور و فکر کو اپنا شعار بنائیں اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے بیان کے لئے تقلیدی فکر کے بجائے عزم تحقیق سے خود کو تخلیقی فکر سے آراستہ کریں تاکہ ہمارے افکار میں وسعت و آفاقیت پیدا ہو اور ہم اپنی آئندہ نسل کے ذہنوں میں اٹھنے والے سوالات کا اطمینان بخش جواب فراہم کر سکیں اور اسی کی ایک صورت یہ ہے کہ ہم دور حاضر کی مروّجہ حمد نگاری کو عصری ضرورت سے بھی ہم کنار کریں۔

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط (بھارت)

اردو کی حمدیہ شاعری میں فلسفیانہ رجحان

"حمد ثنائے جمیل ہے "اس ذات محمود کی جو خالقِ سماوات والارض ہے۔ جس کی کار فرمائی کے ہر گوشہ میں رحمت وفیضان کا ظہور اور حسن وکمال کا نور ہے پس اس مبدء فیض کی خوبی وکمال اور اس کی بخشش و فیضان کے اعتراف میں جو بھی تحمیدی و تمجیدی نغمے گائے جائیں گے ان سب کا شمار حمد میں ہوگا۔ حمد دراصل خدا کے اوصاف حمیدہ اور اسمائے حسنیٰ کی تعریف ہے۔" "یہ معرفت الٰہی کی راہ میں بندۂ خدا کا پہلا تاثر ہے"

تصور الٰہ فلسفے کا دلچسپ اور بنیادی موضوع رہا ہے۔ فلاسفہ اس دائم و قائم بالذات ابد الآباد سرور کُل ہستی کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہے ہیں لیکن اس کے حصول میں انھیں ناکامی اور نامرادی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا کیوں کہ یہ ہمہ گیر جدوجہد مادّیت سے مابعد الطبیعیات کی طرف لے جاتی ہے' جہاں وجدان کے بجائے عقل محض پر تکیہ ہوتا ہے اور بغیر دلائل وبراہین کے تحقیق کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس لیے فلسفیوں کے یہاں خدا کی ذات کے متعلق جتنی موشگافیاں پائی جاتی ہیں اتنی اور کہیں نہیں ملتیں۔ انہوں نے خدا کے وجود کو ریاضیات طبیعیات اور منطق واخلاق کی روشنی میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

اردو کو کوئی فلسفی شاعر نصیب نہیں ہوا۔ تاہم اردو شعراء اکثر وبیشتر اپنے اشعار میں بڑی خوبی سے فلسفیانہ خیالات پیش کرتے رہے ہیں جو یا تو کسی فلسفی کے نتیجۂ فکر سے مطابقت رکھتے ہیں یا پھر مستعار خیالات شعری پیکر میں ڈھال لیے جاتے ہیں۔ اردو کی حمدیہ شاعری میں اس قبیل کے سیکڑوں اشعار ہمیں مل جاتے ہیں جن میں تصور الٰہ کی توضیح کسی نہ کسی فلسفیانہ نقطۂ نظر سے کی گئی ہے۔ چنانچہ میر درد کا یہ کہنا۔

یارب! یہ کیا طلسم ہے ادراک و فہم یاں — دوڑے ہزار' آپ سے باہر نہ جا سکے

معرفت الٰہی میں شاعری کی درماندگی اور عاجزی کا مظہر ہے۔ مقام معرفت کی ابتداء اور انتہا دونوں سروں پر بندہ جو کچھ جان چکا ہوتا ہے وہ عقل وفہم کے تحیّر اور درماندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس لیے عرفان وبصیرت کے دعویداروں کو بھی بالآخر اس راہ میں گھٹنے ٹیکنے پڑتے ہیں اور بے ساختہ ان کی زبان پر

یہ کلمات جاری ہو جاتے ہیں۔

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

اور اپنی نارسائی فہم کا اقرار کرتے ہوئے وہ کہہ اٹھتے ہیں "رب زدنی فیك تحیراً" اس کا مفہوم یہ ہے کہ خداوند! اپنی ہستی میں ہمارا تحیّر بڑھا۔ معرفت الٰہی میں عجز و حیرت کی انتہا بے خودی یا بے خبری ہے جہاں پہنچ کر سالک (بندہ) "تو" اور "میں" دونوں بھول جاتا ہے۔ سراج اورنگ آبادی (م ۱۷۶۳ء) کا معرفت الٰہی میں استعجاب و حیرت ملاحظہ کیجیے۔

خبر! اے تحیّر عشق سن' نہ جنوں رہا نہ پری رہی   نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

اس کی مثال ہمیں شارن (Charron) کے فلسفے میں بھی ملتی ہے۔ وہ لاادریت (Agnoticism) کا قائل تھا اور ذات الٰہی میں تجسس کے مقابلے میں اسے تسلیم کر لینے اور مان لیے جانے پر زور دیتا تھا۔ گویا تفکروا فی خلق اللّٰہ ولاتفکرو انی ذات اللّٰہ (اللہ کی مخلوقات و مصنوعات میں غور کرو اور اس کی ذات میں نہ غور کرو) پر اس کا ایمان تھا۔ وہ خدا کو لامحدود اور انسانی فہم سے وراء الوراء سمجھتا تھا۔ شارن کے اسی خیال کا پرتو اکبر الٰہ آبادی کے اس شعر میں دکھائی دیتا ہے۔

ذہن میں جو گھر گیا' لاانتہا کیوں کر ہوا   جو سمجھ میں آگیا' پھر وہ خدا کیوں کر ہوا

(۳' الف)

ناقابل تحدید اُلوہیت کے اس نظریہ کو اکبر نے عام فہم انداز میں پیش کر دیا اور فلسفے میں ذات الٰہ کے متعلق جو تشکیک مثبت کا رجحان پایا جاتا ہے اس کی توضیح اس شعر میں سیدھے سپاٹ انداز میں کر دی جس کی وجہ سے یہ ادق مسئلہ نہایت سہل ہو کر رہ گیا۔ میرؔ نے بھی "کنہ ذات اللّٰہ" میں اپنی خرد کی حیرانی اور پشیمانی کا ذکر کیا ہے۔

خرد کنہ میں اس کی حیران ہے   گماں یا پریشاں پشیمان ہے

حیرانی کیوں نہ ہو؟ کہ ذات الٰہ کے بارے میں انسان جو کچھ جانتا ہے اور جان سکتا ہے وہ بقول مولانا ابوالکلام آزاد "عقل کے تحیّر اور ادراک کی درماندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔" لفظ الٰہ کے مصدر "آلہ" کے معنی تحیّر اور درماندگی کے بھی بتائے جاتے ہیں۔ پس ذات الٰہ میں میرؔ کی خرد کی پشیمانی مقتضائے فطرت ہے۔

شاہ نیاز بریلوی نے تو اللہ تعالیٰ کی حقیقت اور ماہیت "پرے از سرحدِ امکان" ہونے سے اپنا "دلِ آگاہ تنگ" ہو جانے کا اقرار کیا ہے۔

امکان سے باہر ہے تری کنہ کا پایا   ورنہ دلِ آگاہ میرا تنگ نہ ہوتا (۴)(ب)

شارن کے برخلاف ڈیکارٹ ذاتِ باری کو وجدان کے ذریعہ سمجھنے کا قائل تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ

"اگرچہ ہم خدا کی لامتناہیت کو اس طرح نہیں سمجھ سکتے کہ وہ فی نفسہٖ کیا ہے لیکن اس کی لامتناہی حقیقت کا اندازہ لگا سکتے ہیں جیسے ہم ایک بڑے اور مضبوط پیڑ کو دونوں ہاتھوں سے نہ گھیر سکنے کے باوجود اس کی مضبوطی کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔"

اس طرح ڈیکارٹ عقل کے بجائے قلب کی گہرائیوں میں ذاتِ باری کا تصور کرتا ہے وہ اثباتِ حقیقی کے لیے فکر پر احساس کو ترجیح دیتا ہے کیونکہ افکار، منطقی استنباط کے احساسات بالعموم وجدانی کیفیات کے تابع ہوتے ہیں۔ فکر یقین میں شک کا دروازہ کھول دیتا ہے اور احساس "یقین" کو "ایمان" کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ اس لیے فکر عرفان ذات الٰہ میں رہبری نہیں کر سکتا اور احساس ذات الٰہ کی کنہ میں بندے کی معرفت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ جیمس کالینس (James Collins) نے اپنی کتاب (God in modern philosophy) میں ڈیکارٹ کے اسی نظریۂ الٰہیت کو پیش کیا ہے جس میں خدا کی وجودیت کی توضیح بڑے نرالے انداز میں کی گئی ہے۔ وہ کہتا ہے:

"اس حقیقت کی بنیاد پر کہ میں خدا کا تصور اس کے وجود کے بغیر کر ہی نہیں سکتا یہ ثابت ہوتا ہے کہ وجود کو اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور اس طرح یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ حقیقتاً موجود ہے۔ یہ نہیں کہ میرے خیال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، بلکہ خدا کے وجود کا تقاضہ یہ خیال میرے دل میں پیدا کرتا ہے کہ خدا ہے۔"

ڈیکارٹ کے نظریۂ وجودیت کا عکس اردو شعراء کے اشعار میں دکھائی دیتا ہے لیکن اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ڈیکارٹ کے نظریہ کو پڑھ کر ہمارے شعراء متاثر ہوئے ہیں یا ڈیکارٹ کے فلسفیانہ خیالات سے انھوں نے خوشہ چینی کی ہے، بلکہ خدا کے متعلق تو یہ عام تاثر بندگانِ خدا کا ہے کہ وہ اسی طور پر بر ملا اور بے ساختہ خدا کے وجود کا اقرار کر لیتے ہیں۔ حالی نے اسی تاثر کو ذیل کے شعر میں پیش کیا ہے۔

مانا نہیں جس نے تجھ کو جانا ہے ضرور   بھٹکے ہوئے دل میں ہے کھٹکا تیرا

یہی فکر لے کر اکبر الٰہ آبادی نے اللہ کی ذات کا عرفان حاصل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا   بس جان گیا میں، تری پہچان یہی ہے

ایقان کی اس منزل میں عقل، عجز و درماندگی کے اندھیارے میں گھری نظر آتی ہے اور دل نورِ الٰہی سے معمور۔ عقل کی تہی دامانی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی کہ خدا جو رگِ جاں سے بھی قریب تر ہے اور جو "نحن اقرب الیہ من حبل الورید" کی گواہی دے وہ سمجھ میں نہ آئے۔ فہم و ادراک کی اس درماندگی اور شعور و دانش کی تہی مائیگی کی بدولت انسان حجاب ہائے ذاتِ حقیقی کا کاشف نہیں بن سکا اور عقل کی نارسائی کے ساتھ ہی دیدۂ بینائی کو رحیثی نظارۂ جمال [illegible] مطابق [illegible] وجہ سے ہم نے اس ذات

مشہود کو نامشہود اور نامستور کو مستور بنالیا ہے۔ بھٹے ہوئے دل میں جس خدا کا کھٹکا لگا ہوا ہو اور نہ مانتے ہوئے بھی جس کا احساس دلوں میں گھر کر جائے بھلا اس کے وجود ہونے میں کوئی تردد یا شک ہو سکتا ہے ؟[۱۱] اسی لیے تو نطشے جس نے اپنی کتاب (Thus Spake Zardusthra) (نغمہ زردشت) میں خدا کی موت کا اعلان کر دیا تھا اور جس کے نزدیک الحاد ایک پُر لُطف چیز تھی۔ داخلی بے قراری کا شکار ہو گیا تھا محض اس لیے کہ وہ مُلحد ہوتے بھی خدا پرست تھا۔ منکرین حق کا اس طرح کا ذہنی تذبذب بھی خدا کے وجود کا گویا مظہر ہوتا ہے۔ جگرؔ نے اسی لیے بڑے طمطراق اور طنزیہ انداز میں مُلحدین اور مجازیوں کو للکارا ہے۔

مجازی سے جگرؔ کہہ دو ارے وہ عقل کے دشمن مقر ہو یا کوئی منکر خدا یوں بھی ہے اور یوں بھی

وجود حق کے بارے میں مذبذب ذہنیت کا ردّ عمل سوائے بے قراری کے اور کچھ نہیں ہو سکتا اور یہی بے قراری بالآخر یہ اقرار کرنے پر آدمی کو مجبور کر دیتی ہے کہ "خدا ہے" گویا یہ خدائی عظمت و جبروت کی مہتم بالشان نشانی ہے، جس کے آگے وہ سجدہ ریز ہو جاتا ہے اور اس کی یہ سجدہ ریزی خدا کے اقرار کا عملی نمونہ ہوتی ہے۔ احسان دانش نے اسی نکتے کو ذیل کے شعر میں پیش کیا ہے۔

خدا وہ ہے کہ جس کی عظمت و جبروت کے آگے خود انساں سجدہ کرنے کیلئے مجبور ہو جائے

مندرجہ بالا فلسفیانہ نظریات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عقلیت کے موئد فلاسفہ بھی کنہ خداوندی کی عقدہ کشائی میں بر خلاف عقل 'لاادریت یا عقل منفی پر تکیہ کرتے ہیں۔ عقل کی درماندگی کی اس سے بڑھ کر بھی کوئی مثال ہو سکتی ہے ؟ شاید یہی وجہ ہے کہ حکماء کو بھی بالآخر یہ کہنا پڑا کہ "خدا کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔" اور ان کا یہ کہنا ہی خدا کی بہترین تعریف ہے۔

فلاسفۂ قدیم نے وحدت خداوندی میں ریاضیات سے بھی استنباط کیا ہے۔ چنانچہ فیثاغورث اور کاسینس نے کائنات کی عددی تشریح کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ "جس طرح تمام اعداد "ایک" یعنی وحدت سے نکلے ہیں اسی طرح تمام کائنات کی اصل بھی وحدت ہے اور یہی وحدت "خدائے واحد" ہے۔ حضرت امجدؔ نے اپنی حمدیہ رباعی میں اس نکتہ کی وضاحت کی ہے۔

ذرّے ذرّے میں ہے خدائی دیکھو ہر بت میں ہے شانِ کبریائی دیکھو
اعداد تمام مختلف ہیں باہم ہر ایک میں ہے مگر اکائی دیکھو

اس رباعی کی شرح خود حضرت امجدؔ نے کی ہے۔

"۲ مجموعہ ہے 1+1 کا اور ۳ مجموعہ ہے۔ 1+1+1 کا وقس علیٰ ہذا۔ اکائی ہر عدد میں موجود ہے اور (۱) خود عدد نہیں ہے کیونکہ عدد حاشیتین کے مجموعے کو کہتے ہیں۔ جیسے (۲) اس کا حاشیہ (۱) ہے اور دوسرا (۳)۔ (۱) اور (۳) کا مجموعہ (۴) اور چار کا نصف (۲) ہوتا ہے۔ فافہم"

جس طرح ایک ہر عدد میں موجود ہے اسی طرح خدا (جو واحد ہے) ہر ذرّے میں موجود ہے۔
آیۂ کریمہ "وهو معكم اينما كنتم (حدید : ۴) میں بھی یہی مطلب پوشیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی تم ہو۔ غرضیکہ امجد کی رباعی وحدۃ الوجودی نظریے کی مکمل عکاس ہے۔ علمائے ظاہر البتہ واحد حقیقی کو واحد عددی کی طرح نہیں جانتے چنانچہ میر عبدالواحد بلگرامی رقم طراز ہیں:

"توحید کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ واحد حقیقی ہے، وہ واحد عددی نہیں ہے کیونکہ واحد عددی قابلِ تجزی و تبعیض ہے اور واحد حقیقی تجزی اور تبعیض سے مبرّا اور منزّہ ہے۔ واحد عددی کی نسبت جملہ اعداد سے ہوتی ہے۔ مثلاً نصف الاثنین ثلث الثلث اور ربع الاربع وغیرہ جس عدد کو فرض کرتے ہیں وہ واحد عددی کا ایک جز ہوتا ہے یعنی اکائیوں میں سے اکائی۔ اس لیے اکائی کی نسبت جملہ اعداد سے ہوتی ہے اور واحد حقیقی کو اعداد سے کسی قسم کی نسبت نہیں ہوتی۔ یہ بھی ہے کہ واحد عددی تمام اعداد میں شامل ہوتا ہے اس کے برعکس واحد حقیقی اس قسم کی نسبتوں سے منزّہ اور پاک ہے۔"

دکن کے قدیم شاعر مختار کے یہاں اسی خیال کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔

عدد کا احد اس کی حد کا نہیں — احد ہے ولے دو عدد کا نہیں
عدد ہو واحد سب اسی کا ہے نور — ولے دو عدد میں ہوا ہے ظہور

مندرجہ بالا دونوں مثالوں میں ریاضیاتی نقطۂ نظر سے کنہ خداوندی کی بحث کی گئی ہے لیکن دونوں، خیالات میں فرق نظر آتا ہے۔ اول الذکر شاعر امجد نے اللہ کی وحدت کو واحد عددی کے مشابہ مانا ہے۔ یہ تمثیل صوفیوں کے وحدۃ الوجودی نظریہ سے میل کھاتی ہے جس میں "ہمہ اوست" پر زور دیا جاتا ہے۔ وحدۃ الوجودی کے قائلین خالق اور مخلوق کا جوہر ایک مانتے ہیں اور عبد و معبود میں قطرہ و دریا کی سی نسبت تسلیم کرتے ہیں۔ یہاں حضرت امجد نے ریاضیاتی اصول سے استنباط کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تمام اعداد باہم مختلف ہوتے ہیں ان میں "ایک" موجود ہے اسی طرح اعیان ثابتہ اور خارجہ بھی وحدت ہی کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ کثرت، وحدت ہی کی تفصیل ہے اور وحدت، کثرت کا اجمال۔ خارج اگر اعیان حق ہیں تو باطن وحدت حق۔ لیکن اس عقیدے یا نظریے کی رو سے "حلول" و "اتحاد" لازم آتا ہے۔ ذات حق میں تغیّر و تبدّل کا گمان ہوتا ہے اور واحد حقیقی و مظہر، قابلِ تقسیم و تجزیہ قرار پاتا ہے۔ اس طرح کا عقیدہ صریحاً "شرک فی الوجود" کے زمرے میں آتا ہے۔ لہٰذا اس خیال کے برعکس مختار نے وجود باری کے لیے ریاضیات ہی سے ایک الگ انداز میں استنباط کیا ہے۔ ماہیات (حقائق کونیہ) یا مخلوق، چونکہ "نص قطعی" سے غیر ذات حق تسلیم کی گئی ہیں۔ "افغير الله تتقون" (نحل : ۵۲) میں اس کی صراحت کی گئی ہے کہ ذات حق اور ذات حق قطعی طور پر من حیث الذوات ایک دوسرے کے غیر ہیں۔ ذوات خلق اعدام اضافیہ ہیں ان میں دائمیت ہے نہ استقلال۔ حدوث ان کا مقدر ہے۔ برخلاف اس کے حق تعالیٰ بالذات موجود ہے وہ

ابدالآباد' قائم ودائم اور الحیّ القیوم ہے۔ اس لیے واحد عددی (جس کا ذاتی وجود نہیں ہے) کی طرح واحد حقیقی نہیں ہو سکتا۔ اس کی وحدت مطلقہ' قیاسی عدد میں مقید نہیں ہو سکتی کیونکہ "کان اللہ بکل شئ محیطا" اللہ تعالیٰ ہر شئے پر محیط ہے۔ پس جو محیط مطلق ہو وہ کسی کی احاطت میں کیسے آسکتا ہے؟ بس ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ احد اور عدد میں اس کے نور کا ظہور ہے بقول درد۔

خلق میں ہیں' پر جدا سب خلق سے رہتے ہیں ہم　　تال کی گنتی سے باہر جس طرح روپک میں سم

موسیقی کی اصطلاح میں "روپک" ایک تال کا نام ہے۔ یوں تو تمام تالوں میں "سم" پر ضرب ہے لیکن روپک ہی ایسا تال ہے جس میں سم ہونے کے باوجود گنتی میں شمار نہیں ہوتا۔ اسی طرح ذات الٰہ تمام نسبتوں سے پاک ہے' وہ چونکہ لایتجزی ولا یتبعض ہے یعنی اس کے اجزا اور ٹکڑے نہیں ہو سکتے اس لیے ہندسی واحد سے اس کی کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔

طبیعیاتی بنیاد پر بھی بعض فلاسفہ نے خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یونانی فلسفی ارسطو کی تقلید میں ابن مسکویہ (م ۱۰۳۰ء) نے "محرک اولیٰ" یا "علت العلل" کا نظریہ پیش کیا تھا جس میں یہ ثابت کیا گیا کہ کائنات کی تمام چیزیں متحرک اور تغیر پذیر ہیں۔ لہٰذا ان کا ایک محرک اولیٰ بھی ہے جو غیر متحرک اور تغیر سے مبرّا ہے۔ یہی خدا ہے۔ ہمارے شعراء نے اسی خیال کو اپنے حمدیہ اشعار میں مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ مثلاً میر درد اس محرک اولیٰ کی ثناخوانی کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

تحریک ہے یہ اس ید قدرت کی ورنہ کب　　بے دست و پا صبا سے کوئی پات ہل سکے

یہاں اشارہ "لاتتحرک ذرۃ الاّ باذن اللہ" (کوئی ذرہ بھی حکم خداوندی کے بغیر حرکت نہیں کرتا۔) کی طرف ہے۔ غالب کے اسی قبیل کے اس شعر میں بھی دیکھئے کیا تیور ہیں۔

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے　　پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

مولوی اسماعیل میرٹھی نے تو محرک اولیٰ خدا کی ذات کے لیے "پوشیدہ کمانی" کا استعارہ استعمال کیا ہے۔

جل رہی ہے جس سے جسمانی مشین　　کوئی پوشیدہ کمانی اور ہے

شاطر مدراسی (م ۱۹۴۳ء) کی نظم "اعجاز عشق" کا ایک شعر بھی اسی قبیل کا اور معنی و مفہوم کا حامل ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی (۲۸) نے ان کے کلام میں سے یہ شعر منتخب فرمایا تھا۔ علامہ اقبال کے ایک خط مرقومہ ۱۶ مارچ ۱۹۰۵ء بنام شاطر مدراسی سے بھی پتہ چلتا ہے کہ حالی کے اس انتخاب کی انہوں نے توثیق کی تھی۔

بے محل اٹھتا نہیں ہے ایک بھی تیرا قدم　　کوئی ہے تجھ پر سوار اے ابلق لیل و نہار

(شاطر مدراسی)

سرو چمن ہو یا صحرائی اشجار 'بیل بوٹے ہوں یا خس و خاشاک اور گھاس 'سبزے ہوں یا پودے 'ان کا لہلہانا جھومنا اور پتّوں کا ہلنا یہ ساری حرکات بے دست و پا صبا کے بس کا کام نہیں۔ اس کی کیا بساط کہ معمولی برگ سبز ہی کو ہلا دے ؟ وہ محرک ہستی تو کوئی اور ہے جسے عرف عام میں خدا کہا جاتا ہے۔ جس کا ذوق تخلیق لفظ "کُن" سے ذرّوں میں چمک دمک پیدا کر دیتا ہے۔ آفتاب میں تمازت اور چاند کی روشنی میں خنکی دیتا ہے۔ کائنات کی باقاعدہ مسلسل حرکت (Cosmic Rhytem) بھی اسی کی کار فرمائی کا نتیجہ ہے۔ کائنات سے ہٹ کر اگر ہم خود اپنے اندر جھانکیں تو یہاں بھی ہمیں اللہ کی نشانیاں دکھائی دیں گی۔ ہماری "جسمانی مشین" اور اس کے دیگر کل پُرزوں میں جو حرکت ہے وہ کسی "پوشیدہ کمانی" ہی کا نتیجہ ہے اور پوشیدہ کمانی ہی وہ ذاتِ برحق ہے جسے ہم اللہ کہتے ہیں۔ قرآن حکیم میں اللہ رب العزت نے نظام کائنات کی ترتیب و تناسب ہی سے اپنے وجود پر استدلال کیا ہے۔ کائنات کی ہر چیز "آیات اللہ" کے زمرے میں آتی ہے جو اللہ کے وجود پر شہادت دے رہی ہے۔ گردشِ لیل و نہار ہواؤں کی رفتار 'طلوع و غروب سیارگان چرخ لاحد و کنار 'زمین و آسمان کے حادثات 'روئیدگیِ نباتات اور خود انسان کی اپنی ذات اس بات کی شاہد ہیں کہ ان کا چلانے والا کوئی ہے۔ میر حسن نے قرآن کے اسی استدلال کو اپنے حمدیہ اشعار میں پیش کیا ہے ؎

کوئی باقی ہے بے شک محفلِ زیبائے عالم کا ۔ نہ ہو یوں منتظم مجلس نہ جب تک مجلس آرا ہو

محفل زیبائے عالم کا یہ منتظم آپ اپنی ذات میں اتنا زبردست مدبّر ہے کہ منظم طریقے سے سجائی ہوئی اس کی مجلس کائنات میں ایک ادنیٰ سی تبدیلی لانا ممکن ہی نہیں محال ہے۔ کائنات کے ہر گوشے میں اس کی انتظامی صلاحیتوں کا نور جلوہ گر ہے جسے دیکھ کر انسان محو حیرت ہے 'تعقل کے قدم جہاں لڑکھڑا جاتے ہیں اور تحیّر و درماندگی کے سوا آدمی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا لیکن وجدان کی برانگیختگی اور شعور کی بیداری آدمی کو یہ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ کارگاہِ دنیا کا ایک منتظم اعلیٰ ہے جو دانا و بینا اور حکیم و خبیر ہے۔

اس منتظم اعلیٰ کی ذات کے مطلق اور مضاف ہونے کی بحث بھی فلسفیوں نے کی ہے۔ ذاتِ الٰہ کے ساتھ صفات کی اضافتوں کا مسئلہ اسلام کے مابعد الطبیعیاتی فلسفے میں نہایت پیچیدہ اور نزاعی رہا ہے اسی نزاع سے اسلام میں معتزلہ اور اشاعرہ کے فرقے وجود میں آئے۔ اعتزال دراصل ایرانی تحریک تھی' ابوحذیفہ واصل بن عطاء (م ۱۳۱ھ) اس فرقے کا بانی تھا' جس نے اہل سنت والجماعت کی مخالفت کر کے اسلام میں کچھ نئے عقائد خلط ملط کرنے کی کوشش کی تھی۔ اعتزال کے ماننے والے معتزلہ کہلائے۔ انہوں نے دقیق جدلیات کے ذریعہ خدا کی وحدت کا یہ تصور قائم کیا کہ خدا کی صفات اس کی ذات میں موجود ہیں یعنی اس کی ذات ہی ذات بھی اور صفات بھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ خدا صفات کی اضافتوں سے مبرا ہے لیکن اشاعرہ کی تحریک کے سربراہ اول الاشعری نے اسی جدلیاتی طریقے کو سدِ الہام ربانی کی حمایت میں استعمال کیا۔ اشاعرہ خدا کی ذات کو مع صفات تسلیم کرتے ہیں۔ خدا کی یہ صفات ذاتی اور

فعلی ہونے کے علاوہ غیر مخلوق ہیں اس لئے فنا نہیں ہو سکتیں۔ دوسرے معنی میں خدا کی ذات صفات سے متّصف ہے۔ اہل سنت والجماعت کے بھی یہی عقائد ہیں۔ دردؔ نے ذیل کے شعر میں اسی خیال کو پیش کیا ہے:

مطلق بھی نہیں دردؔ! اضافت سے مبرا   عہدے سے تقید کے کوئی کیونکہ بر آوے

جب خدائے واحد جو محیط و مطلق ہونے کے باوجود صفاتی اضافتوں سے مبّرا نہیں ہے تو انسان کی کیا بساط کہ عہدۂ تقید سے باہر آجائے۔ یعنی پابندیوں سے نجات حاصل کرلے۔ تقید گاہ امکاں میں یہ ممکن نہیں ہے۔

برگساں کے نظریۂ استدام یا فلسفۂ زماں میں بھی طبعی نقطۂ نظر سے ذات الٰہ کی حت کی گئی ہے۔ برگساں کا یہ نظریہ مشہور حدیث "لاتسبوا الدھر فان الدھر ھواللہ" پر استوار ہے۔ علامہ اقبالؔ نے اسی نظریہ کو قرآن کے اختلاف لیل و نہار سے ملا کر پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک چونکہ استدام میں تغیّر ہے لیکن تواتر نہیں شدّت ہے لیکن وسعت نہیں اس لیے اس کی مدّت سے ایسے خدا کا تصور کیا جاسکتا ہے جو مطلق بھی ہے اور متغیّر بھی۔ اگر اس تغیّر سے تواتر خارج کر دیا جائے تو ہم خدا کا ایسا تصور قائم کر سکتے ہیں جو حیّ و قیّوم اور اپنی ذات میں مطلق بھی ہے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایسے نظریہ زماں پر زور دیا جو ان کے تصور اللہ کے لیے اساس بن جائے۔ اقبالؔ کے نزدیک زمان خالص ہی زمان الٰہیہ ہے۔ یہی وہ ذات ہے جس کے وجود میں وسعت نہیں شدّت ہے۔ یہی وہ ذات ہے جو Transcendental ہے نہ Immaneivt یہی تخلیقی قوت بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> "اس کی تخلیقی فعالیت کے ممکنات جو اس کے اندرون وجود میں مضمر ہیں لامحدود ہیں اور یہ کائنات جیسا کہ ہمیں علم ہوتا ہے اس کا جزوی مظہر۔ حاصل کلام یہ کہ ذات الٰہیہ کی لامتناہیت اس کی اندرونی اور توسیع میں ہے۔ امتداد اور پنہائی میں نہیں۔ وہ ایک سلسلۂ لامتناہیہ پر تو ضرور مشتمل ہے لیکن جائے خود یہ سلسلہ نہیں۔

زمانے کی اس قوت کی وضاحت اقبالؔ نے اپنی ایک نظم "نوائے وقت" میں کی ہے۔ وقت انسان کو خطاب کرتا ہے کہ "تو اگر مجھے دیکھنے کی کوشش کرے گا تو تجھے کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ درآنحالیکہ میں تیری جان ہوں ------ میں فنا کے گھاٹ بھی اتارتا ہوں اور حیات جاوداں بھی عطا کرتا ہوں۔ قوموں کا عروج و زوال مجھ سے ہے۔ حیات و کائنات کی ساری ہنگامہ آرائیاں میرے ایک اشارے سے وقوع پذیر ہو جاتی ہیں۔" ایسی ہی ایک نظم "زمانہ" میں اقبالؔ وقت کی کرشمہ سازی بیان کرتے ہیں۔ وقت کہتا ہے:

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ
ہر ایک سے آشنا ہوں لیکن جدا جدا رسم و راہ میری
کسی کا راکب کسی کا مرکب کسی کو عبرت کا تازیانہ

اقبال نے زمانہ کے ذریعہ ایک ایسی ہستی کا اثبات پیش کیا ہے جو فی الواقع ذات الٰہ ہے۔ اس کے متعلق اقبال رقم طراز ہیں۔

ایں و آں پیداست از رفتار وقت ‏ ‏ زندگی سر بست از اسرار وقت
اصل وقت از گردش خورشید نیست ‏ ‏ وقت جاوید است و، خود جاوید نیست
عیش و غم عاشور وہم عید است وقت ‏ ‏ سر تاب ماہ و خورشید است وقت
زندگی از دہر و دہر از زندگی است ‏ ‏ لاتسبوالدھر' فرمان نبیؐ است

وقت اقبال کے نزدیک اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے۔

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے ‏ ‏ صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ اِلاّ اللہ

اقبال کے یہاں "وقت" کو خدا سمجھنے کا شعور غالباً "لاتسبوالدھر" والی حدیث اور برگساں کے نظریہ سے پیدا ہوا ہے۔ لیکن "تشکیل جدید اسلامیہ" کے بعض مباحث اور اقبال کے چند اشعار اس بات کی بھی گواہی دیتے ہیں کہ ان کا عقیدہ "اس معاملے" میں متزلزل رہا تھا۔ چنانچہ ایک جگہ اقبال کہتے ہیں:

"ہمیں کوئی ایسا عضو عطا نہیں ہوا جو زمانے کا ادراک کرے --- یہ کیسے ممکن ہے کہ زمان جوہری کا اطلاق ذاتِ الٰہیہ پر کیا جائے ہم اس کا تصور ایک ایسی زندگی کی شکل میں کریں جو ابھی معرض تکوین میں ہے' جیسا کہ پروفیسر الیگزینڈر نے زمان و مکان و ذاتِ خداوندی" (Time Space, Deity) کے متعلق اپنے خطبات میں کہا ہے"

اس لئے اقبال نے زمان جوہری کے بالمقابل "زمان خالص" کو ترجیح دی تا کہ "وقت" کو ذات الٰہ کی صورت میں پیش کر سکیں لیکن پھر بھی اقبال کے اعتقاد میں استقلال پیدا نہیں ہوا کیونکہ برگساں اور اقبال نظریۂ استدام اور مذکورہ بالا حدیث (لاتسبوالدھر فان الدھر ھواللہ) دونوں آیت قرآنیہ (القرآن ۴۵۔۲۴) سے ٹکراتے ہیں' قرآن نے لوگوں کے اس خیال کی نفی کی ہے جو اپنی جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے "دہر" کو ہلاک کرنے والا سمجھتے ہیں۔ اسی بنیاد پر اقبال نے جہاں وقت کو لامتناہی ذاتِ الٰہ سے تعبیر کیا ہے وہاں بعض مقامات پر زمانے کی لامتناہیت پر ذات الٰہیہ کو محیط بتایا ہے۔

یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند ‏ ‏ بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ اِلاّ اللہ

اور ۔ نہ ہے زماں نہ مکاں لاالٰہ الّا اللہ

اقبال نے اپنے نظریہ کی رو سے جہاں زمانے کو "خلاّق" کہا ہے وہاں اللہ تعالیٰ کو زمانے کا خالق بھی کہا ہے۔ بہر کیف زمانے کے تعلق سے اقبال کی نظموں میں حمدیہ آہنگ کی ایک مدھم سی لے بھی سنائی دیتی ہے۔

وامق جونپوری (و ۱۹۰۹ء) کے یہاں بھی "وقت" کے تصور کو خدا کی ذات سے جوڑا گیا ہے لیکن برگساں کے نظریۂ استدام کا یہاں گذر نہیں۔ انہوں نے اپنے اشعار میں "وقت" کا ایسا تصور پیش کیا ہے جس کی نہ کوئی ابتداء ہے نا انتہا۔ وہ ایک ایسی وحدت ہے جس میں تغیّر و تبدّل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ کمی بیشی کا کوئی امکان ہے۔ یہ "دھریت" اگرچہ "الدھر ھواللہ" کی توثیق کرتی ہے لیکن دوسری جانب وامق کی نظم کا تیسرا مصرع قرآن کے تصور زماں سے ٹکراتا ہے پھر بھی آخری مصرع میں تشکیک کا پہلو نمایاں کر کے شاعر نے اللہ کی کنہ میں اپنے عجز کا اعتراف کیا ہے اور شرک سے دامن بھی بچایا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

ابتداء کوئی نہ اس کی نہ کوئی اس کا عدم
ایک وحدت جو کبھی بیش نہ کم
اس کا خالق نہیں کوئی نہ کوئی اس سے بڑا
یہی شاید ہے خدا -------

"وقت" اسمٰعیل کانٹ نے اخلاقی بنیادوں پر خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ "اخلاق" کی تعریف کرتے ہوئے کانٹ کہتا ہے۔

"اپنے ہر کام میں انسانیت کی قدر و منزلت کا خود اپنی ذات میں اور دوسرے کی ذات میں احترام کرنا اور انسان کی ذات کو ہمیشہ ایک مقصد سمجھنا کبھی محض ذریعے کے طور پر استعمال نہ کرنا (اخلاق) ہے"

گویا 'اخلاق' 'نیک اعمال کا دوسرا نام ہے' جس کے ذریعہ ضروری ہے کہ آدمی کو راحت نصیب ہو۔ وہ کہتا ہے کہ "دنیا کا نظام ایسا ہونا چاہئے کہ نیکی کرنے والا نہ صرف راحت کا مستحق سمجھا جائے بلکہ اسے راحت میسر بھی آئے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس دنیا میں نیک آدمی کو اخلاقی عمل کے ذریعہ سے راحت نصیب نہیں ہوتی پس اس کے حصول کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان اس زمانی زندگی کے علاوہ عالم معقولات میں ابدی زندگی بسر کرے "لیکن شک" اسے یہ پوچھنے پر مجبور کرتا ہے کہ "اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ابدی زندگی میں نیکی کے ذریعہ سے راحت حاصل ہو گی؟ اگر وہاں بھی عالم طبیعی کا قانون کارفرما ہو تو نیکوں کو راحت ہونا محال ہے۔" اس لئے کانٹ کہتا ہے کہ "نظام طبیعی کو نظام اخلاقی کے ماتحت تصور کرنے کے لئے ایک قادر مطلق ہستی کو تسلیم کرنا ضروری ہے جس نے ان دونوں کو پیدا کیا ہے اور ان دونوں میں یہ تعلق اور

ترتیب قائم کی ہے۔"

اس طرح کانٹ کے نظریہ کے مطابق خیر، صالح، نیک اور اعمال حسنہ کی جزا کے لیے "مالک یوم الدّین" کا تصور ناگزیر ہو جاتا ہے۔ منجانب اللہ بندے پر جو احسانات کیے جاتے ہیں، جو مراعات بخشی جاتی ہیں، جو برکات اور رحمتیں تفویض کی جاتی ہیں ان سب کا استحقاق اسی ضابطۂ اخلاق کے تحت انسان کو مطیع و فرمانبردار بنا دیتا ہے، پس چاہیے کہ بندہ اپنے اندر صالح اخلاق پیدا کر کے اللہ کے احکام کا پابند ہو جائے۔ اگر بندہ ایسا کرتا رہے گا تو ابدی زندگی میں بھی وہ راحت و رحمت سے متمتع ہوتا رہے گا کیونکہ بقول امیر مینائی۔

بارگاہ حق سے ہر طاعت کی ملتی ہے جزا ہے بڑی سرکار، حق رہتا نہیں مزدور کا

اقبال مالک یوم جزا کی بڑائی یوں بیان کرتے ہیں۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری

وہ زبانِ یقین سے بارگاہِ ایزدی میں یوں شکوہ کرتے ہیں۔

ہم بندے! شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے تو خالقِ اعصار و نگارندۂ آفات

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کانٹ کا یہ بھی کہنا ہے کہ اخلاقی بنیادوں پر خدا کے وجود کو حال کرنے کے بعد ہماری فطرت کا یہ تقاضا ہو گا کہ ہم نیک بنیں اور ایسا برتاؤ کریں، جیسے خدا کرتا ہے۔ دوسرے معنی میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ نیک بننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم صفات عالیہ کو اپنی ذات میں پیدا کریں جو اخلاق الٰہیہ ہیں۔ گویا نیک و صالح بشر کے لئے تخلقوا باخلاق اللہ ضروری ہے۔ اس منزل پر پہنچنے کے بعد اس کی آنکھ گویا خدا کی آنکھ، اس کے کان گویا خدا کے کان، اس کے ہاتھ خدا کے ہاتھ اور اس کے پیر خدا کے پیر بن جاتے ہیں۔ (حدیث قدسی) اقبال نے ایسے ہی "بندۂ مولی صفات" کے متعلق کہا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ غالب و کارآفریں، کارکشا، کارساز

لیکن جب تک خاکی و نوری نہاد بندے میں صفات مولی پیدا نہیں ہو میں اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ نہیں بنتا۔

قہّاری و غفّاری، قدّوسی و جبروت یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں

عناصر الٰہیہ اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے اور ذات الٰہ سے قرب و معیت حاصل کرنے کے لیے صوفیائے کرام نے "تنزلات ستہ" کا نظریہ پیش کیا ہے۔ جس کی رو سے سالک (بندہ) اگر تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب، عبادات بدنی اور اخلاق حسنہ میں کمال پیدا کرلے تو وہ بشریت سے منزہ ہو جاتا ہے، اس میں ایک خاص استعداد پیدا ہو جاتی ہے اور روح الٰہی اس میں حلول کر جاتی ہے۔ حسین بن منصور حلاّج (م ۹۲۲ء) نے اسی عقیدے کے تحت "اَناَالحق" کا نعرہ بلند کیا تھا لیکن علمائے دین مبین کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ۔

العبد عبد وان ترقیٰ والرب رب وان تنزل

یعنی بندہ' بندہ ہے گو وہ لاکھ ترقی کرلے اور رب' رب ہے گو وہ کتنا ہی نزول کیوں نہ کرے۔ وجود ذات (رب) سے بندے کی اس طرح کی علیٰحدگی اسے "تخلفوا باخلاق الله" کا عامل بنے پر مجبور کرتی ہے۔ یوں بھی انسان کی روحانی اور اخلاقی زندگی کا مقتضیٰ ہی یہ ہے کہ وہ ذات واجب تعالیٰ سے قرب حاصل کرے۔ لہٰذا چاہئے کہ بندہ اس کی صفات عالیہ کو اپنی ذات میں پیدا کرنے کی سعی کرتا رہے اور اخلاق الٰہیہ پیدا کرکے اپنی زندگی بامراد بنالے۔

منطقیاتی زاویہ' نظر سے بھی فلسفیوں نے دلائل کی جانچ پرکھ کرکے خدا کے وجود کو ثابت کیا ہے۔ چنانچہ کتب السیر میں امام فخرالدین رازیؒ کے متعلق ایک واقعہ ملتا ہے کہ امام رازیؒ کا کسی گاؤں میں ایک بوڑھیا کے پاس سے گذر ہوا۔ وہ چرخہ اپنے سامنے رکھ کر کسی خیال میں غرق تھی۔ امام رازیؒ کے پوچھنے پر وہ بوڑھیا چونک پڑی اور کہنے لگی کہ میں غور کررہی ہوں کہ آخر میرا چرخہ کیوں نہیں چلتا۔ امام رازیؒ نے اپنے ہاتھوں چرخہ گھمایا اور چرخہ چلنے لگا۔ اتنے میں بوڑھیا کو شرارت سوجھی اور اس نے چپکے سے چرخے کو دوسری سمت گھمایا جس کی وجہ سے چرخہ رک گیا۔ امام رازیؒ نے جو طاقت لگائی تو چرخہ ٹوٹ گیا۔ انھیں بڑا افسوس ہوا لیکن بوڑھیا کہہ اٹھی کہ چرخہ ٹوٹ گیا تو بن جائے گا' لیکن اس چرخے نے ایک پیچیدہ مسئلہ حل کردیا ہے کہ خدا ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ اگر اس کائنات کے چرخ کو دو خدا چلاتے تو دونوں کی کشاکش میں یہ چرخہ ٹوٹ جاتا --------

قرآن مجید کی حسب ذیل آیت میں اس نظریہ کی وضاحت اس طرح ملتی ہے:

"وما کان معه من الله اذالذهب کلّ الهٰ بما خلق ولعلا بعضهم علیٰ بعض"

"اور اس (اللہ تعالیٰ) کے ساتھ کوئی اور معبود نہیں ورنہ اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی مخلوق کو ساتھ لے لیتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کرتے۔"

اردو شعراء نے خدا کے متعلق اس منطقیانہ نقطے کی وضاحت اپنے اشعار میں نہایت عمدگی سے کی ہے۔ اسماعیل میرٹھی کا یہ شعر بطور مثال پیش کیا جاتا ہے ؂

سخت فتنہ جہاں میں اٹھتا کوئی تجھ سا ترے سوا نہ ہوا

اور غالب کہتے ہیں ؂

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو شعراء نے خدا کے متعلق تمام فلسفیانہ استدلال و نظریات میں "ایمان" کا عنصر ملاکر "فلسفہ' الٰہ" کو قرآنی تصورالٰہ سے جوڑدیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے ہمہ جہتی پہلو نکال کر حمدیہ شاعری کو چمکایا ہے۔

پروفیسر محمد اقبال جاوید

حمد، عبدِ شکور کا فخر اور عبدِ مجبور کا سہارا

جملہ جمال و کمال کسی ایک ذات میں سمٹے ہوئے ہوں اور وہ ذات ان کے اظہار پر مکمل اختیار بھی رکھتی ہو اور کوئی اس خوبی اور صلاحیت کی تعریف کرے تو اس کا یہ فعل حمد کہلائے گا۔ گویا کسی کی اختیاری خوبی پر زبانی تعریف کا نام حمد ہے۔ مدح صرف خوبی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا اختیاری اور غیر اختیاری ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ وہ خوبی کسی سے ملی ہو شکر، متعین نعمت کے ساتھ وابستہ ہے۔

شکر صرف متعدی صفتوں پر ہوتا ہے جبکہ حمد ہر صفت پر کی جاتی ہے۔ لازم پر بھی اور متعدی پر بھی۔ فرمان نبوی ﷺ ہے کہ حمد، شکر کی اصل ہے۔ حمد، ہر نوع کی تعریف کو محیط ہے۔ حضرت علیؓ کے فرمان کے مطابق الحمد للہ وہ پاکیزہ کلمہ ہے کہ اللہ نے خود اسے اپنے لئے پسند فرمایا ہے۔ جس نے خدا کی حمد نہ کی وہ انتہائی ناشکرا ہے۔ ہر شاکر و ممنون کا کلمہ الحمد للہ ہے اور شکر اسی سے ابھرتا، نکھرتا اور بال و پر لیتا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی سورۂ فاتحہ کے ان ابتدائی کلمات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

> "حمد کا لفظ شکر کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے۔ شکر کا لفظ کسی کی صرف انہی خوبیوں اور انہی کمالات کے اعتراف کے موقع پر بولا جاتا ہے جن کا فیض آدمی کو خود پہنچ رہا ہو۔ برعکس اس کے حمد ہر قسم کی خوبیوں اور ہر قسم کے کمالات کے اعتراف کے لئے عام ہے۔ خواہ اس کا کوئی فیض خود حمد کرنے والے کی ذات کو پہنچ رہا ہو یا نہ پہنچ رہا ہو۔ تاہم شکر کا مفہوم اس لفظ کا جزو غالب ہے۔ اس وجہ سے اس کے ترجمے کا پورا پورا حق ادا کرنے کے لیے یا تو تعریف کے لفظ کے ساتھ شکر کا لفظ بھی لانا ہوگا یا پھر شکر ہی کے لفظ سے اس کو تعبیر کرنا زیادہ مناسب رہے گا۔ تاکہ یہ سورہ جس احساس شکر اور جس جذبۂ سپاس کی تعبیر ہے اس کا پورا پورا اظہار ہو سکے۔ یہ اظہار صرف تعریف کے لفظ سے اچھی طرح نہیں ہوتا۔ آدمی تعریف کسی بھی اچھی چیز کی کر سکتا ہے اگرچہ اس کی اپنی ذات سے اس کا کوئی دور کا بھی واسطہ نہ ہو لیکن یہ سورہ ہماری فطرت کے جس جوش کا مظہر ہے، وہ جوش

ابھر اہی ہے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت رحمانیت کے ان مشاہدات سے 'جن کا تعلق براہ راست ہماری ذات سے ہے اگر یہ اچھی طرح واضح نہ ہو سکے تو اس سورہ کی جو اصل روح ہے وہ واضح نہ ہو سکے گی۔ شکر کے لفظ سے سورہ کا یہ پہلو نمایاں ہوتا ہے"

اللہ تعالیٰ ایک مقتدر اور با اختیار مدبّر ہے۔ وہ ذات بے نیاز ہے۔ اسے اپنی خصوصیات اُلوہیت کے اظہار کے لئے کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی خوبیوں والا ہے 'اور اس کی مخلوق بھی۔ مخلوق کو خوبیاں عطا کرنے والا وہی ہے۔ اس کی ذات 'صفات 'حقوق اور اختیارات میں کوئی شریک نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تمام خوبیاں ازلی اور ابدی ہیں جبکہ مخلوق کا ہر حسن مستعار و ناپائیدار ہے اور اسے دوام و استقرار حاصل نہیں ہے۔ صاحب کمال اور صاحب جمال تو بہت ہیں مگر خالق کمال و جمال ایک اور صرف ایک ہے یہی وجہ ہے کہ ہر ثناء اسی کو سزاوار ہے اور ہر راہ اسی کی چاہ کے دروازے تک جاتی ہے۔

فراخیٔ زمیں وہی' فراز آسماں وہی
ہر ایک سمت جلوہ گر' ہر ایک سُو نہاں وہی
خرد کا رہنما وہی' جنوں کا پاسباں وہی
خفی وہی' جلی وہی' نہاں وہی عیاں وہی
تمام کائنات اس کی ذات میں اسیر ہے
صدف وہی 'گہر وہی' محیط بے کراں وہی
وہ ابتدائے فکر بھی' وہ انتہائے فہم بھی
جو آ سکے نہ ذہن میں گمان بے گماں وہی
چمن چمن' روش روش اسی کا رنگ اسی کی بو
وہی ہے گل' وہی کلی' نگار گلستاں وہی

مالک دو جہاں کا اگر کوئی ذاتی نام ہو سکتا ہے تو وہ اللہ ہی ہو سکتا ہے 'کیونکہ اس کی وسعت و رفعت کا نہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے نہ اس کا احاطہ کیا جا سکتا ہے اور نہ اسے کماحقہٗ سمجھا جا سکتا ہے۔ اسے تو بے بس ہو کر بس مانا ہی جا سکتا ہے۔ جاننے کی سعی کی جائے گی تو سوائے کھو جانے کے کچھ نہ ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کو کسی صفاتی نام سے پکارا جائے تو وقتی طور پر اس کی ذات معنویت کے اس دائرے میں محدود ہو جائے گی 'چونکہ اس کی صفات بے حد و حساب ہیں اس لئے اللہ ہی وہ نام ہے جس میں عطا و بخشش کی وہ تمام انتہائیں آجاتی ہیں جن کی نوازشات دیگراں سے موجودات عالم کی ہر شے بقدر ظرف فیضیاب ہو رہی ہے۔

انسانی تعریف میں افراط و تفریط سے منع کیا گیا ہے۔ یہاں مبالغے سے احتراز ضروری ہے کیونکہ

نقص، غلطی اور لغزش لازمہ بشریت ہے۔ منہ پر تعریف کرنا بھی پسندیدہ نہیں ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ممدوح میں وہ خوبی بدرجۂ اتم موجود نہ ہو۔ حمد میں تیقّن اور واقفیت کا کمال پایا جاتا ہے۔ یہاں موصوف کی کسی صفت میں نہ نقص کا کوئی شائبہ ہے نہ ترمیم کی کوئی ضرورت اور نہ اضافے کی کوئی حاجت' یہی وجہ ہے کہ حمد میں کوئی روک نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی تعریف میں ہر مبالغہ' حسن ہے۔ حق ادا ہی نہیں ہو سکتا۔ نہ سمندروں کے پانی کے سیاہی ہو جانے سے اور نہ درختوں کے قلم بن جانے سے۔ اس ذات بلند و برتر کی تعریف میں رطب اللّساں رہ کر ہم لوگ اپنی ہی شان بڑھاتے رہتے ہیں۔ حضرت اسود بن سریعؓ نے حضورؐ کی خدمت عالیہ میں عرض کیا کہ میں نے کچھ حمدیہ اشعار کہے ہیں اور سنانا چاہتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کو اپنی حمد بہت پسند ہے۔" یہ بات بھی اسی ذات اقدسؐ کی فرمائی ہوئی ہے کہ بہترین ذکر لاالہ الااللہ ہے اور بہترین دعا الحمدللہ ہے۔ دنیا بھر کی نعمتیں ایک طرف اور الحمدللہ کے دو لفظ ایک طرف' برابر بھی نہیں بلکہ سب پر بھاری اور ہر نعمت سے بڑھ کر ہیں۔ چار لفظوں پر مشتمل یہ افضل ذکر صرف توحید کا اظہار ہے اور ان دو لفظوں میں توحید کے ساتھ ساتھ حمد بھی شامل ہے اور حمد شکر بھی ہے اور دعا بھی اور جتنا شکر ہو گا نعمتوں میں اسی قدر اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ جمیل ہے' ہر جمال کا خالق ہے اور ہر جمال اسے پسند ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جملہ خلائق کو اچھائیاں اور خوبیاں ہی ملتی ہیں جبکہ برائیوں کا ذمہ دار ہمارا نفس خطاکار ہے۔ اللہ تعالیٰ کی انہی صفات کا بیان' اسی کی عطا کردہ خوبیوں کا اعتراف اور عملاً اسی کے حضور میں سربسجود ہو جانا' حمد ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ گویا حمد "ثنائے جمیل" ہے' صرف ثنا نہیں کیونکہ ثنا فعل مذموم کی بھی ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حمد صرف اللہ کے لئے ہے کیونکہ وہی حسن و جمال کا مرکز و مآخذ ہے اور حمد' بیان جمال اور تحسین حسن ہے۔ ہماری حمد' اللہ تعالیٰ پر کسی نوع سے کوئی احسان نہیں ہے بلکہ یہ تو اس امر کا ثبوت ہے کہ حامد کی سوچ خالص' نگاہ شفاف اور فکر واضح ہے۔ ہم حمد جالائیں گے تو نعمتوں کی قدر کرنے والے ٹھہریں گے اور ہمارا شمار احسان کا حق احسان سے دینے والوں میں ہو گا اگر ثنا و سپاس سے گریزاں رہیں گے تو احسان فراموش قرار دیئے جائیں گے۔ جس کا نتیجہ بہر کیف اور بہر مقام رسوائی ہے۔ ہر حسن کی تحسین اللہ کو پہنچتی ہے۔ گویا ثنائے جمیل جس قسم کی بھی ہو' جس کے لئے بھی ہو اور جہاں بھی ہو' اس کی مستحق وہی ذات پاک ہے۔ خواہ ثناگو کو اس کا علم ہو یا نہ ہو جو شئے بھی لائق تعریف نظر آتی ہے اسی کا حقیقی مرجع اللہ ہی ہے کہ وہی مصور کائنات ہے۔ تاثر کی جملہ ادائیں اور تجسس کی جملہ رفعتیں' اسی مرکز جمال اور مصدر کمال سے ابھرتی ہیں۔ یہیں سے پرپرواز لیتی ہیں۔ اور یہیں پہنچ کر سمٹ جاتی ہیں۔ اس حسن لایزال نے اظہار ذات کے طور پر اپنی صفات کا عکس کائنات کے ذرّے ذرّے میں رکھ دیا ہے۔ کتنے ہی مناظر ہیں کہ نگاہوں سے لپٹ لپٹ جاتے ہیں۔ کتنے ہی چہرے ہیں کہ انہیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کو جی چاہتا ہے کہ نظر کو آئینہ بننے میں بہر کیف وقت

لگتا ہے۔ کتنی ہی نعمتیں ہیں کہ ہمیں قدم قدم سکون و طمانیت عطا کرتی ہیں۔ خوشبو کی کتنی ہی لپٹیں ہیں کہ مشام جاں کو معطر کرتی چلی جاتی ہیں۔ رنگ کے کتنے ہی آہنگ ہیں کہ نگاہوں کو طراوت بخش رہے ہیں۔ حرف و صوت کے کتنے ہی پیرائے ہیں کہ فردوس گوش بنے رہتے ہیں۔ نقوش و آثار کی کتنی ہی دلآویزیاں ہیں کہ روح کی پہنائیوں میں اترتی چلی جاتی ہیں۔ ذرّوں کی بے مائیگی بھی صحرائی وسعتوں کی آئینہ دار اور قطرے کی بے بضاعتی بھی سمندر کی طرح بیکراں لگتی ہے۔

نہ جانے کب سے مرا دل وجود قطرہ میں   دھڑک رہا ہے کسی بحرِ بیکراں کے لیے

دل کو آگاہی نصیب ہو جائے تو رنگ و نور کی یہ ساری کہکشائیں کسی ایک ہی خالق کا تعارف کراتی اور کسی ایک ہی مصدر کا تصور عطا کرتی ہیں۔ دھوپ سے کسی کو روشنی ملتی ہے کسی کو حرارت 'بات تو آفتاب ہی تک پہنچتی ہے۔

شرر ہو' برق ہو' نظارۂ گل ہو کہ عارض ہو   بہر عنواں حکایت ایک ہی معلوم ہوتی ہے

اس تعارف کا تعریف ہو جانا' اس تصور کا تصویر بن جانا اور اس حسن کا تحسین کے سانچے میں ڈھل جانا بڑے نصیب کی بات ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنائی' یکتائی میں بدل جاتی اور کثرت وحدت لگتی ہے۔ نتیجہ معلوم کہ نعمت بالواسطہ ملے یا بلاواسطہ' زبان الحمدللہ ہی کہتی ہے اور یہی وہ مختصر کلمہ ہے جس سے مخلوق پرستی کی جڑ کٹ جاتی ہے کہ مستحق تعریف ہی مستحق عبادت ہے۔ ہر خمیدگی' ہر آرزو اور ہر طلب کا مرجع اللہ ہی بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے سوا انسانی انکسار کا یہ پندار ہر مقام پر سرکشیدہ نظر آتا ہے۔ الحمدللہ عبودیت کا ایک جامع اظہار اور نعمتوں کا ایک بلیغ اعتراف ہے اور یہ دعویٰ بھی ہے اور دلیل بھی۔ مولانا ظفر علی خاںؒ اسی حقیقت کو کس خوبصورت انداز کے ساتھ لکھ گئے ہیں۔ حق یہ ہے کہ بیان حسن کو حسنِ بیان بھی اسی ذات سے ملتا ہے جو کائنات حسن بھی ہے اور حسن کائنات بھی۔ دیکھئے مولانا کا قلم کس دل آراء انداز کے ساتھ لولوئے لالا بکھیر رہا ہے۔

☆ "اے وہ کہ جس کی یکتائی کا نقارہ اقصائے کائنات میں صبح آفرینش سے بج رہا ہے۔

☆ اے وہ کہ جس کے لئے صد ہزار ازل اور ابد ایک گریزپا لحہ کا غبار نفس ہے۔

☆ اے وہ کہ جس نے انسان کو احسن تقویم کے نورانی سانچے میں ڈھال کر اپنی حکمت بالغہ اور صنعت کاملہ کے کرشمے ارباب نظر کو دکھائے۔

☆ اے وہ کہ نیستی میں سے ہستی اور ہستی میں سے نیستی 'ظلمت میں سے نور' نور میں سے ظلمت' زندگی میں سے موت' موت میں سے زندگی' عزت میں سے ذلت اور ذلت میں سے عزت پیدا کرنا جس کی شان خلاقی کا سرمدی مشغلہ ہے۔

☆ اے وہ کہ جس کی بے پایاں محبت نے اپنے برگزیدہ پیغمبروں کی معرفت انسان ضعیف البنیان

کے قلب تاریک کو اپنی مشیت کی نورانی حقیقتوں سے رہ رہ کر جگمگایا ہے۔

☆ اے وہ کہ جس کی ناخدائی نے نوحؑ کی کشتی کو گرداب بلا سے بچایا۔ ابراہیمؑ کے لیے نار نمرود کو گلزار بنایا۔ موسیٰؑ عمران کو فرعون کے چنگل سے چھڑایا۔ عیسیٰؑ مریم کو ایک جست تیرہ خلاؤں سے چرخ بریں پر پہنچایا۔ محمد ﷺ کی عالم گیریوں کا پرچم کونین میں اڑایا۔

☆ اے وہ کہ ہمارے شہپر اندیشہ کی انتہائی اڑان سے بھی دور لیکن بایں ہمہ ہماری شہ رگ سے بھی نزدیک ہے۔

☆ اے وہ کہ جس نے فالیستجیبولی کی صدائے عام دے کر ہم سے اٹل وعدہ کیا ہے کہ اگر ہم اپنی پیشانی اس کی چوکھٹ پر رکھ دیں گے اور رو رو کر اس سے مرادیں مانگیں گے تو ہماری التجا ٹھکرائی نہ جائے گی۔"

انفس و آفاق میں خالق کائنات کی بین نشانیاں جلوہ گر ہیں۔ حسین ایک ہی ہے جس کا حسن ستاروں میں دمکتا' آفتاب میں چمکتا' پھولوں میں مہکتا' سبزے میں لہکتا' بلبل میں چہکتا اور ہواؤں میں مچلتا ہے اور انسان کی ذات میں یہ حسن سمٹ سمٹ کر سنورتا اور سنور سنور کر نکھرتا ہے۔ بات سوچنے کی ہے کہ خود وہ صانع حقیقی کیا ہو گا اور اس کی بارگاہ ناز کیسی ہو گی۔

محفلیں ماہ و ستارہ کی سجانے والے ہائے کیا چیز ترا عالم تنہائی ہے

اپنی محدود بصارت سے ہم اس بسیط کائنات کا جس قدر بھی احاطہ کرتے ہیں اور اپنی محدود بصیرت سے اس کائنات کے مفہوم و مقصود کو جس حد تک بھی سمجھنے اور پانے کی سعی کرتے ہیں۔ ہماری بے خودی اتنی ہی بڑھتی چلی جاتی اور تحیر اتنا ہی زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ تحیر آفرین بیخودی کی یہ کیفیت 'ایک نوع سے حمد' بھی ہے اور محمود کے وجود کی دلیل بھی۔ ہماری آگہی کا خلا اور ہمارے شعور کی نارسائی خود کہتی ہے کہ خدا ہے۔

تھا حاصل نظارہ فقط ایک تحیر جلوے کو کہے کون کہ اب گم ہے نظر میں

حیرت کا جذبہ 'جائے خود نظارے اور جلوے کی ایک ایسی تعریف ہے جسے لفظوں کا کوئی سا پیرایہ بھی ادا نہیں کر سکتا۔ جس طرح سکوت 'تکلم بلیغ کی حیثیت رکھتا ہے اسی طرح حیرت بھی تحسین جمال کی ایک معنوی ادا ہے۔ یہ نورانی کائنات 'اپنے خالق کے وجود احسان کی ایک نورانی دلیل ہے۔ دیکھنے والی نظر اور قبول کرنے والا دل چاہئے۔ جب یہ بات نصیب ہو جائے گی تو شکر و سپاس روح کی گہرائیوں سے ابھرے گا کیونکہ دینے والے نے جسم کے ساتھ دل بھی دیا ہے اور آنکھ کے ساتھ ذوق دید بھی بخشا ہے۔ انعام و اکرام سے بھی نوازا ہے۔ دعاؤں کا سلیقہ بھی عطا کیا ہے۔ قبولیت کے قرینے بھی بخشے ہیں اور پھر کائنات کی نیرنگیوں اور رعنائیوں میں خود کو جلوہ گر کر کے اسے حسن تخلیق کا ایک تحیر آفرین منظر بنا دیا ہے۔

مکتوم کس کی موج کرم ہے صدف صدف　　　مرقوم کس کا حرف وفا ہے افق افق

مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں:

"اس راہ میں فکر انسانی کی سب سے بڑی گمراہی یہ رہی ہے کہ اس کی نظریں مصنوعات کے جلووں میں محو ہو کر رہ جاتیں۔ آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرتیں۔ وہ پردوں کے نقش و نگار دیکھ کر خود ہو جاتا مگر اس کی جستجو نہ کرتا جس نے اپنے جمال صنعت پر یہ دل آویز پردے ڈال رکھے ہیں۔ دنیا میں مظاہر فطرت کی پرستش کی بنیاد اسی کوتاہ نظری سے پڑی۔ پس الحمد للہ اعتراف ہے کہ کائنات ہستی کا تمام فیضان و جمال خواہ کسی گوشے اور کسی شکل میں ہو، صرف ایک صانع حقیقی کی صفتوں ہی کا ظہور ہے۔ اس لیے حسن و جمال کے لیے جتنی بھی شیفتگی ہو گی خوبی و کمال کے لیے جتنی بھی مدحت طرازی ہو گی بخشش و فیضان کا جتنا بھی اعتراف ہو گا، مصنوع و مخلوق کے لیے نہیں ہو گا، صانع و خالق ہی کے لیے ہو گا۔"

یہ عالم اسباب ہے، یہاں اسباب کے تحت آنے والی ہر بات انسانی تصرف میں ہے، مگر وہ امور جو ان اسباب سے بلند ہیں، وہ صرف مالک اسباب اور خالق اسباب ہی سے مخصوص ہیں۔ ان تک نہ انسانی دسترس ہے اور نہ ان کی تہہ تک انسانی عقل جا سکتی ہے۔ نتیجہ بے بسی، سکوت اور سر تسلیم خم ہی کی صورت میں نکلتا ہے۔

کوئی ان کو سمجھ بھی لے تو پھر سمجھا نہیں سکتا　　　جو اس حد پر پہنچ جاتا ہے وہ خاموش رہتا ہے

انسان زمین کو تیار کر کے اس میں بیج بو سکتا ہے، پانی دے سکتا ہے مگر مٹی کی تاریکیوں سے لالہ و گل ابھار نہیں سکتا۔ انسان ایک حد تک دیکھ سکتا ہے مگر ہر شئے کا احاطہ اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ چونکہ ہر نعمت، ہر خصوصیت اور ہر صلاحیت، ہر حیثیت سے اللہ ہی کی عطا ہے۔ اس لیے صرف اسی کی حمد لازم ہے اور اسی کے روبرو جھکنے میں عزت و شرف ہے۔ کائنات کی ہر شئے، خالق کائنات کے حضور میں اپنے اپنے انداز اور اپنے اپنے پیرائے میں محو ثناء ہے اور انسان چونکہ اللہ تعالیٰ کی بہترین تخلیق ہے اس لیے اس پر واجب ہے کہ اس کی حمد، خلوص و تقدس کی رفعتوں کو چھولے، کیونکہ منعم حقیقی نے اس پر نعمتوں کی انتہا بھی کر دی ہے اور ہر نوع کے اسباب بھی فراہم کر دیے ہیں۔

انسان کے دل میں نیکی کی آرزو جاگتی ہے۔ حق کی طلب ابھرتی ہے اور وہ راہ طلب میں قدم بڑھاتا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ ہی کی توفیق سے ہے جس نے جسم کو روح سے مزین کیا، عقل و شعور کو جذب و جنوں کی منزل دی۔ بینائی کو رعنائی اور گویائی کو برنائی بخشی۔ جس نے شکوک و شبہات کے مقابلے میں یقین کا نور دیا

اور صلاحیت کو صالحیت کا شعور عطا کیا۔ اس دنیائے سود و زیاں میں قدم خود بخود اٹھا نہیں کرتے بلکہ کسی کے کرم سے اٹھائے جاتے ہیں۔ طلب کی ہر سچائی اور جذبے کی ہر رسائی اسی کا فیض ہے۔ یہاں تک کہ لبوں کو الحمدللہ کہنے کی توفیق بھی اسی بارگاہِ بندہ نواز سے ارزانی ہوتی ہے۔

الحمد کا لفظ قرآن پاک میں کم و بیش ۳۸ بار آیا ہے۔ ان تمام مقامات کو ایک نظر دیکھنے سے حمد کی وسعتوں کا پتہ چلتا ہے اور اس امر کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے کہ تحمید و تمجید کہاں کہاں لازم ٹھہرتی ہے۔ انفس و آفاق کی عظمتوں اور رفعتوں پر تدبر کی توفیق عطا ہو اور تدبر، حیرت میں ڈوب جائے تو تحیر کا یہ انداز بھی حمد ہی کی ایک صورت ہے۔ مہد سے لحد تک، مسلمان کی ہر تمنا اور عمل ماثورہ و مسنونہ دعاؤں کی آغوش میں آنکھ کھولتا، استمداد و استعانت سے تقویت پاتا اور شکر و سپاس سے بال و پر لیتا ہے۔ گویا ایک مسلمان کی حیات مستعار کا ہر لمحہ، حمد ہے۔

وہ تمام ایک جلوہ، میں تمام ایک سجدہ   مری بندگی میں حائل نہ جبیں نہ آستانہ

قرآن پاک واضح طور پر حکم دیتا ہے کہ ظالموں کی جڑ کٹ جائے تو سراپا شکر بن جاؤ کہ اللہ ہی ظالموں کو تباہ و برباد کرنے پر قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ "عزیز" ہیں اس لیے اپنی قوت و قدرت سے تخریب کو مٹاتے اور تعمیر کو ابھارتے ہیں۔ وہ "حمید" بھی ہیں اس لیے ان کی ہر تعمیر خوبصورت ہوتی اور نتائج کے اعتبار سے سزاوار حمد ٹھہرتی ہے۔ دنیا جنت نشاں بن جائے پھر بھی اسی کی تعریف، حقیقی جنت مل جائے پھر بھی اسی کی یاد کہ جنت، زندگی ہی کا حسن لازوال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عرصہ محشر کا آغاز و انجام حمد سے مربوط ہے اور فیصلے کے بعد اہل جنت کا آخری کلام بھی یہی ہے۔ بندے کا عجز و انکسار کے سانچے میں ڈھل جانا، حمد ہی کا ایک خوبصورت انداز ہے کہ وہ یوں کسی ایک ذات کے صاحب اختیار ہونے کا عملی اعتراف کرتا ہے۔ حسن و قبح میں امتیاز کرنے کی صلاحیت، اچھائیوں کی آرزو اور ہدایت کا مل جانا بھی، حمد ہی کا متقاضی ہے۔ زمین و آسمان کی تخلیق و تزئین اور ظلمت کی باہمی آویزش، ملائکہ کے ذریعے احکام ربانی کی بجا آوری بھی حمد ہی سے مربوط ہے۔ بالخصوص بڑھاپے میں صالح اولاد عطا ہونے پر، عطا کرنے والے کی یاد ضرور قرار دی گئی ہے۔ دشمنوں کے شر، حاسدوں کے حسد، جہلا کی ناروا باتوں اور کم ظرف لوگوں کے استہزا سے دل تنگ اور مزاج مکدر ہو جائے تو خالق کائنات کی ستائش، غم غلط کرنے کے لیے کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ خود اپنی صفات بتاتے ہوئے اور تفہیم مطالب کے لیے مختلف مثالیں بیان کرتے ہوئے بھی، حمد ہی سے آغاز فرماتے ہیں۔ کتاب ہدایت کے نزول کا ذکر ہو یا اوقات نماز کا تعین، بات ثنائے جمیل ہی سے جمال حاصل کرتی ہے۔ حضرت نوحؑ کو ظالم قوم سے نجات ملتی ہے تو حکم یہی ہوتا ہے کہ کشتی پر بیٹھتے ہی حمد بیان کی جائے۔ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کو علمی فضیلت ملتی ہے تو ان کا فخر و ناز بھی سراپا سپاس دکھائی دیتا ہے۔ قرآن میں برگزیدہ انسانوں کا تذکرہ بھی حمد ہی سے شروع ہوتا ہے۔ فرمان تسبیح و تحمید ہی کے ساتھ مخالفین کے ایمان و اطاعت کی بشارت ملتی ہے۔

قرآن مجید کے مطابق عرش و فرش اور دنیا و آخرت کی فضائیں حمد ہی کے ترانوں سے معمور ہیں۔ کفار دلائل قرآنی کے روبرو عاجز و خاسر ہو جائیں تو سربلندی کا نہیں 'تذلل و انکسار کے ساتھ 'اللہ کے سامنے جھک جانے کا حکم ہے۔ جب مرسلین حق پر سلامتی کا تذکرہ ہوتا ہے اور غم و آلام کے بادل چھٹتے ہیں تو بات حمد ہی پر ختم ہوتی ہے۔ وہ مقام بھی حمد ہی کا ہے 'جب مومنوں کو زمین کا وارث اور جنت کا حقدار قرار دیا جاتا ہے۔ تب بھی حمد ہی مطلوب دکھائی دیتی ہے جب اللہ تعالیٰ ہر قدرت رکھنے کے باوجود اپنے بندوں کو صبر و استقامت کی تلقین فرماتے ہیں۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور رفعتوں کے ذکر کے ساتھ جہاں بھی تعریف کی ضرورت محسوس ہوئی ہے وہاں صرف حمد کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ جو جامعیت اس ایک لفظ میں ہے وہ اس کے دوسرے مترادفات میں نہیں ہے۔ تعریف کسی محسوس امر کی بھی ہو سکتی ہے اور غیر محسوس کی بھی۔ مگر حمد کے لیے لازم ہے کہ ممدوح کا جمال نہ صرف واضح ہو بلکہ اپنے کمال کو بھی پہنچا ہوا ہو اور وہ کمال سراپا خیر و برکت بھی ہو اور اس کے نتائج ہمہ گیر بھی۔ صرف اختیاری افعال سزاوار حمد میں اضطراری نہیں۔ حمد میں 'حامد کی زبان 'اس کے دل کی رفیق ہوا کرتی ہے۔ اس میں کسی طرح کا کوئی دباؤ اور کسی نوع کی کوئی مجبور نہیں پائی جاتی۔ اس میں نمود و نمائش 'خوشامد و تملق اور فریب و منافقت کو بھی کوئی دخل نہیں بلکہ یہ بے ساختہ انداز میں دل کی گہرائیوں سے اٹھتی اور کبھی پلکوں پر مچلتی اور کبھی لبوں پر لہراتی ہوئی 'عرش کی بلندیوں کو چھو لیتی ہے۔ بے ساختگی کا یہی حسن اس کی خصوصیت اور اس کا امتیاز ہے۔ خیالی باتوں اور تصوراتی امور کی آپ تعریف تو کر سکتے ہیں مگر حمد نہیں کیونکہ "جس کی حمد کی جا رہی ہو اس کا ٹھیک ٹھیک علم ہونا ضروری ہے۔ محض گمان کی بنا پر حمد نہیں کی جا سکتی۔ مبہم تصورات 'دھندلے نقوش اور شکوک و تذبذب پیدا کرنے والے خیالات و معتقد کبھی حمد کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتے۔ حمد فریب تخیل 'توہم پرستی اور اندھی عقیدت سے نہیں ابھرتی۔ اس کا سرچشمہ یقین محکم اور ایمان کامل پر ہوتا ہے۔"

فرشتے ہر لحہ حمد و ثنا میں معروف ہیں مگر انسان اس حمد و ثنا کو ایک عملی شکل دیتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم کو 'اللہ تعالیٰ کی ہدایتوں کے تحت اس ڈھنگ سے عمل میں لاتا ہے کہ پوری کائنات رنگ و آہنگ کا ایک ایسا دل آویز پیکر بن جاتی ہے کہ اسے دیکھتے ہی زبان از خود اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنے لگ جاتی ہے۔ اس لیے مومن وہی ہے جو حمد کرنے والا ہو۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سب سے زیادہ حمد کرنے والے ہیں۔ اس لیے وہ احمد ہیں اور اسی لیے وہ مقام محمود پر فائز ہیں اور اسی لئے وہ محمد ہیں کہ ان کا ہر فعل اور ان کی ہر بات مستقلاً وجہ ستائش ہے۔

قرآن پاک نے بار بار کائنات پر تدبّر کا حکم دیا ہے۔ انفس و آفاق پر غور و فکر سے رب کائنات کی عنایات کا واضح احساس ہوتا ہے جو اپنے حسن عمل سے ہر آغاز کو ایک خوبصورت انجام عطا کرتا ہے۔ دل کے

اندھے نہ حسن کائنات کی تحسین کر سکتے ہیں اور نہ حسن آفرین کی ستائش۔ حمد و ثنا کی بہترین صورت یہ ہے کہ ہم مسلمان خود کو فرمودات خداوندی کے سانچے میں ڈھال کر پوری دنیا کو یوں حسن و خیر کا گہوارہ بنا دیں کہ وہ حسن ہر نظر سے لپٹ جائے اور وہ خیر' ہر دل کو نورانی بنا جائے اور ہر زبان اس الوہی نظام کی تعریف کرے جس پر عمل پیرا ہونے سے نتائج کا یہ حسن ابھرا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کے الفاظ ہیں :

"بڑائی ہم میں کہاں' ہماری کسی چیز میں کہاں؟ ہم آپ کے حضور میں ہیچ محض' صفر مطلق۔ بڑائی تو صرف آپ میں ہے۔ معبود آپ کے سوا کوئی ہے؟ زندگی کا مقصود اصلی اور کون ہے؟ شان وجود کے ساتھ موجود اور ہے کون؟ حسن و جمال آپ کی ذات میں' عزت و کمال آپ کی صفات میں؟ ہماری ہر جنبش لب کی مدح و ستائش کا ایک عنوان؟ ہمارا ہر تار نفس آپ ہی کی قدر و عظمت کا ایک بیان۔"

حمد و شکر سے روح تابندہ اور دل زندہ ہو جاتے ہیں۔ حمد بھی اس اللہ پاک کی جس کا پتہ اس کے رسول پاک ﷺ کے ذریعے ہمیں ملا۔ کافر خدا کو ماننے اور اس کی تعریف و ثنا کرنے کے باوجود اس لئے مُردہ ہیں کہ وہ رسول عربی ﷺ کے حوالے سے اللہ کو نہیں پہچانتے ان کی پہچان خالص نہیں نتیجہ معلوم کہ عرفان ناقص ہے بلکہ سراسر گمراہی ہے۔ جسم مرا کرتے ہیں مگر دلوں کی زندگی کو قبر کی افسردگی بھی پژمردگی میں نہیں بدل سکتی۔ فضائل مرا نہیں کرتے' ان کی خوشبو ابدی ہے' موت کا وار گوشت پوست پر ہوا کرتا ہے۔ عشق کی ڈھال ہاتھ میں ہو تو اس سے ٹکرا کر' خود موت کو موت آجاتی ہے۔ کفار زندہ رہتے ہوئے بھی مُردوں سے بدتر ہوتے ہیں جب کہ محمد عربی ﷺ کے غلاموں کے کفن بھی میلے نہیں ہوتے' بلکہ ان کی چمک میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ تابندگی اور یہ زندگی نتیجہ ہے' حب رسول ﷺ سے لبریز دل' سے اٹھنے والی حمد کا۔ رب جلیل کی ثنائے جمیل' عروۃ الوثقیٰ بھی ہے' اور حبل المتین بھی۔ یہ ایک عظیم سہارا ہے۔ یہ دل کے ویرانوں کو روشن رکھنے والی نعمت ہے۔ زندگی کے چراغ کا روغن ہے' باقی نہ رہے تو فتیلے کی تنہا فناپذیر ہستی' تیز ہواؤں کے مقابل نہیں آسکتی۔ دنیا میں قدم قدم روشنی مطلوب ہے' ہمارے پاس تو سراج منیر ہے۔ جس کی اولین کرن ہی الحمدللہ کے پیرہن میں جگمگا رہی ہے۔

مولانا خلیقی دہلوی کا بہار پرور قلم' حمد و ثنا کے پیرائے میں' حضور ناز میں یوں تحدیہ' نیاز پیش کرتا ہے۔ اس تحریر میں جدت کی شادابی اور ندرت کی شگفتگی کے ساتھ' تاثر کا اعجاز گداز بھی تو دے رہا ہے۔ اظہار شکر' اعتراف عظمت اور حسن طلب تینوں جلوہ گر ہیں۔ "خداوندا' اک لڑکھڑاتی ہوئی زبان' اک تکلم کے زور سے ناصر گویائی' اگر تیرے لطف و احسان' تیرے اکرام و عطایا کو حسن طلاقت کے ساتھ شمار نہیں کرا سکتی تو کیا اے پردہ پوش مالک تو اس کے اس اقرار عجز تو اس کے اس اعتراف قصور کو اپنی قبولیت و

رضامندی کی چادر میں نہیں ڈھانپ سکتا؟ اے مالک! اک پاشکستہ و بے کیف قلم' ہاں اک ایسا قلم جو تیرے جمال کی نت نئی کرشمہ آرائیوں کے بیان سے عاجز اور اس کے اظہار کی قابلیت نہیں رکھتا' وہ اگر تیری مہربانیوں کے نشر کامل سے عہدہ بر آ نہیں ہو سکتا' تو اے مسکین نواز! تو اس کی اس شرم' تو اس کے اس رقیق انفعال کو اپنی بندہ پرور پسندیدگی سے سرفراز نہیں فرما سکتا؟

اے تو وہ کہ جو شستگی زبان اور شگفتگی بیان کی نسبتوں سے بلند اور طلسم ستائش و نیائش سے مستغنی ہے' اے تو وہ کہ جو گداز ترنم اور شوخیٔ تکلم سے بے نیاز اور مسرت مدح و تلخیٔ ذم سے بے پرواہ ہے' مجھے بتا تو' آخر تو کیا ہے؟

آقا' مجھے آرزو ہی رہی کہ کسی طرح میں اپنی فرصتوں کا خلاصہ' اپنے ٹوٹے پھوٹے قلم کی چند لکیریں' اپنی بندگی کے چند نقوش' تیرے حضور پیش کر دیتا!

مالک! میری لکنت یوں ہی پھول کترتی رہی۔!
میرا قلم یوں ہی بے کار و بے کیف جنبش کرتا رہا۔!
میری ساری عمر یوں ہی انتظار میں گم صم گزر گئی۔!"

خلیقی دہلوی نے اپنی اس نثری حمد کا عنوان رکھا ہے' "تمدیۂ نیاز بحضور ناز۔" گویا کائنات کی ہر شئے نیاز مند ہے اسی ایک ناز آفرین کی' جس کا ان دیکھا وجود' نظر آنے والے ہر موجود کے لئے' وجہ کشش اور باعث اضطراب ہے کہ عشق ہر شئے کی سرشت میں ہے اور تڑپ' عشق کی فطرت ہے عشق' معشوق کا ہر اعتبار سے محتاج اور معترف ہوا کرتا ہے اسی کے ذکر سے وہ اپنی زبان کو تر رکھتا' اور اسی کے خیال سے وہ اپنی تنہائی کو رعنائی عطا کرتا ہے اسی کی یاد سے وہ خود کو آباد رکھتا اور اسی کے حضور میں بکھر بکھر جاتا ہے۔ عجز کا ہر انداز' نیاز کا خاصہ ہے اور ہر طرح کا استغنا' حسن والے کا امتیاز ہے بے نیاز ہونا ہی ناز کی خصوصیت ہے۔ اقبال اس نکتے سے کس قدر آگاہ تھا کہ اس نے اس حقیقت کو کہ کائنات کی ہر شئے' اللہ تعالیٰ کی رہین احسان ہے شاعرانہ انداز سے یہ کہہ کر ثابت کیا ہے کہ سورج' صبح کے ماتھے پر نیاز مندی کا ایک روشن نشان ہے خالق و معبود کے حضور میں ایک چمکتا ہوا داغ سجود ہے یہی آفتاب' دلیل سحر ہے اور سحر کائنات کا اعلان وجود ہے اور یہ خلعت وجود اسے اس ذات مصور و مدبّر نے عطا کیا ہے جس کی اپنی موجودگی حقیقی حیثیت کی حامل ہے اور جس کے کرم سے' سب کا ہونا وابستہ ہے۔

شهید ناز او' بزم وجود است　　نیاز اندر نهاد هست و بود است
نمی بینی که از مهر فلک تاب　　به سیمائے سحر' داغ سجود است

جہاں تک تعریف کا تعلق ہے وہ زندہ کی بھی ہو سکتی ہے اور مُردہ کی بھی۔ حاضر کی بھی اور غائب کی بھی۔ مگر حمد صرف ذات لایزال کے لئے ہے۔ حمد کے فوراً بعد اسم ذات کا آجانا اور دوسری صفات کے ذکر

کا مؤخر ہو جانا' دلیل ہے اس امر کی کہ صرف اللہ تعالیٰ' ذات' صفات اختیارات کے اعتبار سے حمد کا مستحق ہے۔ حمد کے لئے ضروری ہے کہ جمال الٰہی کا ذکر فصاحت کے انتہائی کمال کے ساتھ اور جلال الٰہی کا بیان بلاغت کے انتہائی اجلال کے ساتھ کیا جائے۔ خود کو حقیقتاً حقیر اور اللہ تعالیٰ کو واقعتاً ارفع و اعلیٰ جانتے ہوئے کیا جائے جب کہ تعریف میں نہ انتہائی محبت مطلوب ہے نہ انتہائی خشیت' برابر کی سطح پر برابر کے آدمی کی بھی تعریف ہو سکتی ہے حمد میں قلبی محبت کے اظہار' روحانی خشیت کے گداز' اور جسمانی تعظیم کے محتاط اندازہی کا دوسرا نام خشوع و خضوع ہے مقصود یہ ہے کہ چاہنے والا' محبوب حقیقی کو ٹوٹ کر چاہے اور یہ چاہت' ہر چاہت پر غالب رہے اس سلسلے میں قرآن پاک نے اشد کا لفظ استعمال فرمایا ہے جو اسم تفضیل ہے۔ جس سے باقی محبتوں کی نفی نہیں ہوتی بلکہ ان سب محبتوں پر' ایک محبت حاوی رہتی ہے۔ فطرت کے ہر دوسرے حسن کو قلب و نظر کا سرمایہ بنانے کی اجازت اسی شرط پر ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ سب ایک ہی حسن کے کرشمے ہیں۔ یوں حمد' ہر غم کو غم جاناں بنا دیتی اور ہر محبت کو ایک ہی محبت میں ختم کر دیتی ہے۔

زمانے بھر کے غم یا اک ترا غم
یہ غم ہو گا تو کتنے غم نہ ہوں گے

اور یہ غم جتنا شدید ہوتا چلا جائے گا' حمد' ثنا اور پکار کا آہنگ بھی اتنا ہی بلند ہوتا چلا جائے گا۔ یہی وہ محبوب ہے جس کا ذکر ہر بار نیا کیف عطا کرتا ہے یہی وہ میکدہ ہے جہاں سیر ابی' تشنگی میں اضافہ کرتی چلی جاتی ہے۔

سرشت' عشق طلب اور حسن بے پایاں
حصول' تشنہ لبی ہے' شدید تشنہ لبی

حمد میں مناجات کا رنگ آجائے تو یہ ثنائے ربانی' عبد مجبور کے دل کی دھڑکنوں' نگاہوں کی تمناؤں اور روح کی لرزشوں کی ترجمانی کرتے ہوئے ایک ایسی دعا کا روپ دھار لیتی ہے جو انتہائی عجز کے ساتھ باب اثر تک جاتی اور انتہائی ناز کے ساتھ باب اثر سے لوٹتی ہے۔ اسی دعا کو اس زبان پاک نے عبادت کی روح قرار دیا تھا جو کھلتی ہی صداقتوں کے لئے تھی' حمد' "انسانی فطرت کی خلقی افتاد کا ابدی اظہار ہے' یہ عبد و معبود کے تعلقات ناز و نیاز کا ایک دل آویز عکس ہے۔ اسی سے رکھے ہوئے دلوں کو سکون کا مرہم ملتا اور روحانی بیقراریوں کو منزل کی آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ حضرت زین العابدینؓ کے مطابق "صرف الحمد للہ" کہہ دینے سے انسان اللہ تعالیٰ کی جملہ نعمتوں کا شکر ادا کر دیتا ہے۔" لفظ حمد پر الؔ کے اضافے نے اسے ہر نوع کی جامعیت عطا کر دی ہے گویا حمد اس ذات والا صفات کی ثنا و ستائش ہے جو ہر اعتبار سے مختار ہے اور جس کا ہر محل' اجمل و احسن ہے اس کی بے پایاں نعمتوں نے حمد کو بھی بے کراں وسعتوں سے نوازر کھا ہے اور یہی وہ صنف سخن ہے جسے ممدوح عظیم و جلیل کی پسندیدگی کا شرف حاصل ہے۔ یہی وہ روح پرور بیان ہے جس سے

مومن کا دل فیضان الٰہی سے محمود و معمور رہتا ہے۔ اس میں رب العالمین کی پیہم عنایات کی طلب کا پہلو بھی پایا جاتا ہے اور اس کی نوازشات کا اعتراف بھی اللہ تعالیٰ حی و قیوم اور عظیم و جلیل ذات ہے جو ہمارے خیال و قیاس کی اڑانوں سے بھی بلند و برتر ہے۔ اس میں ہر نوع کے حسن و کمال کی جامعیت جلوہ گر ہے ایسی ہستی کے لئے حمد ہی ایک ایسا جامع لفظ ہے' جو مفہوم کے اعتبار سے 'ممدوح ہی کی طرح منفرد اور لاجواب ہے اور پھر 'ال' کے اضافے نے اس میں کلیت کی ایک ایسی شان پیدا کر دی ہے جو تعریف کے لفظ سے کہیں ارفع ہے تعریف تو قد و قامت 'زلف بے جان' بے بس اور بے اختیار امور کی بھی ہو سکتی ہے اور یہ حصول نعمت سے پہلے بھی ہو سکتی ہے جب کہ حمد کے لئے انعام و اکرام کا وجود و حصول دونوں ضروری ہیں۔ حمد سے ایک طرف بندے کو اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اپنے بضاعت اور اساس ہونے احساس بدرجہ اُتم ہوتا ہے اور دوسری طرف اتنی ہی شدت سے یہ صداقت بھی ابھرتی ہے کہ بندگی کی اس سرافگندگی نے اسے کائنات کا آقا بنا دیا ہے۔ بندہ اللہ کے سامنے جھکتا ہے تو اللہ کی بنائی ہوئی ہر شے بندے کے حضور میں جھک جاتی ہے گویا حمد سے بندہ ہر نوع سے اور ہر مقام پر سرفراز رہتا ہے حمد 'محبوب حقیقی کی رعنائی کے تصور کو انسان کے دل میں اتارتی ہے اور وہ اعتراف عظمت کے لئے خود کو سرشار اور آمادہ پاتا ہے۔ پھر خیال بے شمار نعمتوں اور بے طلب عطاؤں کی طرف آتا ہے تو روح شیفتگی اور گرویدگی سے لبریز ہو جاتی ہے اور جب حاکمانہ جلال کا تصور آتا ہے تو دل خوف و خشیت سے لرز اٹھتا ہے۔ اور ایمان اسی خوف و محبت کے درمیان قائم رہتا ہے جلال سے قہاری جھلکتی ہے اور جمال سے غفاری نکھرتی ہے۔ اور محبت کا خاصہ ہے کہ وہ محبوب کو جس رنگ اور آہنگ میں دیکھتی ہے اس پر نثار ہوتی چلی جاتی ہے۔

انسان اپنی خوبیوں اور اپنی ذات سے متعلق نوازشوں ہی کے بارے میں مسرور و ممنون نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کی صلاحیتوں سے بھی مستفید ہوتا ہے ان کی ستائش بھی کرتا ہے اور دعا بھی دیتا ہے وہ ذرے سے لے کر خورشید تک پھیلی ہوئی نعمتوں اور سعادتوں سے بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ فیض اٹھا کر متشکر ہوتا ہے یوں حمد و ثنا اس کے خیالوں اور لفظوں میں ایک ایسی وسعت پیدا کر دیتی ہے جس سے اس کی ذات میں کائنات سمٹ آتی ہے اور وہ دوسروں کی مسرتوں میں خود کو شریک پاتا ہے۔ اس کے دل کی دھڑکنوں میں انسانیت اپنی تمام دلآویز اداؤں کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ گویا حمد ربط ملت اور جذب باہمی کا ایک ایسا خوبصورت ذریعہ ہے جو لاشعور طور پر فاصلوں کو محبتوں میں مبدل کرتا چلا جا رہا ہے۔ غور کیجئے کہ حمد میں یہ نہیں کہا گیا کہ "میں اللہ کی تعریف کرتا ہوں" بلکہ اس امر کا اعلان ہے کہ جملہ مخلوقات و موجودات ہر رنگ میں اسی کی ثنا خواں ہے۔ یہ ثناء زبان قال سے ہو یا زبان حال سے 'براہ راست اور بغیر کسی واسطے کے' گویا حمد نے ایک طرف تعریف کرنے والوں کو براہ راست ذات محمود سے ہم کلام کر دیا ہے' دوسری طرف پوری انسانیت اور پوری کائنات کی لرزشوں' نواؤں اور تمناؤں میں ایک نوع کی یگانگت اور یکسانیت بھی پیدا کر دی ہے۔ حمد کا

لفظ مصدر ہے اور مصدر تذکیر و تانیث' وحدت و جمع اور زمان و مکاں کی پابندیوں سے ماورا ہوتا ہے۔ حمد اپنے اندر ایک آفاقی تاب و تب لئے ہوئے ہے۔

نماز' حمد کی ایک منظم' مرتب اور مرئی شکل ہے۔ جملہ عبادات پر غور کیجئے' مخصوص حالات میں روزہ بھی معاف ہو سکتا ہے' زکوٰۃ اور حج بھی' مگر نماز کسی حالت میں بھی معاف نہیں ہے۔ یہ علالت کی انتہائی شدّت میں' نہ برستے ہوئے تیروں کی بوچھاڑ میں' نہ سفر و حضر میں اور نہ رزم و بزم میں' صرف اس لیے کہ حمد کائنات میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ بنیاد باقی نہ رہے تو پوری عمارت زمین بوس ہو کر رہ جائے گی۔ حمد و ثنا اور ذکر و شکر کی یہ صورت جس کا نام نماز ہے صرف اس لیے لازم ہے کہ کائنات کا قیام اس پر موقوف ہے اور حمد کی یہی کیفیت کفر و ایمان میں نشان امتیاز ہے۔ تحمید و تحسین اور تعظیم و تکریم کا یہ انداز اس دنیا کا بھی اعزاز ہے اور اخروی زندگی کا بھی امتیاز۔ نص قرآنی ہے وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَالْاٰخِرَةِ۔ گویا اللہ کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں اور دنیا و آخرت میں وہی سزاوار حمد ہے۔

حمد تخلیق کے سارے نظام میں اساسی نوعیت کی حامل ہے' بندگی کی عظمت کا اظہار بھی حمد سے ہوتا ہے اور اس اظہار کی تکمیل بھی حمد ہی سے ہوتی ہے۔ ہمارے لئے دنیوی آسائشیں اور نوازشیں بے کراں اور بے شمار ہیں' مگر اللہ تعالیٰ انہیں متاع قلیل اور متاع غرور قرار دیتا ہے اور بندوں کی طرف سے ہونے والے اپنے ذکر کو متاع کثیر کہتا ہے۔ اس مختصر زندگی میں ہماری حمد و ثنا کے ناقص سرمایے کی حیثیت ہی کیا ہے؟ غفلتوں سے لبریز ہماری چند لکنتیں اور خضوع و خشوع سے تہی ہمارے چند سجدے بھی اس رحیم و کریم کے لیے متاع کثیر ہیں۔ اپنے گناہ یاد آجائیں' بندے کی آنکھوں میں نمی تیر جائے اور وہ نمی اس کے رخساروں کو مَس کر جائے تو اس چہرے کو دوزخ کی آگ چھو نہیں سکتی' بلکہ جنت کی بہاریں اس کا استقبال کرتی ہیں۔ کس قدر قلیل شئے اور کتنا کثیر اجر۔ محبت میں خلوص ہو تو موت کی ایک انی بھی زر و جواہر سے گراں تر سمجھی جاتی ہے۔ طلب میں صدق ہو تو ندامت کے چند آنسو بھی موتیوں میں تلتے ہیں۔ صرف اس لیے کے محبوب حقیقی خلوص کے تقدس کو کسی احساس کمتری کا شکار نہیں دیکھ سکتا اور سچی محبت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ اپنی عطا کو قلیل اور چاہنے والے کی عطا کو کثیر سمجھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بے ساختگی کے عالم میں' روح کی پہنائیوں سے ابھرنے والی الحمدللہ کی صرف ایک صدا' کیفیت کے اعتبار سے انتہائی پسندیدہ ہے اور عالم بالا میں ایک بہترین ارمغاں کی حیثیت سے قبول کی جاتی ہے۔

انسان کی تخلیق فی الواقع تکمیل عبدیت کے لئے کائنات کی لذتیں' اس کے لئے ہیں وہ ان کے لیے نہیں ہے' دنیا کا عیش و نشاط کسی مقام پر بھی مقصد زندگی نہیں ہے اور نعمتوں کا حصول' اصول حیات ہے بلکہ حقیقی مقصد عطا کرنے والے کی رضا کی تلاش ہے۔ رضا کی یہ چاہت' انسان کو ہر دوسری چاہت سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ انعام و اکرام کی بظاہر کمی بیشی سے یہ حسن طلب کسی رنگ سے بھی متاثر نہیں ہوتا۔ چاہت

کے اس راستے میں کانٹے' پھول' شعلے' گلزار اور گریاں کے تار' نشان بہار ہو جایا کرتے ہیں۔ نتیجہ معلوم کہ
محبت' تلواروں کی چھاؤں میں بھی سجدہ گزار رہتی اور سولیوں پر لٹک کر بھی حمد و ثنا کے زمزمے الاپتی ہے۔

سلام ان پہ تہہ تیغ بھی جنہوں نے کہا — جو تیرا حکم' جو تیری رضا' جو تو چاہے

یہ کائنات' انسان کی شان عبودیت کا اظہار بھی ہے اور اعتراف بھی۔ غور کیجئے تو قدم قدم'
مظاہر پرستی کی جڑ کٹتی اور خدا پرستی کی بنیاد پڑتی ہے کہ ہر مظہر فنا پذیر ہے۔ ہر شئے اپنے اپنے طور پر خالق
کائنات کے حضور میں سرنگوں اور اس کی شان میں غزل خواں ہے مگر اس حمیدگی کو زندگی اور اس تعریف کو
پائندگی انسان نے دی ہے بلکہ مسلمان نے دی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر سے قبل اسی لئے
فرمایا تھا کہ اگر آج یہ مٹھی بھر مسلمان مارے گئے تو اے اللہ! تیرا نام لینے والا کوئی باقی نہیں رہے گا۔ گویا
جب تک زبان حمد کے ترانے گاتی رہے گی' اس وقت تک کائنات قائم رہے گی اور جب نطق انسانی سے
ابھرنے والی حمد و ثناء پر چپ لگ جائے گی اور جب جبینیں سجدوں کے نور سے محروم ہو جائیں گی' تب
کائنات بھی اپنے وجود کا مفہوم کھو دے گی اور اس کا قیام اور نظام دونوں بے مقصد ہو کر رہ جائیں گے۔

دفعتاً ساز دو عالم بے صدا ہو جائے گا — کہتے کہتے رک گئے جس دن ترا افسانہ ہم

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان میرے اس خیال کا مؤید ہے کہ "اس وقت تک
قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک "اللہ اللہ" کی صدائیں بلند ہوتی رہیں گی۔ حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سزاوار حمد
ہے کہ وہ ہر خوبی کا مالک بھی ہے مختار بھی اور بے نیاز بھی کہ چاہے کسی کو کچھ عطا کرے نہ کرے پھر بھی مستحق
حمد ہے۔ وہ سزاوار مدح بھی ہے کہ اس کی ہر بنائی ہوئی چیز قابل تعریف ہے۔ وہ سزاوار شکر بھی ہے کہ اس کی
نوازشات بیکراں ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ خواہ کوئی سپاس و شکر بجا لائے یا نہ لائے' نہ اس کی شان عطا میں کوئی
فرق پڑتا ہے اور نہ اس کا دست عطا رکتا ہے۔ اس کے ابھارے ہوئے سورج کی کرنیں یکساں انداز سے محل
پر بھی پڑتی ہیں اور کٹیا پر بھی' اس کے بھیجے ہوئے بادلوں سے برسنے والی بارش گل و گلزار کو بھی نوازتی ہے اور
خار زاروں کو بھی۔

ایسے ہی اس ذات کی رحمت اور کرم سب کے لئے ہیں۔

پہنچتا ہے ہر اک میکش کے آگے دور جام اس کا — کسی کو تشنہ لب رکھتا نہیں ہے لطف عام اس کا

حمد کا ایک رنگ یہ بھی ہے کہ سلام ہو اس ذات اقدس ﷺ پر جس کی تعریف وہ ذات کرتی
ہے جو خود ہر تعریف کی مستحق ہے جو ذات معطی اور محسن ہے اور جس کا سب سے بڑا احسان اور جس کی سب
سے بڑی عطا نبی کریم ﷺ کی صورت میں ہمارے درمیان ہے۔ اگر عطا کا یہ سلسلہ نہ ہوتا تو ہم اللہ تعالیٰ کے
نام سے بھی ناآشنا' اس کی حمد و ثنا سے بھی بے بہرہ اور اس کی عطاؤں کے اعتراف سے بھی بے توفیق ہوتے۔ وہ
نہ ہوتے تو ہماری یہ کائنات دھواں دھواں ہوتی اور ہم شعور حق و باطل سے بیگانہ' کفر و تشکیک کے عالم

میں بھٹک اور بھٹک رہے ہوتے۔ ہزاروں درود پہنچیں اس وجود ذی جود ﷺ کو' جس کی اتباع اللہ تعالیٰ کی محبت کی واحد دلیل ہے اور اسی محبت کے صلے میں عرفان حق ملتا ہے۔ اسیؐ کے فیض سے نمو کو مغموم اور زندگی کو بالیدگی ملتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور' اللہ تعالیٰ کے وجود کا ثبوت ہے اور آپ نہ صرف اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ حمد کرنے والے ہیں بلکہ حمد کا حق بھی ادا کرنے والے ہیں۔ یہاں تک کہ روز حشر' حمد کا پرچم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ہاتھ میں ہو گا اور باقی سب اس کی چھاؤں میں ہوں گے۔

اک وہم و گماں ہوتے' اگر آپؐ نہ ہوتے
ہم لوگ کہاں ہوتے' اگر آپؐ نہ ہوتے

کعبہ کو صنم خانہ بنائے ہوئے اب تک
ہم سجدہ کناں ہوتے' اگر آپؐ نہ ہوتے

ہر جلوۂ کثرت میں یہ وحدت کے قرینے
کس طرح بیاں ہوتے' اگر آپؐ نہ ہوتے

الغرض حمد' ذکر کی ایک حسین کہکشاں اور یاد کی ایک دلآویز قوس قزح ہے۔ اسی سے تصور مصفا ہے اور درد چمکتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ تصور کا حسن چھن جائے تو دل ایک پارۂ سنگ ہے اور یاد کی رنگینی باقی نہ رہے تو زندگی ایک کربناک شب تنہائی ہے۔ حمد کلامِ تکبیر کا وقار' قیام و قعود کا معیار اور رکوع و سجود کا اعتبار ہے۔ یہ نفس نفس زیبائی' روش روش رعنائی اور قدم قدم سچائی ہے۔ یہ دل کی سعادت' جبیں کا نور اور نطق کی معراج ہے۔ اس سے شکوک و شبہات کی دھند چھٹتی اور یقین کو منزل کا اجالا نظر آتا ہے۔ اللہ کی حمد سینے میں گداز بن کر اترتی' آنکھوں میں شبنم بن کر تیرتی اور روح میں لطافت بن کر بکھرتی ہے۔ اسی سے غریبوں کے آنسوؤں' یتیموں کی فریادوں اور دکھیاروں کی آہوں میں رحمت کی تازگی اور امید کی چاندنی نکھرتی ہے۔ یہ ہم خاکیوں کا اعزاز بھی ہے اور قدسیوں کا شعار بھی۔ یہ فطرت کے بے تاب سینے کی ہوک اور چاہت سے لبریز روح کی تڑپ ہے۔ یہ عمل کا حسن اور ایمان کا نور ہے۔ اسی سے نیاز کو ناز اور سجدوں کو گداز ملتا ہے۔ جب حمد جبینوں میں دمکتی ہے تو دل سے اٹھنے والے نالوں کا جواب عرش سے آتا ہے۔ اسی سے حضورِ ناز میں دعا مستجاب اور شوق باریاب ہوتا ہے۔ حمد زندگی کے تپتے ہوئے صحرا میں ایک ایسا شجر سایہ دار ہے' جس کی خنک چھاؤں میں ہر تھکا ہارا پناہ لے سکتا ہے۔ یہ نجات کا پروانہ اور مغفرت کا تمغہ ہے۔ یہ تحدیث نعمت اور نیاز عبدیت ہے۔ یہ عبد مجبور کا سہارا اور عبد شکور کا فخر ہے۔

مرا وجود ہے خود حاصل جبین نیاز
نفس نفس ہے عبادت' نظر نظر ہے نماز

دل و نظر پہ ہوئی ہیں نوازشیں کیا کیا
ہے رنگ اور تماشا' ہے ہم سوز و گداز

سوائے ذات خدا کے ہے قادر و خلاق
نہ کوئی عقدہ کشا ہے نہ کوئی بندہ نواز

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط (بھارت)

اردو کی متصوفانہ حمدیہ شاعری

اس مضمون میں آپ کو تصوف کے مبادیات 'مسئلہ وحدۃالوجود اور وحدۃالشہود کے مناقشات نہیں ملیں گے اس پر تو ضخیم کتابیں تصنیف ہو چکی ہیں۔ نہ اس میں خشک زاہدانہ مسلک کی باتیں ہیں۔ اس میں مراقبہ اشغال و اذکار کا کہیں ذکر نہیں۔ نہ ناسوتی و ملکوتی احوال شریعت و طریقت کے کوائف کا بھی یہاں دور دور تک پتہ نہیں۔ جذب و سکر کے حالات بھی آپ کو یہاں نہیں ملیں گے۔ بلکہ میں نے اس مضمون میں صرف 'محبت' کو پیش نظر رکھا ہے کہ صوفی کی زندگی سراسر 'عشق ہی سے عبارت ہے۔ محبت کی وارفتگیوں اور عشق کی کرشمہ سازیوں کا اس میں ذکر ہوا ہے 'جس کی سرشاری محب و محبوب میں جذبہ' استیناس و شوق استیلاف پیدا کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ "استقلال الکثیر من نفسک و استکثار قلیل من حبیبک" والی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وارفتگی شوق اور غلبہ' محبت 'ساختن' کو 'سوختن' میں بدل دیتے ہیں۔ فرق مراتب مٹ جاتے ہیں۔ من و تو کے پردے ہٹ جاتے ہیں۔ محبوب کبھی بندہ و عاجز دکھائی دیتا ہے 'کبھی عاشق صادق۔ فرط محبت اور وارفتگی شوق میں اس کا غلو اتنا بڑھتا ہے کہ وہ فراق یار میں تڑپنے لگتا ہے اسی طرح جیسے ایک عورت فطری طور پر اپنے "پیا" کے فراق میں تڑپتی ہے۔ صوفیائے کرام نے سالک کے دل میں "حب اللہ" پیدا کرنے کے لئے عورت کی اسی نفسیات کو اپنے "فلسفہ' محبت" میں جگہ دی ہے۔ ایسی محبت چونکہ تقشف زہد و یابس اور بے کیفی سے پاک ہوتی ہے اور معمولات زندگی میں اس سے روزانہ سابقہ پڑتا ہے اس لئے زود اثری میں یہ اپنی مثال آپ ہوتی ہے۔ اس مضمون میں ایسے ہی حمدیہ اشعار منتخب کئے گئے ہیں جن میں عشق کی کسک نسائیت لئے ہوئے ہے۔ اللہ سے عشق کے اس تصور کو خالصتاً ہندوی تصور گردانا گیا ہے لیکن ہمارے صوفیائے کرام کے یہاں بھی زمانے سے یہ تصور چلا آرہا ہے۔ مثلاً شیخ یعقوب اسحاقی کے یہاں "الکامل التام" بزرگوں کے لئے "عرائس اللہ" کی اصطلاح ملتی ہے۔ خدا سے عشق کرنے والے صوفیوں کو انہوں نے "اللہ کی دلہنیں" کہا ہے۔ کیا بعید ہے کہ ہمارے صوفیاء نے اسے "اصطلاحی معنی" کے بجائے "لغوی معنی" میں قبول کیا ہو اور اسے مقامی رنگ دے کر اس میں شگفتگی و وارفتگی پیدا کرنے کی سعی فرمائی ہو۔

معرفتِ الٰہی کے رازہائے سربستہ کی عقدہ کشائی کے لئے عقل و فہم جب "پائے چوبیں" ثابت ہوئیں اور باوجود دوڑنے کے وہ آپ سے باہر نہ جا سکیں تو بالآخر "معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد" کو انہیں تسلیم کرنا پڑا۔ ذاتِ الٰہ کی کُنہ میں خرد کی یہ حیرانی و پشیمانی اور متحیر و درماندگی سمجھ میں آگئی تو پھر معرفتِ الٰہی کے لئے قلب کا سہارا لیا گیا اور طرز دلالت واصولِ حکمت کے بالمقابل وجدان و محبت کو وسیلہ بنایا گیا۔ کیونکہ اہل اللہ خوب جانتے تھے کہ "گرمئی عشق" سے کائنات کو پگھلایا جا سکتا ہے۔

"عشق شاید کو درا مانند ریگ"

عقل کے بجائے روح بالیدہ ہو جائے تو معرفت الٰہی نصیب ہو سکتی ہے اور روح کی بالیدگی کے لئے "محبت" سے بڑھ کر کوئی دوسرا وسیلہ نہیں۔ عقل تو "کارافزا" ہوتی ہے جبکہ محبت "روح افزا" اسی لئے تصوف کے سالاروں نے سالکانِ حق شناس و ناشناس کی تربیت کے لئے "محبت" پر زور دیا۔ ان کے دل ناتراشیدہ کی تہذیب و تذہیب کی اور "عشق" سے اسے معمور کیا تاآنکہ وہ نشاطِ سرمدی آشنا ہو جائے۔ قلب ماہیت کی یہ وہ کار فرمائی تھی کہ دلِ حق آگاہ معرفتِ الٰہی کے نور سے جگمگانے لگا۔ خدا کا گھر بن جانے کے بعد دل تمام آلائشوں سے پاک و صاف ہو گیا اور محبت الٰہی سے شرابور۔ صوفی کی زندگی کا مقصود عشق کی سرشاری اور معرفتِ الٰہی رہا ہے۔ "حب اللہ" میں وہ اس درجہ شدید ہو جاتے ہیں کہ پھر اللہ بھی ان سے محبت کرنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ اللہ کے عاشق اللہ کے معشوق بن جاتے ہیں۔ "اشد حباً للّٰہ" ان کا مقصد حیات بن جاتا ہے۔ تو "یحببکم اللّٰہ" کا پروانہ انہیں اللہ کی طرف سے مل جاتا ہے۔ "عشقنی عشقنه" کی یہ کیفیت کتنی وجد آفریں ہے۔ مولانا رومؒ اسی لئے "انسان کی محبت خدا کے لئے" کی بہ نسبت "خدا کی محبت انسان کے لئے" پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اس عشق کا مبداء "سیر فی اللہ" ہے اور منتہا "سیر الی اللہ" عاشقی کے ایسے پُرکیف اور دل نواز واقعات صوفیوں کی زندگی میں ملتے ہیں۔

(۱) ابراہیم بن مہلب کہتے ہیں کہ میں طواف کر رہا تھا۔ میں نے ایک باندی دیکھی جو کعبۃ اللہ کا غلاف پکڑ کر کہہ رہی تھی "اے میرے سردار! تجھے مجھ سے محبت کرنے کی قسم میرا دل پھیر دے۔" (فضائل حج، ص ۱۷۶)

(۲) حضرت عطاءؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سات دینار میں ایک باندی خریدی جو دیوانی بتائی جاتی تھی۔ جب رات کا کچھ حصہ گزرا تو میں نے دیکھا کہ وہ اٹھی اور وضو کر کے نماز پڑھنے لگی۔ نماز میں اس کی یہ حالت تھی کہ روتے روتے دم نکلا جا رہا تھا۔ پھر اس نے دعاء کی اور یوں کہنے لگی۔ "اے میرے معبود! آپ کو مجھ سے محبت رکھنے کی قسم مجھ پر رحم فرما۔" میں نے اس سے کہا کہ یوں کہو کہ "مجھے تجھ سے محبت رکھنے کی قسم" (فضائل نماز)

اس قسم کا ایک واقعہ حضرت سریؒ کے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے خدمت

کے لئے ایک باندی خریدی تھی۔ ایک رات میں نے دیکھا کہ وہ کبھی نماز پڑھتی ہے اور کبھی مناجات میں مشغول ہو جاتی ہے اور کہتی ہے "اے میرے رب! آپ اس محبت کے وسیلہ سے جو مجھ سے رکھتے ہیں فلاں فلاں کام کر دیں۔ میں نے آواز سے کہا کہ اے عورت! یوں کہہ کہ میری محبت کے وسیلہ سے جو مجھے آپ سے ہے۔" (فضائل نماز)

یہ اور اس قسم کے دیگر واقعات جن میں "انسان سے خدا کی محبت" کی ترجمانی ہوئی ہے کتنے حیات آفریں ہیں؟ عقلیت پسندوں نے لیکن یہ سوال اٹھایا ہے کہ "کیا خدا سے محبت کی جا سکتی ہے؟" صوفیاء نے خرد پرستوں کو اس کا جواب اثبات میں دیا ہے اور نصوص قطعیہ سے دلیلیں دی ہیں۔

محبت کے لئے یک گونہ جنسیت ازبس ضروری ہے۔ ہم جنس سے وابستگی اور قربت سے جو ذوق اور حظ حاصل ہوتے ہیں اسی کیفیت کا نام محبت ہے۔ اسی سبب وابستگی سے ہم جنسوں میں باہمی کشش پیدا ہوتی ہے۔ روزانہ کی زندگی میں دوستوں کے درمیان باہمی کشش اور زن و شو کے درمیان پائی جانے والی کشش اس کی مثالیں ہیں۔ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو دوسری جانب کے ردِ عمل پر انحصار کرتا ہے۔ بچہ کی مسکراہٹ پر ماں کی ممتا کیسی چھلک پڑتی ہے؟ چڑیوں کا اپنے بچوں کو بچانے کی خاطر سانپ پر جھپٹ پڑنا' کبوتروں کا ایک دوسرے کی چونچ میں چونچ ڈال کر فرطِ خوشی سے مست ہو جانا' یہ ساری علامتیں تو محبت ہی کی ہیں۔ عشق میں جنسیت کی دوسری صورت لذائذ بہیمیہ کی تکمیل بھی ہے۔ گو یہ بھی عشق کی فطری کیفیت ہی سے عبارت ہے لیکن اس میں محبت کی بجائے ہوس اور وجدان کی بجائے نفس کی کار فرمائی کو زیادہ دخل ہوتا ہے اور نفس کی پیروی بالعموم شر کی راہیں کھولتی ہے۔ اس لئے شریعتِ مطہرہ نے لذائذ بہیمیہ کی تکمیل کی احسن صورت بھی نکالی ہے جو سبب شوق و دلبستگی اور ذریعۂ وار فتگی کا عمدہ نمونہ روئے زمین پر قرار پاتی ہے۔

عشق الٰہی میں وار فتگی اور افزونی پیدا کرنے کے لئے شاید صوفیائے کرام نے عشق مجازی کو مہمیز بنایا ہے اور سماع میں عارضی عشق کرنے والے عشاق کے قصوں کو مباح فرمایا ہے بلکہ بعض صوفیاء نے تو اللہ تعالیٰ سے دل لگانے کے لئے اپنے آپ کو معشوق (بہ شکل زن) اور خدا کو عاشق (بہ صورت شوہر) متصور کیا ہے۔ وہ اس لئے کہ محبت میں ہم جنسیت سے شدت پیدا ہوتی ہے۔ چند واقعات اس نوع کے بزرگوں کی زندگی میں یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

(۱) ایک مرتبہ قاضی حمید الدین ناگوریؒ مولانا شرف الدینؒ کی عیادت کو گئے۔ انہوں نے ملنے سے انکار کر دیا کہ "جو خدا کو معشوق کہے اس کا چہرہ کیوں کر دیکھوں۔"

(دہلی کے اکابر صوفیہ : مشمولۂ معارف دسمبر ۹۰ء' ص ۴۱۷)

(۲) حضرت سلطان جی (نظام الدین محبوب الٰہی) سے کسی نے پوچھا کہ آپ میں اور حضرت محبوب سبحانیؒ میں کیا فرق ہے؟ تو فرمایا "وہ بیاہی تھے میں آنکھ لگی ہوں۔" "حضرت شاہ آفاقؒ" نے اس میں نکتہ بیان فرمایا'

آنکھ لگی میں ایک چوٹ ہوتی ہے کہ بیاہی میں نہیں ہوتی۔"

(سلسلۂ چشتیہ کے امتیازات : مشمولۂ معارف ۹۰ء ص ۱۹۸)

(۳) حضرت جنیدؒ بغدادی فرماتے ہیں کہ "میں نے ایک نو عمر لڑکی کو دیکھا کہ وہ طواف کر رہی ہے اور یہ اشعار گا رہی ہے۔ (جس کا ترجمہ اس طرح ہے):

"میں نے اپنے عشق کو کتنا چھپایا مگر اب وہ کسی طرح مخفی نہیں رہتا۔ اب تو اس نے کھلم کھلا میرے پاس ڈیرا ڈال دیا ہے۔ جب شوق کا مجھ پر غلبہ ہوتا ہے تو میرا دل اس کے ذکر سے بھڑکنے لگتا ہے اور اگر میں اپنے محبوب سے قربت چاہتی ہوں تو وہ فوراً مجھ سے تقرب کرتا ہے اور جب وہ ظاہر ہوتا ہے تو میں اس میں فنا ہو جاتی ہوں اور وہ میری حاجت روائی کرتا ہے۔ حتیٰ کہ میں خوب لذت پاتی ہوں اور مزے میں آجاتی ہوں۔"

انسانی جذبات کے حامل ان اشعار میں حضرت جنیدؒ کو تلذذ جنسی کی کیفیت نظر آئی تھی اس لئے انہوں نے لڑکی کو ٹوکتے ہوئے کہا تھا "اے لڑکی! تو اللہ سے نہیں ڈرتی 'ایسی بابرکت جگہ ایسے شعر پڑھتی ہے۔" (فضائل حج ص ۱۷۲)

ان واقعات میں اگرچہ یک گونہ جنسیت کی جھلک عیاں ہے 'لیکن یہ باور کر لینا چاہئے کہ لذائذہ بہیمہ سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں۔ ہاں مخالف اجناس میں ایک دوسرے کے لئے کشش ہوتی ہے اور یہ سب شوق و دل بستگی ایک دوسرے کے لئے ہوتے ہیں۔ اس لئے صوفیائے کرام نے عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ قرار دیا ہے اور نصوص و سنن کی شرط لگا کر اباحت کے دائرے میں جگہ دی ہے تاکہ سالک کا عشق باللہ بالیدہ و متفرع ہو۔ ان واقعات کی روشنی میں حضرت بایزید بسطامیؒ کی "عرائس اللہ" کی اصطلاح بڑی بامعنی نظر آنے لگتی ہے کچھ بعید نہیں کہ صوفیانہ شاعری میں خدا کی ذات کو "عاشق" سمجھنے کی روایت میں یہی جذبہ کار فرما رہا ہو۔

اردو کی قدیم صوفیانہ شاعری میں اس نوع کی وافر مثالیں ملتی ہیں۔ پیو اپیا ا پریتم ا سکھا اسائیں ا گسائیں ا ساجن وغیرہ مذکر القاب خدا کے لئے استعمال کئے گئے ہیں اور اسکے فراق میں تڑپتے رہنے کی نسائی کیفیت کو صوفی شعراء نے اپنے اشعار میں قلم بند کیا ہے۔ صوفیانہ طرز میں ایسے حمدیہ اشعار ذیل میں بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔ قدیم اردو کے شعری محاسن سے معرّیٰ اشعار طبع لطیف پر گراں اور باعثِ انقباض نہ ہوں اس لئے مشتِ چند پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اردو کی قدیم صوفیانہ شاعری میں شیخ بہاء الدین باجن (م ۱۳۸۸ء) کا کلام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے کلام کی جب سے بازیافت ہوئی ہے اردو ادب کی تاریخ کو ایک نیا موڑ ملا ہے۔ پروفیسر

شیرانی، جمیل جالبی اور ڈاکٹر فرید کی محنت شاقہ کو اس معاملے میں کافی دخل ہے۔ باجن کی زبان غیر مانوس ہے اور طرفہ یہ کہ ابہام کا رنگ غالب ہے۔ تصوف کے نکات کو شاعر نے "عقدہ" "کور" "یمن" میں بیان کیا ہے۔ خدا کی ثنا خوانی میں دیکھئے باجن کے اشعار میں کیسی نسائیت ٹپک رہی ہے۔

منہ بھر لیسوں تیرا ناؤں

کریم و رحیم تیرا ناؤں

تجہ ناؤں کی میں ہوئی واری جاؤں

"واری جانا" عورتوں کا محاورہ ہے۔ نحوی ساخت کے لحاظ سے آخری مصرع میں فاعل "میں" کی ضمیر، ضمیر تانیث ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ شاعر موصوف بہ محبت اپنے تیئں عورت خیال کرتے ہیں۔

صوفیوں کے یہاں اوراد و اذکار میں "ذکر اللہ" کی بڑی اہمیت ہے۔ صوفی صادق ساری زندگی موت آنے تک ذکر اللہ کو اپنا شعار بنائے رہتا ہے۔ کثافت باطنہ کو زائل کرنے اور نفس و قلب کے تزکیہ کے لئے صوفیائے کرام ذکر خفی ذکر جہری، دو حلقی، سلطان الاذکار اور حبس دم وغیرہ کا اہتمام کرتے ہیں تاکہ اللہ کی یاد سے کوئی لمحہ غافل نہ رہ سکے۔ حضرت معاذ کو حضور ﷺ نے فرمایا تھا "ان تموت ولسانك رطب من ذكر الله" یعنی "اس حال میں تیری موت آئے کہ اللہ کے ذکر میں رطب اللسان ہو۔" یہ تمام اعمال میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین عمل ہے۔ اس حدیث کی روشنی میں مذکورہ بالا باجن کے مصارع کتنے بامعنی محسوس ہوتے ہیں۔ محاسن شعری سے عاری ہونے کے باوجود سالک کے لئے ان میں درس کا خزانہ چھپا ہے۔

باجن اپنے ساجن / متوا کے منتظر ہیں جو دور دیس میں ہے۔ وہ فراق یار میں تڑپ تڑپ کر اسے بلا رہے ہیں۔

؎ متوا آؤ گھری توں کب لگ رہے بدیس

کیوں کہ بیلوں اور درختوں پر بہار کا شباب آگیا ہے۔ تیری محبت میں، میں راتوں میں آنسو بہا رہی ہوں۔ میں نے تو پھولوں کی سیج بھی سجادی ہے اور تیرا انتظار کر رہی ہوں۔

باجن جیھوں ساجن پاؤں پھولوں سیج بچھاؤں ری

نینہ ستیں باٹ بہاروں پاؤں جو میں جلی جاؤں ری

باجن کا یہ جذبہ جنسیت بڑھ کر بھوگ ولاس تک پہنچ جاتا ہے اور وہ کہہ اٹھتے ہیں۔

یہ جیو دیسوں یہ جیو دیسوں نس دن تم سنگ بھوگ کریسوں

باجن عشق الٰہی میں سرشار ایسے "اتاولے" ہو گئے ہیں کہ دن رات اس کی ذات سے لذت

حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس لئے بھی کہ ان کے پاس ۔

ساجن تجہ بن دونیا جگ چنت ناہیں کوئی

حمدیہ شاعری میں نسائی جذبات کی عکاسی کی روایت کو قاضی محمود دریائی (م ۱۵۳۴ء) نے آگے بڑھایا ہے۔ ان کے سارے کلام میں فراق زدہ معشوق کو اپنے "پی" سے ما [illegible] ہے۔ فراق میں تڑپتی ہوئی "پیاری" اپنے "پی" کے درشن کے لئے ساری رات جاگ کر گزارتی ہے وہ اس لئے بھی کہ اس کے "پیا" کو نہ نیند ہے نہ "اونگھ" "جب" "پیا" ایسا ہو تو پیاری کیوں کر سوئے؟۔۔

سوتے میت نہ پاوے کوئے

جس کے شہ کوں اونگ نہ آوے

سو دھن کیوں سو رین گنوائے

یہاں "شہ" سے مراد اللہ رب العزت کی ذات ہے۔ جس کا وصف یہ ہے کہ "لاتاخذہ سنة ولا نوم" (بقرہ) جب وہ نہیں سوتا یا اسے اونگھ نہیں آتی تو پھر اے سکھی! سو کر ہم کیوں رات گنوائیں۔ قاضی محمود دریائی کے یہاں وصل کی خواہاں "پیاری" کے جذبات جا بجا حمدیہ اشعار میں بکھرے ہوئے ہیں جن میں ہندوی رنگ غالب ہے۔

اس ادبی روایت کی پیروی کرنے والے شیخ علی محمد جیو گام دھنی (م ۱۵۶۵ء) کا کلام "اسرار اللہ" کا ترجمان ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب "جواہر اسرار اللہ" میں ویدانت اور اسلامی تعلیمات کے سہارے اسرار اللہ کی عقدہ کشائی کرنے کی سعی کی ہے۔ وہ مشکل پسند شاعر ہیں اور تصور کے ادق مسائل کو اشاروں کنایوں میں بیان کرنے کی وجہ سے ان کا کلام اور بھی زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ ان کے یہاں خدا کی حمد و ثنا کے گیتوں میں نسائی جذبات کارفرما دکھائی دیتے ہیں۔ عورتوں کی زبان، محاورے اور ضرب الامثال کے استعمال سے ان کی شاعری میں نسائیت عود کر آئی ہے۔

یہ جیو تو رہتا نہیں ہور من دوکھ سہتا نہیں

مجہ جگ کے جمتا نہیں پیو باج مجہ گمتا نہیں

وہ اپنے پیا اور سائیں کو دیکھ کر اس پر اپنی جان قربان کرتے ہیں اور اس کی "سیوا" کرتے ہیں۔

تم رے پیا کوں دیکھوں جیسا

ہور جیون پر تھوں سائیں ایسا

سیویں تمہیں ہونا توہ ویسا

محمد جیو گام دھنی کی شاعری کا خاص موضوع وحدة الوجود ہے۔ عورتوں کی زبان میں انہوں نے اسے مختلف پیرائے میں بیان کیا ہے۔

آپس کوں توں پیو پچھانے پیو کوں توں دور جائیں
تو کیوں پاوے یو من آنے شاہ علی جیو پیو پچھانوں
علی محمد دوئی نجانوں ایک وجود ہے من یو آنوں

صوفیوں کے یہاں "چار وجود" اور ان کی منازل کا تصور ہے۔ واجب الوجود، ممکن الوجود، ممتنع الوجود اور عارف الوجود۔ عارف الوجود کی راہ معرفت اور منزل لاھوت ہوتی ہے۔ یہاں پہنچ کر سالک کو فنا فی الفنا نصیب ہوتی ہے۔ سالک اپنی ذات کو مشاہدۂ حق میں محو کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے جائے "تو" کے "میں" ہی "میں" نظر آنے لگتا ہے۔ جیو گام دھنی اپنے پیو کو اسی منزل پر تلاش کرتے ہیں تو حالت یوں ہو جاتی ہے۔

ڈھونڈن نکلی پیو کوں' اپس گئی سو کھوے
جیدھر دیکھوں سو ایک ہوں' مج بن اور نہ کوے

میر درؔد نے اس خیال کی توضیح بڑے نرالے انداز میں کی ہے۔ کہتے ہیں۔

واہ واہ! قسمت کی مجبوری کو دیکھا چاہئے وہ ہوا بے پردہ' تب ہم اس کو "ہم" کہنے لگے

غالبؔ نے بھی ۔ "اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے' میں اسی نکتہ کو بیان فرمایا ہے۔ "مشاہدۂ حق کی گفتگو" کا یہ انداز جس میں تخاطب عورت کی جانب سے ہے بڑا دلآویز ہے۔ "تلاش یار" میں جوگن بن کر نکلنے کی سماجی ریت ہندوستانی معاشرت کا جزو رہی ہے۔ اس "ریت" کو ہمارے صوفی شعرائے نے "شدید محبت" کی علامت پر استوار کیا ہے اور اپنے اشعار میں اسی مفہوم میں اس کے استعمال کو روا رکھا۔ چنانچہ علی محمد جیو گام دھنی کی متابعت میں حضرت شاہ نیاز بریلویؒ بھی جوگن بن کر اپنے "پی" کو ڈھونڈھنے نکل جاتے ہیں۔

جوگنیا کا بھیس بنا کر پی کو ڈھونڈھن جاؤں
نگری نگری دوارے دوارے پی پی ہند سناؤں

لیکن "پیو" جب پاس ہی ہو تو پھر یہ تلاش کیسی؟ شاہ ابوالحسن قادری نے "سکھ انجن" میں "پیو" کے قرب کو قرآنی زبان میں سمجھایا ہے۔

تیرا شہ رگ تے پیو ہے پیو کوں پاتا سو جیو ہے

شاعر کا اشارہ یہاں "نحن اقرب الیہ من حبل الورید" کی طرف ہے۔

- اللہ تعالیٰ شہ رگ سے قریب تر ہونے کے باوجود شیطانی وساوس اور نفسانی خواہشات کی اتباع میں بندۂ خدا سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ دنیا کے چھل کپٹ اسے خدا سے دور کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہاں! جب بندہ ان تمام دکھوں سے نکل کر خدائے برتر کی طرف رجوع ہوتا ہے تو یہ دوری اسے بڑی شاق گزرتی

ہے۔ ہجر کی تکلیف میں وہ رونے لگتا ہے۔ ہر آنسو میں وہ خدا کی "چھب" کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ بندے کی یہ کیفیت اللہ کو بڑی پسندیدہ ہے۔ ندامت کا ہر آنسو اس کے نزدیک موتی سے زیادہ قیمتی ہے۔ شانِ کریمی ایسے آنسوؤں کو سمیٹ لیتی ہے۔ سراج بھی ہجر زدہ زندگی میں اپنے "پیو" کی یاد میں رو رہے ہیں۔ تڑپ رہے ہیں۔ انہیں ہر آنسو میں اپنے پیو کی شکل دکھائی دے رہی ہے۔ جیسے پانی میں مہتاب نظر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

ہر یک انجھوں میں میرے ظاہر ہے پیو کی صورت
پانی میں جیوں عیاں ہے مہتاب کا تماشا
تجھ ہجر کی اگن میں ہے اب سراج بیکل
آتش میں دیکھ آکر سیماب کا تماشا

غرض کہ اردو کی متصوفانہ حمدیہ شاعری میں شعراء نے مقامی رنگ اختیار کیا ہے۔ یہاں کی ادبی روایات' اساطیر اور صنمیات کے زیر اثر انہوں نے اسلامی اقدار کو پیش کرنے کی کوشش کی اور اپنی تعلیمات کو مؤثر بنا کر عوام تک پہنچایا۔ بندوں کا خدا سے رشتہ جوڑنے اور اس کی لَو میں لگانے کے لئے انہوں نے عشقِ مجازی کے انتہائی اساسی جذبۂ "جنسیت" کی قیاسی اساس پر "عشقِ حقیقی" کا قصر تعمیر کیا اور سالکان تشنہ کام کے دلوں کو عشقِ الٰہی سے معمور کیا۔ جنسیت زدہ اس مجازی عشق نے کہیں کہیں بوالہوسی اور امرد پرستی کے لئے راہیں بھی ہموار کرلیں اور بقول سید احتشام حسین "کہیں کہیں عاشق و معشوق کی صورتیں ضرور بدل دیں" لیکن مجازی عشق کو عشقِ حقیقی کی مہمیز بنانے کی اصل وجہ وہ نفسیاتی ردِّ عمل ہے جو مخالف جنس میں ایک دوسرے کو اپنی طرف "کھینچنے" کے لئے فطری طور پر پیدا ہو جاتا ہے۔ جسے ہم جنسی محبت کہتے ہیں۔ جنسی محبت فطری ہوتی ہے اور عقیدے کی محبت غیر فطری۔ یہ محبت ایمان سے جلا پاسکتی ہے۔ جہاں ایمان میں ضعف آیا یہ محبت کمزور پڑ جاتی ہے۔ اس کے برخلاف جنسی محبت قوت بہیمیہ پر موقوف ہے اور ہوس کی صورت میں آدمی کے اندر پروان چڑھتی ہے اس لئے قیدِ حیات تک آدمی کے ساتھ رہتی ہے۔ ایسی محبت اور میلان خدا کے تئیں ہو جائے تو بندے کو قربِ الٰہی نصیب ہو جاتا ہے۔ اہلِ طریقت کے یہاں یہی مقصدِ زندگی ہے۔ اس کیفیت کو پیدا کرنے کے لئے صوفیائے کرام نے مجازی عشق کو زینہ بنایا اور خدا سے کی جانے والی محبت کو نسائی انداز میں پیش کیا۔

پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی

حمدیہ شاعری پر تنقید

حمدیہ شاعری پر تنقید اپنے اندر بے حد نزاکتیں اور قباحتیں رکھتی ہے۔ ہم کسی حمد کو اچھے برے خانوں میں تقسیم نہیں کر سکتے۔ ایک حمد نگار کے ذہن و دل کی تمامتر صداقتیں اس کی کہی ہوئی حمد میں رچی بسی ہوتی ہیں۔ اس لئے ہم حمد کی تحسین ہی کریں گے۔ البتہ فن کے تلازمات کو سامنے رکھ کر یا مضامین و خیالات کی نوعیتوں کے پیش نظر ہم اس پر تنقید کر سکتے ہیں۔ اس میں خیالات 'زبان و بیان' مواد اور اسلوب کے معیار کی سطحوں پر گفتگو کریں گے 'نیز یہ کہ توحید خالص کے جو مسلمات و معتقدات ہیں کیا زیر تنقید حمد ان تقاضوں سے انحراف تو نہیں کرتی۔

حمدیہ شاعری پر تنقید میں سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ ہم کسی کو عقیدت اور اس کے دین و ایمان کو کسی پیمانے سے نہیں ناپ سکتے۔ ایک شخص جس نے کلمہ پڑھ لیا اور توحید و رسالت کا اقرار لسان و قلب سے کر لیا وہ لاریب مسلمان ہے اور اللہ کی توحید اور اس کی ذات و صفات پر بدرجۂ کامل اعتقاد رکھتا ہے سو جو حمد اس کی زبان و قلم سے نکلے گی وہ اس کی صداقت ایمانی کا مظہر ہو گی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس نے کن مضامین و خیالات اور افکار و معتقدات کو پیرا ہن شعر میں ادا کیا ہے۔ سب سے پہلے اس امر پر نظر ڈالنی ہو گی کہ کیا اس کے یہاں توحید خالص کا پورا ادراک و عرفان ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی خیال کے بہاؤ میں یا کسی بے احتیاطی کے سبب یا اتفاقاً اس سے ایسی بات ادا ہوئی ہو جو توحید خالص کے منافی ہے۔ مثلاً اللہ کی قوت و اختیار میں کسی کو شریک کرنا اور اللہ کے ساتھ ساتھ کسی اور ہستی سے استمداد۔ ایک شخص جو حمد کہتا ہے اور ایاک نعبد و ایاک نستعین کے تحت عبودیت اور استعانت میں صرف اللہ سے حاجت طلبی کا پابند ہے' اسی حمد میں یا کسی منقبت و مدحت میں کسی عبد یا بشر سے بھی طالب امداد ہوتا ہے اور گویا اسے صفات الٰہی میں شریک گردانتا ہے۔ ہمیں کسی حمد نگار کے ہر ہر حمد الٰہی کے علاوہ مجموعی طور پر اس کی تمام شاعری اور اس کے مجموعی معتقدات و مسلمات کو نظر میں رکھنا ہو گا۔ گویا توحید میں وحدہٗ لاشریک کے عقیدے کا شعری اظہار حمد کی شرط اولین ہے اور اسی مقام سے تنقید کا منصب اور فریضہ شروع ہو جاتا ہے۔ غیر مسلموں' خصوصاً ہندوؤں نے بھی حمدیہ شاعری کی ہے اور ان کے حمدیہ اشعار میں بظاہر توحید الٰہی کی صفات و مظاہر ہی کا بیان ہوتا ہے لیکن کیا اصل میں ایسا ہے کیا وہ عملاً اصنام پرستی اور مظاہر پرستی کے زنّاری نہیں ہیں' اور کیا وہ اللہ

تک رسائی کے لئے دوسری طاقتوں کی شرکت و توسل سے وابستہ نہیں ہیں؟ مشرکین عرب ارض و سما اور ہمہ کائنات و مخلوقات کا خالق اللہ ہی کو مانتے تھے لیکن وہ بتوں کو وسیلۂ حاجت روائی اور اللہ تک رسائی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ اگر کوئی مسلمان شاعر توحید خالص میں عقائد کی ایسی آمیزش روا رکھتا ہے تو کیا یہ محل تنقید نہیں ہے؟

اللہ کے پلڑے میں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ ہمیں لینا ہے لے لیں گے محمد ﷺ سے

کیا اس شعر میں بیان کردہ جوش عقیدت کو ہم خالص توحید پرستی کے منافی قرار نہیں دیں گے؟ اللہ کی ذات و صفات میں جہاں بھی استخفاف کا پہلو نکلتا ہو تنقید کا جواز ضرور پیدا ہو گا۔ اصل میں مسلک اعتدال یہ ہے کہ ہم اللہ انبیاء علیہم السلام کو لیائے کرام اور بزرگان دین کی عقیدتوں کو مختلف خانوں میں تقسیم کر دیں اور ان خانوں اور حدود کو نہ توڑیں بلکہ یوں کہنا زیادہ درست ہو گا کہ اللہ کو اختیارات اور قدرتوں کے کسی دائرے اور حد میں محدود نہ کریں کیونکہ وہ بے حد ہے اور تمام حدوں سے ماورا ہے۔ دوسری ہستیوں کو ان کے ان اختیارات کے دائروں میں دیکھیں جو عبدیت کا تقاضا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص اپنے مراتب روحانی کے ارفع مقامات پر ہو اس کے باوجود وہ اپنی حد توڑ کر اللہ کی بے حد و بے کراں ذات و صفات میں دخیل و شریک نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام جو بشری اور روحانی صفات کی انتہائی رفعتوں پر ہوتے ہیں ان کی بھی ایک حد قدرت و اختیار ہے۔ اس لئے عبدیت اور استعانت میں ان کی بھی شرکت باللہ کا وجود اور جواز نہیں ملتا۔

بے تکلفی، جرأت اور استہزائی لہجہ نہایت نامناسب اور قابل مواخذہ ہے۔ ہم مثالوں سے احتراز کرتے ہوئے یا ناموں سے گریز کرتے ہوئے ایسے لہجے کی نشان دہی کریں گے۔ ایسا لہجہ اختیار کرتے ہوئے جہاں بندہ دائرہ عبودیت اور حد ادب سے تجاوز کرتا ہے وہیں ایسے خیالات باندھتا ہے کہ حمد نعوذباللہ ہجو بن جاتی ہے۔ مثلاً قبر میں جب میرے منہ سے بادۂ دوشینہ کی بو آئے گی تو نکیرین بھاگ جائیں گے۔

☆ صوفی گوشہ نشین کا درجہ شہید سے بڑھ کر ہے کہ آں کشتۂ دشمن است و ایں کشتۂ دوست۔

☆ ارکان دین کی ادائی خصوصاً ادائے نماز کی کیا ضرورت ہے کہ وجود عاشقاں کلی نماز است۔

☆ دیر و حرم کو ایک ہی سطح پر شمار کرتے ہوئے حرمت و تقدیس حرم کی تخفیف۔

کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا۔ اس لئے کہ اس امید و بیم نے مجھے دو را ہے پر مارا یہ اللہ کی رحمت سے ناامیدی کا مضمون ہے۔

☆ رحمت کے بھروسے پر گناہ کئے جانا کہ وہ ذات غفور الرحیم ہے اور اس کا رسول شفیع المذنبین ہے۔ اس مضمون میں گناہ پر دیدہ دلیری اور استقامت نیز توبہ و ندامت سے گریز ہے۔

☆ خدا کے ہر جگہ جلوہ گر ہونے کے سبب حرم و بت کدہ ایک ہی شمع توحید کی دو روشنیاں ہیں۔

☆ راہرو جادۂ ہموار پر چلتا ہے اس لئے زنار باندھ لے اور سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال۔ (سبحہ: تسبیح' سبحان اللہ کے ورد کا ذریعہ) زمزم پر مے پی (دینی شعائر کی حرمت سے بے نیازی)

☆ احد اور احمد میں میم کا پردہ حائل ہے۔ (احدیت و بشریت کا ادغام)

☆ اعظم ماشانی اور انا الحق کے بارے میں صوفیانہ تعبیر میں جذب اور مغلوب الحال کے نعرہ ہائے مستانہ۔ اقبال کی رائے میں "اگر فردے بگوید سرزنش بہ"

☆ حمد یا شکر ہے یاد عا و مناجات۔ اللہ سے شکوہ و شکایت کا کیا جواز؟ پھر شکایت میں حد سے تجاوز؟ براہ راست اسے ہر جائی کہنا۔ نیز تو بھی تو دلدار نہیں تک کہہ جانا اس کی شان رزاقی کو کسی سیاق میں خنکی میں بدل دینا۔ ~ شکوہ بے جا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور۔

☆ جور فلک گردش تقدیر اور ستم روزگار کا شکوہ جو اصل میں اللہ ہی کی بالواسطہ شکایت ہے کیونکہ فلک 'تقدیر' زمانے اور وقت کا وہی خالق ہے۔ خصوصاً تقدیر و قسمت کی ناسازگاری پر اللہ سے شکوہ سنجی' جو شکر و صبر اور توکل کی اعلیٰ صفات کے منافی ہے۔

☆ تمام شادمانیوں کامرانیوں اور ظفر مندیوں کو اپنے عزم و ہمت کے نتائج قرار دینا اور تمام ناکامیوں کو منجانب اللہ سمجھنا اللہ کی حکمتوں سے ناواقفیت اور کوتاہی عقل کی دلیل ہے۔

☆ اللہ کو مادی صورت میں محسوس کرنا یا صفات بشری کو اس سے منسوب کرنے کی جسارت اس کی توحید اور تنزیہہ کے برعکس ہے اور ایک طرح سے شرک کی تعریف میں آتی ہے۔ مثلاً کعبے کو کالا کوٹھا قرار دے کر اللہ کا اس کے اندر سے حاجیوں کی کاروباری مصروفیات و اشغال میں دیکھ کر کڑھنا (اللہ کی تحدید و تقیید اور انسانی سطح پر اس کے حواس کا عمل)

ولی محمد رازی کی تحریر کا ایک اقتباس یہاں بے محل نہ ہو گا:

"میرے خیال میں حمد گوئی کا سب سے بڑا ادب یہی ہے کہ ہم خالق کائنات کی تعریف کرتے وقت ذات و صفات کی اسی تعریف تک محدود رہیں جو قرآن و سنت نے ہمیں تعلیم دی ہے۔ اگر ہم اپنے ناقص علم اور محدود عقل کی روشنی میں ان صفات کی تعریف کریں جو ان دونوں کی حدود سے ماورا ہیں تو ہماری مثال اس گنوار کی سی ہو گی جو اپنی جھونپڑی میں بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا کہ اللہ اگر تو میری جھونپڑی میں آجائے تو میں تجھے حقہ پلاؤں گا۔ تیرے پاؤں دباؤں گا۔ تیرے سر پر تیل لگاؤں گا۔ اور تجھے سامنے بٹھا کر پنکھا جھلوں گا۔ ان تمام تعریفوں کے پیچھے جذبہ وہی ہے جس کا نام حب الٰہی ہے مگر اس جذبے کے اظہار کے لئے اس سادہ

لوح شخص نے محض اپنی محدود عقل اور ناقص علم پر اعتبار کیا۔" (محمد ولی رازی' ص ۱۴۳ 'خزینۂ حمد)

☆ من بد کنم و تو بد مکافات دہی۔ پس فرق میان من و تو چیست بگو؟
(اللہ کو انسان بلکہ گناہ گار انسان کے ہم سطح بنانے کی جسارت)

☆ مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال۔ لیکن اس مستانہ روی کی جرأت ان خیالات میں نہیں ہونی چاہئے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اللہ کی ذات و صفات تک پہنچتے ہوں اور اس کی الوہیت' قدرت' حکمت اور شان و عظمت کا استخفاف ہوتا ہو۔

"باخدا دیوانہ باش" کا نعرہ بھی خیال کی مستانہ روی اور لغزش ہی ہے۔
بارگاہِ احدیت ہو یا دربار رسالتؐ دونوں ہی انتہائی حزم و احتیاط اور ادب و احترام کا تقاضا کرتے ہیں۔ اور خیال یا زبان و بیان کی ذرا سی لغزش بھی انسان کو بطش شدید کی گرفت میں لا سکتی ہے۔

نئے نئے علوم و فنون اور انسان کے عقلی تجربوں کے ثمرات سامنے آرہے ہیں۔ وقت کی رفتار آگے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ہمارا عہد ادوار قدیم کے احوال و مسائل سے مختلف ہے۔ سائنسی طرز احساس کے سبب آج کے لوگوں کا انداز فکر قدما سے تمامتر یکساں نہیں۔ بہت سے افکار و معاملات بدل چکے ہیں۔ ادب بھی ارتقاء پذیر ہے۔ نئی سوچ اپنے اظہار کے لئے نئے نئے سانچے مرتب کر رہی ہے۔ ضروری ہے کہ حمد بھی اپنی روایت کے عطر و انتخاب کے ساتھ عہد نو کے جدید مسائل اور موضوعات کا احاطہ بلحاظ فکر و فن کرے۔ آج جو حمد گزار پرانے انداز و اسلوب کو لے کر چلے گا اور ان مسائل و مفہمیات کی تکرار کرے گا جو عہد کہن کے قصہ ہائے پارینہ بن چکے ہیں وہ اپنے لئے حلقۂ قارئین پیدا نہ کر سکے گا۔ سو حمد میں فکر و فن کے ارتقاء کا پرتو آنا چاہئے۔

ہم نے اس گفتگو میں جو مثالیں پریشاں خیالی اور ذہنی کج روی کی دی ہیں ان میں سے کئی باتیں کہی ہوئی حمدوں سے پیش نہیں کی گئی۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ ایک مسلمان شاعر کے اجتماعی معتقدات درست ہونے چاہئیں۔ اگر وہ غزل میں راہ استقامت سے ہٹ کر گمراہ کن خیالات لاتا ہے تو قدرتی بات ہے کہ اس کی حمد میں بھی اس فکری سمجھ کی جھلک آسکتی ہے۔ شخصیت اور شاعر کا تعلقِ آئینہ و عکس جیسا ہے۔ اس لئے وہ جن بھی اصناف میں بشمول حمد' اشعار کہے اس کی شخصیت ریزہ ریزہ ہو کر نہیں بلکہ مجتمع ہو کر عکس پذیر ہو۔

جو بے احتیاطیاں اور بے اعتدالیاں ہم نے اوپر ذکر کی ہیں وہی کسی حمد کی نوعیت اور قدر و قیمت کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے معیار کے خطوط متعین کرتی ہیں۔ قرآن و حدیث سے بے خبری نہ ہو' حمد گزار قرآنی احکام اور حدیث و شرع کے خلاف کوئی بات نہ کہے۔ حمد کہتے ہوئے نہایت دینی بصیرت کی ضرورت

ہے۔ مبادا بے خبری میں کسی حکم کی خلاف ورزی ہو جائے۔ ایسی تاویلات سے بھی بچنا چاہئے جو قرآنی مزاج سے متصادم ہوں۔ اس سلسلے میں عربی زبان کی لغت و قواعد سے آشنائی بھی حمد گزار کو معنوی اغلاط سے بچاتی ہے۔ قرآن کی کسی آیت یا حدیث کو شعر میں استعمال کرتے وقت سلامتی وزن کا خیال رہے ایسا نہ ہو کہ کوئی لفظ یا حرف زیر استعمال بحر میں پوری طرح نہ آئے اور معنوی تحریف واقع ہو جائے۔ مثلاً کان' وزن میں کا نہ آئے' یا قل ھواللہ احد میں اللہ کے بعد ضمہ (ھو) کی صورت میں ادا ہو رہا ہو۔

☆ عجز و تضرع بے حد لازم ہے۔ اس کی کبریائی کے سامنے ہم نقطۂ موہوم بلکہ شئے معدوم ہیں۔ حمد کسی نمود تعلّی یا قد افزائی کا مقام نہیں ہے۔ حد درجے کی عاجزی اپنے لہجے اپنے مضمون اور اپنی دعا میں برتنی چاہئے۔ وہ خالق ہم مخلوق' وہ رازق ہم مرزوق' وہ قادر ہم مجبور' وہ باقی ہم فانی' سو نمود ذات چہ معنی دارد۔ اپنی کہی ہوئی حمد پر افتخار و نازش بھی موزوں نہیں بلکہ مقام شکر ہے کہ اس نے ایک عاجز و ہیچ مقدار کو توفیق ستائش عطا فرمائی۔

☆ حمد و ثنائے الٰہی محض اخلاص نیت اور سچائی کی بنیاد پر ہونی چاہئے۔ ستائش اور صلے سے بے نیاز۔ یہ نہیں کہ وسائل ابلاغ سے شہرت طلبی کی نیت سے کہی جائے یا انعامی مقابلے میں شامل کی جائے تاکہ کوئی ایوارڈ یا انعام ملے یا مشاعرے میں اس لئے پڑھی جائے کہ داد و تحسین کے ڈونگرے برسیں اور غرور نفس یا احساس تفاخر پیدا ہو۔ حمد تقاضائے عبدیت ہے۔ اللہ کی ستائش' ذکر' ثناء' مناجات' دعا ہمارا منشائے بشریت ہے۔ اللہ اسے قبول فرمائے۔ صرف یہی صدق نیت حمد میں تاثیر و برکت پیدا کرتا ہے۔

☆ فنّی اعتبار سے اپنی تمامتر استعداد و لیاقت کو کام میں لا کر حمد کی تخلیق کرنی چاہئے۔ سوچنا چاہئے کہ اللہ تمام علوم و فنون' آگاہی و خبر اور شعور و آگاہی کا خالق ہے۔ اس کا کلام قرآن' فصاحت و بلاغت اور ادب و انشا کی اس منتہا پر ہے جس کی کوئی نظیر ممکن نہیں۔ تمام فصحائے عرب سورۃ الکوثر کے جواب میں اس پائے کا ایک جملہ نہ لکھ سکے اور ماھذا البشر کہہ کر اپنے عجز علمی کا اعتراف کر لیا۔ ایسی ذات اقدس کے لئے حمد کہنے میں زبان' بیان' پیرایۂ اظہار' کی ممکن لطافتوں اور خوبیوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ جذبے کی تقدیس' خیال کا علو' مضمون کی رفعت اور لفظ سے معنی تک جمالیات فن و ادب کے تمامتر تلازمات کو بقدر استعداد اور حد صلاحیت برتنا چاہئے۔ جب ایک شاعر ایک محبوب مجازی کے لئے غزل کہتے ہوئے اور کسی سلطان و امیر کے لئے قصیدہ کہتے ہوئے سارے کمالات صرف کر دیتا ہے تو اللہ کی اعلیٰ و ارفع ہستی تو اس امر کی سزاوار ہے کہ اس کی بارگاہ علا میں جو نذرانۂ عقیدت پیش کیا جائے وہ کمالات و جمالات کا ایک مرقع کامل ہو۔

ڈاکٹر سید وقار احمد رضوی

حمد و مناجات ہندی اور اردو ادب میں

اللہ تعالیٰ جلّ شانہ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور اپنی خلافت کا تاج اس کے سر پر رکھا۔ تمام مخلوق کو انسان کے لئے اور انسان کو اپنے لئے پیدا فرمایا۔ اس لئے اس کی حمد و ثنا ہمارے اوپر واجب ہے۔ اگر عالمی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو مختلف زبانوں میں حمد و مناجات کے مضامین ملتے ہیں۔ چنانچہ عربی' فارسی' انگریزی' ہندی اور اردو میں جابجا حمد و مناجات کے اشعار ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر امیر خسرو کی فارسی شاعری کے علاوہ ان کی ہندی شاعری میں بھی حمد و مناجات کے مضامین ہیں۔ فارسی میں خالق باری اسی موضوع پر ہے۔ اس کے بعد ہندی ادب میں ملک جائسی نے اسلامی تصوف کو آگے بڑھایا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جائسی نے اپنی کتاب "پدماوت" کا آغاز ہی حمد و نعت سے کیا ہے۔ بھگتی تحریک کی چار شاخوں میں ایک شاخ پریم مارگی یا صوفیوں کا سلسلہ کہلاتی ہے۔ اس میں عشق الٰہی کے جذبات ہیں۔ اس سلسلے میں کبیر داس اور جائسی کی تصانیف میں اس تصور کی جھلک ملتی ہے۔ ہندی میں خدا ترسی کے رجحان کو فروغ دینے کے لئے جو تحریک پیدا ہوئی وہ بھگتی تحریک تھی۔ بھگتی تحریک عوامی تحریک تھی۔ اس میں برہموں کے کٹر جذبات کو جگہ نہیں ملی۔ اس تحریک کا کہنا تھا کہ جس کے دل میں خدا موجود ہو اس کو مندر میں جانے کی ضرورت نہیں لیکن اس تحریک نے کھل کر بت پرستی کی مخالفت نہیں کی۔ بھگتی تحریک کا مقصد عوام میں روحانیت اور مذہب کے بارے میں سوئی ہوئی عقیدت کو جگانا تھا۔ ہندی میں بھگتی تحریک ایک ایسے خدا کا تصور پیش کرتی ہے' جو انسانوں سے محبت کرتا ہے۔ وہ عقیدت الٰہی اور عشقِ خداوندی پر زور دیتی ہے۔ چنانچہ کبیر داس اور بابا فرید کے دوہوں میں اس تصور کی جھلک ملتی ہے۔ کبیر داس نے ہندی ادب کو حمد و مناجات سے روشناس کرایا۔ ان کی شاعری میں اسلامی تصوف کا اثر صاف ظاہر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کبیؔر کی تعلیم میں اسلام کا اثر غالب ہے۔ انہوں نے مندر میں رہنے والے بھگوان کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ خدا دل میں رہتا ہے۔ ان کا کہنا تھا جو آدمی سب سے محبت کرتا ہے اور سچے دل سے خدا کی عبادت کرتا ہے وہ عابد و مناجات گذار ہے۔ اس لحاظ سے کبیر کا مسلک حیات نیا تھا۔ وہ جگہ جگہ عشقِ الٰہی کے مضامین باندھتے ہیں۔ اسی طرح ہندی میں نرگن بھگتی کے فلسفہ پر اسلامی تصوف اور وحدت خداوندی کی گہری چھاپ ہے۔

ہندو ناتھ پنتھیوں نے وحدت الوجود اور تصوف کی ایک خاص روایت کو رواج دیا۔ اسلامی تصوف سے مل کر نرگن واد کا فکری تانا بانا بنا۔ نرگن واد یعنی خدائے بے ہمتا و لاشریک کا موضوع کبیر داس سے شروع ہوتا ہے۔ غرض عشق و محبت کا جو تصور ہندی ادب میں ہے وہ تمام تر اسلامی تصوف کے زیر اثر ہے۔ اکبر بادشاہ کے عہد میں عبدالرحیم خانِ خاناں کی ہندی شاعری میں حمد و مناجات کے اشعار ملتے ہیں۔

عبدالرحیم خانِ خاناں کا شعر ہے ۔

رحیمن دا ہے پریم کے 'بجھ بجھ کے سلگا ہیں	جے سلگے تے بجھ گئے' بجھے تے سلگے ناہیں

جو چیز سلگتی ہے وہ بجھ جاتی ہے اور جو بجھ جاتی ہے وہ سلگتی نہیں۔ مگر عشقِ الٰہی کی آگ بجھ بجھ کے سلگتی ہے۔ عبدالرحیم خانِ خاناں کی طرح رسکھان بھی مسلمان ہندی شاعر تھا اس کا پورا نام سید ابراہیم تھا۔ رسکھان کی زبان کو ہندی ادب میں کسوٹی مانا جاتا ہے۔ اسکی ہندی شاعری میں حمد و مناجات کے اشعار سوز عشق اور درد و تپش لئے ہوئے ہیں' رسکھان کی حمد و مناجات میں اس قدر کیف واثر ہے کہ آج بھی ہندو لوگ صبح کی عبادت میں بھجنوں کے طور پر گاتے ہیں۔ اس طرح ایک مسلمان ہندی شاعر کی حمد و مناجات کے الفاظ مندروں کے در و بام پر گونجتے ہیں۔ کبیر کی طرح گرونانک نے بھی ایک خدا کی عبادت کے گیت گائے انہوں نے روحانی ہم آہنگی کے ساتھ حمد و مناجات لکھی۔ نانک نے ہندی شاعری میں وحدت الوجود کو عنوانِ شاعری بنایا۔ ان کا شعر ہے ۔

رتن پدارتھ گٹ ہی ما ہے	جے کارن تٹ تیرتھ جاتے

جس کی خاطر لوگ تیرتھوں پر جاتے ہیں۔ وہ خدا تو تمہارے دل میں موجود ہے۔ وہیں تلاش کرو۔

اس طرح ہندی شاعری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندی شاعری میں حمد و مناجات کا ذخیرہ ہے اور یہ کہ ہندی شاعری نے اس کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کی سبب یہ ہے کہ حمد و مناجات سے انسان کو روحانی سکون اور ذہنی یکسوئی ملتی ہے۔

جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے تو ہندی سے زیادہ وجد آور نغمات اردو شاعری میں ملتے ہیں۔ اردو شعراء کے دواوین حمد و مناجات سے بھرے پڑے ہیں چنانچہ سراج اورنگ آبادی کی کلیات میں سے حمد و مناجات کے اشعار سنئے۔

پہلے حمد کے اشعار ۔

کہ سب ہے نفی اور واثبات ہے	عجب قادر پاک کی ذات ہے
ظہور تجلی ہویدا کیا	بلندی و پستی کون پیدا کیا
فلک پر ستارے کیا خوشنما	دیا چاند سورج کو نور و ضیاء
جتے عیب ہیں سب سے بے عیب ہے	عجب واقفِ عالمِ غیب ہے

دو جگ کا وہ پیدا، کر نہار ہے ۔ اسی کو بزرگی سزاوار ہے
بجز ذاتِ حق نہیں کسی کو بقا ۔ وہی ہے بقا، ماسوا سب فنا

سراج اورنگ آبادی کے مناجات کے اشعار سنئے :-

الٰہی! مجھے درد بے داغ دے ۔ مرے چشم میں کحلِ ما زاغ دے
صفِ عاشقاں میں نہ کر منفعل ۔ رواں کر مرے چشم سیں خون دل
عطا کر مجھے اشک گرم، آہ سرد ۔ غم عشق میں مج کوں دے رنگ زرد
اگر گناہ گار ہوں رحم کر ۔ گناہوں پہ میرے نہ کر توں نظر
الٰہی مجھے محرم راز کر ۔ خزانے حقیقت کے سب باز کر

حمد و مناجات کا تعلق فرد سے بھی ہے اور اجتماع سے بھی۔ ایک حمد و مناجات فردی ہوتی ہے اور ایک حمد و مناجات اجتماعی ہوتی ہے۔ فردی حمد و مناجات وہ ہے جو نالۂ نیم شبی اور فغان سحر گاہی میں ہوتی ہے۔ اجتماعی حمد و مناجات وہ ہے جو نماز میں اور نماز سے باہر اجتماعی شکل میں کی جاتی ہے۔ دراصل شریفانہ جذبات کو زندہ رکھنے کے لئے حمد و مناجات کی ضرورت ہے۔ اس سے انتشار کی کیفیت دور ہوتی ہے۔ یہی چیز انسان کو اعلیٰ منزلوں تک لے جاتی ہے۔ اور اسی سے اعلیٰ اخلاق و کردار کی نمو ہوتی ہے۔ زندگی کا محور و مدار حمد و مناجات ہے۔ فرد اللہ کے وجود سے آنکھیں بند کر کے نہیں رہ سکتا۔ اسے اپنی ضرورتوں کی تکمیل اور قلبی طمانیت کے لئے حمد و مناجات سے واسطہ رکھنا پڑتا ہے۔ انسان کی انفرادی اور اجتماعی و سماجی زندگی میں حمد و مناجات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

انسانی تاریخ زندگی کے ارتقاء کی داستان ہے۔ تاریخ کے اسلامی نظریے کے مطابق اسلام سے قبل جو انبیاء ہوئے ان سبھوں کی حقانیت کو ماننے پر اس لئے زور دیا گیا تا کہ یہ ثابت ہو کہ نئی تہذیب کسی نہ کسی پرانی تہذیب کی تہوں پر اپنی تہہ جماتی ہے اور اس کی بنیادوں پر اپنی عمارت کھڑی کرتی ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ مقاصد اور عمل پیہم کے ذریعہ اپنی انا کو ایک مرکزی نقطے پر مجتمع کرے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان حمد و مناجات کے موافق اپنی زندگی کی تشکیل کرے۔ انبیاء علیہم السلام پر جو کتابیں نازل کی گئیں ان میں زیادہ تر حمد و مناجات ہے۔ مثال کے طور پر زبور دعاؤں یعنی حمد و مناجات کا مجموعہ ہے۔ صحف ابراہیمی دعاؤں کا گنجینہ ہے اور قرآن مجید کا دیباچہ الحمد سے شروع ہوتا ہے۔ دراصل اسلام میں تخلیقِ کائنات کا اصل مقصد انسان ہے اور تخلیقِ آدم کا مقصد عبودیت الٰہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات کو انسان کے لئے پیدا کیا اور خود انسان کو اپنی عبودیت کے لئے پیدا کیا۔ اگر اس نقطے کو ذہن نشین کر لیا جائے تو حمد و مناجات کا مطلب آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ مجلسی زندگی ہو یا گھریلو زندگی، سیاست ہو یا معیشت، سماجی، معاشرتی اور قومی معاملات ہر موقع پر مسلمانوں کے ملی تشخص کو جو چیز برقرار رکھتی ہے وہ حمد و مناجات

ہے۔ چنانچہ ہر نماز سے الحمد للہ کو اسی غرض سے شروع کیا جاتا ہے۔

حمد و مناجات کے جو اوصاف ہیں۔ ان میں سب سے بڑھ کر توحید کا اقرار ہے۔ مفلسی میں خدا کی راہ پر جمے رہنا، امن و سلامتی کی دعا کرنا اس میں شامل ہے۔ اس لحاظ سے حمد و مناجات ایک مقصدی اور نظریاتی چیز ہے۔ اگر مومن پر کوئی مصیبت اور پریشانی آتی ہے تو وہ حمد و مناجات سے اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ اسی طرح جب دنیا اس کی طرف اپنی آسائش اور مال و متاع کے ساتھ آتی ہے تو وہ اس پر حمد کے ذریعہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ حمد و مناجات کا مقصد اللہ کی اطاعت کرنا ہے۔ اللہ کی اطاعت محض ایک خشک قانون اطاعت یا صرف محدود جذبۂ اتباع و پیروی کا نام نہیں بلکہ حمد و مناجات نام ہے اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کے سامنے سر بسجود ہونے کا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حیثیت اتنی بلند، اتنی عظیم اور اتنی ہمہ گیر ہے کہ حمد و مناجات اسی کے لئے زیب دیتی ہے یہی وجہ دوسری زبانوں کی طرح اردو شاعروں نے اپنے دواوین اور کلیات کا آغاز حمد سے کیا ہے۔ چنانچہ اردو کے کلاسیکی شعراء کے حمدیہ اشعار سنئے۔

سب سے پہلے امام بخش ناسخ کا حمدیہ شعر سنئے۔

بیعت خدا سے مجھ کو ہے بیواسطہ نصیب ۔۔۔ دست خدا ہی نام مرے دستگیر کا

(کلیات ناسخ مطبع اودھ گزٹ لکھنو ص ا)

خواجہ میر درد کا حمدیہ کلام دیکھئے۔

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا ۔۔۔ حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

جس مسندِ عزت پہ کہ تو جلوہ نما ہے ۔۔۔ کیا تاب گذر ہوئے تعقل کے قدم کا

ہے خوف اگر جی میں تو ہے تیرے غضب کا ۔۔۔ اور دل میں بھروسہ ہے تو تیرے ہی کرم کا

(دیوان درد، مطبع نظامی ص ا)

استاد شیخ محمد ابراہیم ذوق کے حمدیہ اشعار سنئے۔

ہوا حمد خدا میں دل جو مصروف رقم میرا ۔۔۔ الف الحمد کا سا بن گیا گویا قلم میرا

رہا نام محمد ﷺ لب پہ یارب اول و آخر ۔۔۔ الٹ جائے بوقت نزع جب سینہ میں دم میرا

(دیوان ذوق مرتبہ محمد حسین آزاد مطبع اسلامیہ لاہور۔ ص ۵۱)

مرزا داغ کے حمدیہ اشعار دیکھئے۔

یہاں بھی تو وہاں بھی تو زمیں تیری فلک تیرا ۔۔۔ کہیں ہم نے پتہ پایا نہ ہرگز آج تک تیرا

صفات و ذات میں یکتا ہے تو اے واحد مطلق! ۔۔۔ نہ کوئی تیرا ثانی ہے نہ کوئی مشترک تیرا

(گلزار داغ مطبع تیغ بہادر لکھنؤ۔ ص ا)

داغ کی مناجات کا شعر دیکھئے۔

الٰہی نقش ہو کلمہ رسول' رسول اللہ کا دل پر	چلے کونین میں نام محمد ﷺ سے درم میرا

داغ کے مزید حمدیہ اشعار دیکھئے۔

عدوے سامری فن دیکھے اعجاز رقم میرا	عصائے موسوی ہے حمدِ خالق میں قلم میرا
برنگ بوئے گل ہے ہر نفس یاد الٰہی میں	قیامت تک بھرے گی دم نسیم صبح دم میرا
مجھے آباد کرتا ہے مجھے برباد کرتا ہے	خدایا دین و دنیا میں کرم ترا' ستم میرا

بہادر شاہ ظفر کے حمدیہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

مقدور کس کو حمدِ خدائے جلیل کا	اس جائے' بے زباں ہے دین' قال و قیل کا
پانی میں اس نے راہبری کی کلیم کی	آتش میں وہ ہوا چمن آرا خلیل کا
کیا پائے کنہ ذات کو اوس کی کوئی ظفر	واں عقل کا نہ دخل نہ ہرگز دلیل کا

(کلیات ظفر' نولکشور لکھنؤ۔ ص ۲)

مصحفی کے حمدیہ اشعار دیکھئے۔

نظارہ کردن دہر کی کیا جلوہ گری کا	یہاں کو عمر کو وقفہ ہے چراغ سحری کا
بندہ ہے ترا' مصحفی خستہ کو یارب	محتاج طبیبوں کی نہ کر چارہ گری کا

(دیوان مصحفی۔ ص ۱)

بحر کا حمدیہ شعر۔

للہ کوئی امر نہ ہم سے ہوا اے بحر!	ناکام رہے کچھ نہ کیا کام خدا کا

(ریاض البحر' مطبع مصطفائی۔ ص ۱)

امیر اللہ تسلیم کے حمدیہ اشعار۔

عاشق دلِ خموش ہے حسنِ قدیم کا	یہ بے زبان رقیب بنا ہے کلیم کا
صفت کو اس کے دیکھ کے دیوانوں کی طرح	چنتا ہے تنکے واہمہ کیا کیا کلیم کا

(کلیات امیر اللہ تسلیم' نول کشور لکھنؤ۔ ص ۲۶)

اب آپ اردو نثر سے حمدیہ عبارت دیکھئے۔ یہ ملا وجہی کی سب رس سے لی گئی ہے۔

تمام مصحف کا معنی الحمد للہ میں ہے مستقیم۔ ہور تمام الحمد للہ کا معنی بسم اللہ میں ہے قدیم۔ ہور تمام اللہ کا معنی بسم اللہ کے ایک نقطے میں رکھتا ہے قدیم۔ قدرت کا دھنی جو کرتا سو سب وہی۔ خدا بڑا خدا کی صفت کرے کوئی کیتک۔ وحدہ لاشریک' ماں نہ باپ' آپین آپ پروردگار۔ سنسار کا سرجنہار۔ وہ بے حد اس کی صفت کون کان ہے۔

احد صمد لم یلد و لم یولد۔

کسے ہے حد جو خدا کی صفت کی حد پاوے
پھر ایک بال کون گر سو ہزار جیب تُوے
(سب رس انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۵۲ء۔ ص ۱)

یہ تو تھا اردو شاعری اور اردو نثر کے حوالے سے اردو میں حمدیہ ادب کا ایک مختصر جائزہ جو میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ اب آپ ایسی حمد اور مناجات کے اشعار سنئے جو اردو میں بہت مشہور ہیں اور اکثر تہجد کے وقت پڑھے جاتے ہیں۔

امام دار قطنی کی حدیث شریف ہے:

"قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ الله تبارك و تعالیٰ یتنزل من السماء الی سماء الدنیا حین یبقی ثلث الیل الآخر فیقول هل من تائب واتوب الیه هل من مستغفر فاغفرله"

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رات کے آخری پہر یعنی تہجد کے وقت اللہ تعالیٰ آسمانوں سے آسمان ارضی پر آتا ہے اور کہتا ہے کہ ہے کوئی میرا بندہ جو اپنے گناہوں سے توبہ کرنا چاہتا ہے تاکہ میں اس کے گناہوں کو معاف کر دوں۔ ہے کوئی بخشش چاہنے والا کہ اس کی بخشش میں کردوں۔"

یہ ہے حمد و مناجات کا پس منظر جس کی وجہ سے تمام صوفیاء، علماء، محدثین اور عابد و زاہد ہستیوں نے نالۂ نیم شبی اور فغانِ سحر گاہی کے لئے تہجد کے وقت کا التزام کیا ہے۔ اب آپ ایک مشہور حمد کے اشعار سنئے۔

یارب ترے کرم کا درِ فیض باز ہے
تجھ پر عیاں ہے سب جو مرے دل کا راز ہے
کوتاہ ہے روزِ عشق، شب غم دراز ہے
بے کس پہ یہ ہجوم غم جاں گداز ہے
بے چارگی کے وقت تو ہی چارہ ساز ہے
بندہ نیازمند ہے، تو بے نیاز ہے

قادر ہے تو کریم ہے تو کبریا ہے تو
حلالِ مشکلات ہے، حاجت روا ہے تو
بے کس کا کارساز ہے اور آسرا ہے تو
مشکل میں اپنے بندوں کی مشکل کشا ہے تو
بے چارگی کے وقت تو ہی چارہ ساز ہے
بندہ نیازمند ہے، تو بے نیاز ہے

مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات کے اشعار سنئے۔

یاخدا شک نہیں اس میں کہ گنہگار ہوں میں
پر یہ ارشاد ہے تیرا ہی کہ غفار ہوں میں
ساتھ اپنے لئے تقصیروں کا انبار ہوں میں
تیری رحمت ہو خدایا تو سبکسار ہوں میں
یا خبیر ایسا خبردار بنا دے مجھ کو
بے خبر سب سے رہوں تجھ سے خبردار ہوں میں
یا غنی حشر میں محروم نہ رکھنا مجھ کو
ہوں فقیر اور ترا طالب دیدار ہوں میں

اردو میں ایک مناجات کا نمونہ دیکھئے جو درد و سوز و اثر سے بھری ہوئی ہے۔

اے خدا ! صدقہ کبریائی کا ‌ ‌ ‌ صدقہ اس نورِ مصطفائی کا
سیدھے رستے چلائیو ہم کو ‌ ‌ ‌ پیچ و خم سے بچائیو ہم کو
مرتے دم غیب سے مدد کیجیو ‌ ‌ ‌ ساتھ ایمان کے اٹھا لیجیو
جب دم واپسیں ہو یا اللہ ‌ ‌ ‌ لب پہ ہو لا الہ الا اللہ
دین و دنیا میں آبرو دیجیو ‌ ‌ ‌ دونوں عالم میں سرخ رو کیجیو
کینہ دھو مومنوں کے سینے سے ‌ ‌ ‌ سینہ ہو جائے پاک کینہ سے
سب کو اک راہِ حق دکھا یارب ‌ ‌ ‌ دور ہوں اختلافِ بے جا سب
دین ہو ملتِ احمدیؐ سب کا ‌ ‌ ‌ ہو طریقہ محمدی سب کا
اے خدا تو بڑا سمیع و مجیب ‌ ‌ ‌ بے مرادوں کو کر مرادیں نصیب
گل مریضوں کو تندرستی دے ‌ ‌ ‌ ناتوانوں کے تن میں چستی دے
کر غریبوں سے تنگ دستی دور ‌ ‌ ‌ فاقہ مستوں سے فاقہ مستی دور
نہ رہے کوئی خستہ دل غمگین
سب کی پوری مراد ہو آمین

ڈاکٹر سید عبدالباری (بھارت)

اردو مثنوی میں حمد و مناجات

یہ اردو شاعری کی خوش قسمتی ہے کہ اس میں روز آغاز سے ہی تقریباً تمام اصنافِ سخن میں خالق کائنات کی تسبیح و تقدیس اور تعریف و توصیف کے مضامین ضرور شامل کئے گئے ہیں اور ہمارے شعراء نے خدا کے حضور اپنی بے نوائی اور بے بضاعتی کا اظہار کیا ہے' اور اپنے ذہن و دماغ اور فکر و قلم کو توانائیاں عطا کرنے کی التجا کی ہے۔ چنانچہ حمد و مناجات خود مستقل بالذات صنفِ سخن کی حیثیت سے تو فروغ پذیر ہوئی ہی' اور اس علیحدہ صنف میں ایک بڑا تخلیقی سرمایہ اس وقت موجود ہے لیکن اس کے علاوہ دیگر اصناف میں بھی بالعموم آغازِ کلام حمد و مناجات سے کرنے میں ہمارے شعراء نے فخر محسوس کیا ہے۔ چنانچہ ہمارے اساتذۂ سخن کے دواوین کی پہلی غزل یا اس کا پہلا شعر بالعموم خالقِ کائنات کی مدح و ستائش پر مشتمل ہوا کرتا ہے۔ مثنوی میں یہ روایت زیادہ مضبوط و مستحکم شکل میں سامنے آتی ہے' اور حمد و مناجات کے لاثانی نمونے اردو کی بعض مثنویوں کے آغاز میں ہمیں ملتے ہیں۔ اردو مثنوی کو یہ تابناک روایت فارسی مثنوی سے حاصل ہوئی جس میں حمد و مناجات کے لاثانی شاہکار موجود ہیں' ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس عہد میں جو زندگی کے حقائق سے غفلت اور رندی و بوالہوسی اور کامجوئیوں سے دل و دماغ کو بہلانے اور گرد و پیش کی تلخیوں سے بے نیاز ہونے کی خاطر طرح طرح کے افسوسناک مشاغل میں خود کو مبتلا رکھنے کا دور تھا' اور جس عہد میں ریختی' واسوخت اور داستان کے ساتھ ہی ساتھ مثنوی بھی عیش پرست امراء اور شہزادیوں کی عیش پرستیوں کی داستانیں اس طرح بیان کر رہی تھی کہ ہر سلیم الطبع شخص کو حیرت ہوتی ہے کہ ایسے معاشرہ میں جواب بھی اخلاقی اقدار کا ایک نظام اپنے پاس رکھتا تھا۔ کیونکر یہ چیزیں گوارا کی جا رہی تھیں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بات بھی ہمیں محوِ حیرت کر دیتی ہے۔ کہ فسق و فجور کی ان داستانوں کے شروع میں شاعر حمد و مناجات کے چند اشعار کے ذریعہ بارگاہِ رب العزت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنا لازمی سمجھتا ہے۔ شاید یہ اس مجموعی تہذیبی ماحول کا نتیجہ تھا۔ جس میں اچھا برا ہر طرح کا انسان اپنے کام کا آغاز خدا کی یاد سے اور اس کے ذکر سے کرنا

لازمی سمجھتا تھا اور ہر طرح کا مجوئی کے باوجود اس عہد کا انسان خدا سے بغاوت یا اس سے انکار کی حد تک جانے سے گریز کرتا تھا۔

حمد و مناجات کے اندر الحاح و فروتنی کی انتہائی کیفیات کے بغیر سوز و گداز اور تاثیر و تاثر پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس میں تصنّع و تکلّف کا گذر نہیں۔ یہ کسی دنیاوی امیر کبیر کے حضور قصیدہ خوانی نہیں، جس میں لفاظی مبالغہ آرائی اور لغو و لاطائل مضمون آفرینی کی گنجائش ہو۔ اس دربار میں تسلیم و رضا کا پیکر بن کر آنا پڑتا ہے، اس لئے کہ یہاں اُس کی تعریف میں زبان جرأت کلام کرتی ہے جو ساری تعریفوں سے بے نیاز اور مستغنی ہے اور عرضداشت اس کے حضور کی جاتی ہے جو ساری کائنات کا مطلق مالک و مختار ہے۔ اس صنف میں شاید شاعری کی داخلی کیفیات اور اس کے اپنے شخصی محسوسات و واردات کو فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے۔ تسلیم و اطاعت کے اتھاہ جذبے اور پُر سوز کیفیات کے ساتھ اگر قلم قرطاس پر نہیں رواں ہے تو پھر حمد و مناجات کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اس کائنات کے حاکم کی غیر معمولی عظمت اور اپنی حد درجہ کم مائیگی کے شدید احساس سے اگر اُس کا سینہ لبریز نہیں تو فنکار کی پرواز فقط رسمی مضامین تک محدود رہتی ہے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مضامین خواہ رسمی ہوں، ایک قلم کار کے دل کو اطمینان تو حاصل ہی ہوتا ہے کہ اس نے اپنا ایک روحانی اور مذہبی فرض ادا کر دیا اور اس سے کس کو انکار ہوگا کہ اگر انسان کے دل میں ایمان کی ہلکی سی روشنی بھی موجود ہے تو وہ خدا کو اچھے اور بُرے وقت میں یاد ضرور کرتا ہے۔ میر تقی میرؔ نے سچ لکھا ہے ۔

کہے ہے ہر کوئی اللہ میرا   عجب نسبت ہے بندے کو خدا سے

اردو شاعری میں تعلق باللہ کی یہ روایت ولیؔ دکنی سے ترقی پسند تحریک کے آغاز تک برابر ملتی ہے۔ البتہ جب اس تحریک نے الحاد پسندی و خدا بیزاری کو ایک بلند فلسفے اور انسان کی روشن خیالی کا ایک تقاضہ بنا کر پیش کیا اور اس رو میں اردو کے اہلِ قلم کی ایک جماعت بہنے لگی تو حمد و نعت سے رشتہ ہمارے شعراء کا منقطع ہونے لگا، بلکہ یہ بھی ایک رجعت پسندی کی علامت بن گیا کہ انسان اپنے سے بلند و برتر کسی نادیدہ ہستی کے سامنے سر نیاز خم کرے۔ اب سارے قصیدے انسان کی سربلندی و عظمت کے رقم کئے جانے لگے اور خدا کا ذکر ان شعراء کے یہاں آیا بھی تو اس اسلوب و لب و لہجہ میں ۔

یہ تری تخلیق نا فرجام یہ ٹیڑھی زمین   تا ابد ٹیڑھی رہے گی اس میں تو معذور ہے
آ کہ سینے سے لگا لیں خالقِ برحق تجھے!   جتنے ہم مجبور ہیں اتنا ہی تو مجبور ہے

(اخترؔ انصاری)

لیکن شریف حالیؔ، ذہین شبلیؔ اور حکمت و دانائی کے بحر بیکراں اقبالؔ نے اردو شاعری کی جس روایت یعنی خدا پرستی انسان دوستی اور اخلاقی اقدار کے احترام کو موجودہ صدی کے نصف اول میں اپنے

شعری وفنی شاہکاروں کے ذریعہ مرتبۂ کمال تک پہنچایا تھا اسے ترقی پسند مسمارنہ کرسکے اور تین دہائیوں کی شکست و ریخت اور اُتھل پتھل کے بعد اب یہ فکر نامعتبر اور فلسفہ کج نہاد یعنی مارکزم تاریخ کے تہہ خانوں میں مردہ اور ٹوٹے ہوئے افکار کے ذخیرہ میں ڈال دیا گیا ہے اور پھر سر والٹر اسکاٹ کے الفاظ میں دعا جو زمین کی پستیوں میں کھڑے ہوئے انسان اور عرش الہی کے درمیان ایک طلائی زنجیر بن کر رونما ہوتی ہے' آج پھر محروم انسانوں کے دل کی آواز بن گئی ہے۔ ادھر دو دہائیوں میں جس کثرت سے حمد و مناجات اردو میں تخلیق کی گئیں وہ اس دور کے انسان کے حقیقی جذبات کی تصدیق کرتی ہیں کہ وہ خدا کے سہارے کے بغیر اس کائنات میں ایک قدم بھی سنبھل کر نہیں چل سکتا۔

" اردو شاعری میں مثنوی اس وقت لکھی پڑھی جانے لگی جب کہ اس کی خشتِ اول رکھی گئی اور دکن میں فارسی کے بجائے اردو کی طرف اہلِ قلم متوجہ ہوئے۔ وہاں بہت سی مثنویاں فارسی مثنویوں کے تتبع میں لکھی گئیں' اور تقریباً ان سب کا آغاز حمد و مناجات سے ہوتا ہے مگر زبان میں چونکہ دکنی الفاظ کثرت سے شامل ہیں' اس لئے ایک عام قاری کا لُطف اندوز ہونا مشکل ہے۔ دکن میں صوفیاء اور فقراء نے مثنوی کو تصوف کے رموز بیان کرنے کا وسیلہ بنایا تھا اور بقول پروفیسر گیان چند جین اس عہد میں چند بہترین متصوفانہ مثنویاں لکھی گئیں۔ وہ رقمطراز ہیں :۔

"ذوقی نے وصال العاشقین میں "سب رَس" کا قصہ نظم کیا جس میں سالک کی قطع منازل کی تمثیل ہے۔ معرفت کی مثنویوں میں عشرتی کی "چت لگن" اور "دیپک پتنگ" وجدی کی پنچھی باچھا" باغ جاں فزا اور تحفۂ عاشقاں اور بحری کی من لگن مشہور ہیں۔ مولوی محمد باقر آگاہ کی مثنویاں بھی مذہب وطریقت پر مشتمل ہیں۔"

ولی ویلوری کی روضۃ الشہداء 'اشرف' کی جنگ نامہ حیدر" محمود کی قصہ "ملکہ مصر" دکنی مثنویاں ہیں اور ان سب میں "حمد و مناجات" کا حصہ خاصا وقیع ہے۔

شمالی ہند میں جب اردو شاعری عالمگیر کے عہد ہی سے اہلِ قلم کی توجہات کا مرکز بننے لگی اور اس کو لچر و بازاری زبان سمجھنے کے بجائے ادبی وقار عطا کرنے کا جذبہ بیدار ہوا تو یہاں بھی مثنوی کو خاصا فروغ حاصل ہوا۔ اردو کے عام رواج سے پہلے ہی اودھ میں لودھی زبان میں بہت سے صوفی شعراء نے فارسی مثنویوں کے قصوں کو نظم کیا۔ خاص طور پر عشق و محبت کے صوفیانہ تصورات اور ہجر و وصال کے حقیقی مضامین کی سب سے زیادہ بچی جھلک ہمارے بزرگوں کو یوسف زلیخا کے قصہ میں نظر آئی۔ چنانچہ فارسی کی کئی مثنویوں کا یہ مرکزی مضمون بنا اور اودھی میں بھی کئی لوگوں نے اس قصہ کو مثنوی کے سانچے میں ڈھالا۔ خاص طور پر فیض آباد کے موضع منگسی کے شیخ نثار کی سترہویں صدی میں لکھی گئی مثنوی یوسف زلیخا بے حد

شہرت کی حامل ہے ۔اس مثنوی کا آغاز بھی حمد و مناجات سے ہوا ہے ،اور شاعر نے نہایت والہانہ انداز سے اس مثنوی کی ابتداء حمد خالقِ کائنات سے کی ہے۔ البتہ شمالی ہند کی اردو کی پہلی مکمل مثنوی افضل کی "بارہ ماسہ" کی ابتداء تعجب کی بات ہے کہ اس دور کے رواج کے بر خلاف حمد و مناجات سے نہیں ہوتی بلکہ شاعر پہلے ہی شعر سے قصہ بیان کرنا شروع کر دیتا ہے۔

سنو سکھیو بکٹ میری کہانی | ہوئی ہوں عشق کے غم سوں دوانی
تمامی لوگ مجھ بوری کہن رے | خرد گم کردۂ مجنوں کہن رے

لیکن انہیں کے ہم عصر محبوب عالم شیخ جیون جو گیارہویں صدی ہجری میں پیدا ہوئے اور سید میراں بھیک چشتی صابری کے مرید و خلیفہ تھے اپنی مشہور مثنوی "درد نامہ" کا آغاز ان اشعار سے کرتے ہیں۔

جیوں میں پہل نام رحمٰن کا | چتوں گیان میں دھیان سبحان کا
سبھی ایک کرتار وو پاک ہے | کھڑا جس کی قدرت سے افلاک ہے
وہی ہے کرن ہار عالم خدا | نرنجن نر نکار سب تے جدا

فائز دہلوی نے جنہوں نے اپنی کلیات بعہد عالمگیر ۱۱۲۷ھ میں مرتب کی اپنی چودہ مثنویوں میں ایک مثنوی خاص "مناجات" کے عنوان سے لکھی۔

محمد شاہ کے عہد میں جعفر علی خاں زکی نے ایک عشقیہ مثنوی لکھی۔ اس میں مناجات کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

الٰہی داغ سے دل کو جلا دے | برہ کی آگ مجھ تن میں لگا دے
جلا جیوں پھلجڑی مجھ ناتواں کو | شرر لبریز کر ہر استخواں کو
دورنگی نے مجھے مت ڈالا ہالا | دوئی کا مت اڑھا مجھ پر دو شالا

شاہ حاتم نے بھی اپنی مثنوی "ساقی نامہ" اور "بہار عشرت" کی ابتدا حمد و نعت سے کی۔ میر اسمٰعیل نے ۱۱۰۵ء اپنی مثنوی "وفات نامہ بی بی فاطمہ" کا آغاز ان اشعار سے کیا ہے۔

الٰہی تو صاحب ہے سنسار کا | ہمیں کو ہے امید دیدار کا
ترا نام مردم کوئی لیوتا | تھکا نا جنت بیچ اس دیوتا
کرے پیدا خلقت تنے شمار شمار | کئی شئے جو غائب کیے آشکار

نظیر اکبر آبادی نے کئی مثنویاں لکھیں، مگر وہ ان کی ابتداء حمد و مناجات سے نہیں کرتے البتہ انہوں نے اپنے دیوان کے آغاز میں ایک مسدس بعنوان "الٰہی نامہ" تحریر کیا ہے جس کا آغاز اس بند سے ہوتا

ہے۔

دنیا میں نہ خاص اور نہ کوئی عام رہے گا | نے صاحب مقدور نے ناکام رہے گا
زر دار نہ بے زر نہ یہ انجام رہے گا | شادی نہ غم گردش ایام رہے گا
نے عیش نہ دکھ درد نہ آرام رہے گا | آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

دہلی کے میر آثر نے اپنی مثنویوں کو عارفانہ اور صوفیانہ روایات سے ہٹ کر خالص مجازی اور جسمانی عشق کا محور بنایا۔ اس عشق میں کافی ازخود رفتگی اور بعض اوقات بے حیائی نظر آتی ہے اور اس کا معیار نہایت پست ہے۔ لیکن زبان وبیان کی روانی و شستگی خاصی دلکش ہے۔ مگر اس ساری لذتیت کے باوجود میر آثر اس طرح کے اشعار سے اپنی مثنوی کا آغاز کرتے ہیں۔

سب یہ دنیا سرائے فانی ہے | عشقِ معبود جاودانی ہے
کوئی الفت نہ بے وفا سے کرے | عشق کرنا ہے تو خدا سے کرے
چار دن کی یہ زندگانی ہے | جو ہے اس کے سوا وہ فانی ہے

انیسویں صدی کے اردو کے ممتاز ترین مثنوی نگار میر حسن نے اپنی مثنوی سحر البیان عہد آصف الدولہ میں تحریر کی۔ یہ مثنوی اس دور کے عیش و راحت اور امراء و حکمراں طبقہ کے طرز زندگی کا مرقع ہے۔ کہانی میں کوئی دلکشی نہیں اور نہ عبرت و عظمت کا کوئی پہلو نظر آتا ہے البتہ طرز بیان کی بے ساختگی ہمیں جذب کر لیتی ہے۔ میر حسن نے اپنے فارسی زبان کے پیش رووں کے مقرر کردہ آداب کی پوری پابندی کی تھی پھر وہ جس معاشرہ میں سانسیں لے رہے تھے وہ اپنی ساری رنگ رلیوں کے باوجود مذہب کی روایات اور عقاید کا بے حد احترام کرتا تھا۔ وہ اپنے ہر اچھے بُرے کام کا آغاز خدا کے ذکر سے کرنا اپنے لئے لازمی سمجھتے تھے۔ چنانچہ سحر البیان میں بھی حمد و مناجات اور نعت و منقبت کو ان کا واجب مقام عطا کیا ہے۔ مثنوی کے اس حصہ میں میر حسن کا حسنِ بیان اپنی آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ میر حسن نے حمد کے اشعار میں توحید خالص کا تصور پیش کیا ہے اور ان کا اخلاص بھی ان میں منعکس ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

کروں پہلے توحید یزداں رقم | جھکا جس کے سجدے میں اول قلم
سرلوح پر رکھ بیاض جبیں | کہا دوسرا کوئی تجھ سا نہیں
قلم سے شہادت کی انگلی اٹھا | ہوا حرف زن یوں کہ رب العلا
نہ ہے کوئی تیرا نہ ہوگا شریک | تری ذات ہے وحدہٗ لا شریک
وہ الحق کہ ایسا ہی معبود ہے | قلم جو لکھے اس سے افزود ہے
تر و تازہ اس سے ہے گلزار خلق | وہ ابر کرم ہے ہوا دار خلق

اگرچہ وہ بے فکر و غیور ہے ۔ وے پرورش سب کی منظور ہے
وہی مالک الملک دنیاو دیں ۔ ہے قبضہ میں اس کے زمان وزمیں
سدا ہے نمودوں کو اس سے نمود ۔ دل بستگاں کی ہے اس سے کشود
اسی کی نظر سے ہے ہم سب کی دید ۔ اسی کے سخن پر ہے گفت و شنید
وہی نور ہے سب طرف جلوہ گر ۔ اسی کے یہ ذرّے ہیں شمس و قمر
نہ گوہر میں ہے اور نہ ہے سنگ میں ۔ ولیکن چمکتا ہے ہر رنگ پر
تأمّل سے کیجئے اگر غور کچھ ۔ تو سب کچھ وہی ہے نہیں اور کچھ

پھر میر حسن مناجات کے لئے دستِ دعا دراز کرتے ہیں، حقیقی مالک الملک کے حضور یہ التماس کرتے ہیں۔

الٰہی میں بندہ گنہ گار ہوں ۔ گناہوں میں اپنی گرفتار ہوں
مجھے بخشیو میرے پروردگار ۔ کہ ہے تو کریم اور آمرز گار
پر اک عرض یہ ہے کہ جب تک جیوں ۔ شرابِ محبت کو تیری پیوں
سوا تیری الفت کے اور سب ہے ہیچ ۔ یہی ہو نہ ہو اور کچھ ایچ پیچ
کسی سے نہ کرنی پڑے التجا ۔ تو کر خود بخود میری حاجت روا
جیوں آبرو اور حرمت کے ساتھ ۔ رہوں میں عزیزوں میں عزت کے ساتھ

اسی لکھنؤ میں انیسویں صدی کے نصف اول میں آتش لکھنوی کے شاگرد پنڈت دیا شنکر نسیم نے جب اپنی مخصوص لکھنوی اسلوب انداز اور آہنگ کی مثنوی "گل بکاؤلی" تحریر کی تو سب سے پہلے خالقِ کائنات کی حمد کی۔ حق یہ ہے کہ نسیم اپنے لب ولہجہ اور ایجاز واختصار میں سب سے الگ و منفرد سخنور ہیں۔ وہ حمد کے مضمون کو روایتی انداز میں باندھنے کے بجائے اس میں بھی دراکی اور جودت طبع کا مظاہرہ کرتے ہیں اور یہ دعا کہ خدا ان کے لبوں کو منقار ہزار داستان بنادے اس طرح آتی ہے۔

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری ۔ ثمرہ ہے قلم کا حمد باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر ۔ حمدِ حق و مدحتِ پیمبر
ختم اس پہ ہوئی سخن پرستی ۔ کرتا ہے زباں کی پیش دستی
یارب مرے خامہ کو زباں دے ۔ منقار ہزار داستاں دے

اور پھر اسی لکھنؤ کا ایک بدنام زمانہ مثنوی گو نواب مرزا شوق لکھنوی جس نے اپنی مثنویوں کو رندی وبوالہوسی اور لہو ولعب کے مضامین کا مجموعہ بنادیا "زہر عشق" میں فسق وفجور کی نقش گری کا آغاز ان

اشعار سے کرتا ہے۔ عجب ستم ظریفی ہے کہ داستان خدا کے احکام کی سراسر خلاف ورزی کی ہے اور آغاز اسی خدا کے حضور سر نیاز خم کر کے یوں ہوتا ہے۔

لکھ قلم پہلے حمدِ ربِ ودود — کہ ہر اک جا پہ ہے وہی موجود
ذات معبود جاودانی ہے — باقی جو کچھ کہ ہے وہ فانی ہے
ہم سر اس کا نہیں ندیم نہیں — سب ہیں حادث کوئی قدیم نہیں

(وغیرہ)

اور اسی طرح اس عہد کے خسروِ بدمست واجد علی شاہ بھی اپنی بد نام زمانہ مثنوی "حزنِ اختر" میں جوان کے ناکام معاشقوں کی روداد ہے 'خدا ہی کی حمد کے بعد اپنی حرکات ناشائستہ کی داستان شروع کرتے ہیں۔ یہ اجتماع ضدّین بھی مثنوی کے دامن کی وسعت کا غماز ہے جو اس عہد کی مجموعۂ اضداد و نامراد شخصیتوں کے کارناموں کو بھی سمیٹ سکتی ہے اور خالق کائنات کا شان میں عقیدت کے نذرانے بھی پیش کر سکتی ہے۔ واجد علی شاہ عرض گذار ہیں۔

خدائے زماں' کارساز جہاں — عیاں مثلِ گل' مثلِ بو ہے نہاں
شب تیرہ روشن اسی سے ہوئی — وہ واحد ہے لازم نہیں ہے دوئی

(وغیرہ)

اسی صدی میں جگناتھ خوشتر اپنی رامائن کی ابتداء ان اشعار سے کرتے ہیں۔

خدایا نام کو نام آوری دے — قلم میں جلوہ بال پری دے
اسی کا نام ہے غفار و ستار — اسی کا نام ہے قہار و جبار

اور عہد غالب کے ممتاز غزلگو مومن اپنی مشہور زمانہ مثنوی۔ "بمضمون جہاد" میں حمدِ خالقِ کائنات اور مناجات اس انداز سے کرتے ہیں کہ انسان کو حضور قلب حاصل ہوتا ہے۔ کیوں نہ ہو۔۔ ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا۔۔ مومن نے اس مثنوی میں انیسویں صدی کے عظیم ترین اسلامی مجاہد رہنما اور شہید حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقا کی اس تاریخی مہم کی تائید کی ہے 'جو دہ اسلام کے مجد و شرف کو حال کرنے کی خاطر پورے برصغیر میں چلا رہے تھے' تا کہ ملت اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر سکے اور اس کا تعلق اپنے خالق سے مستحکم ہو سکے 'اور وہ جہالتیں اور گمراہیاں جوان کی معاشرتی زندگی پر حاوی ہو گئی ہیں ختم ہو سکیں۔ مومن کے جذبہ کی پاکیزگی ' خلوص اور ان کا والہانہ و پُر جوش انداز آج بھی ہمارے مادّی وجود کی دنیا درہم برہم کر دیتا ہے۔ حمد کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

پلا مجھ کو ساقی شرابِ طہور — کہ اعضا شکن ہے خمارِ فجور

کوئی جرعہ دے دین فزا جام کا | کہ آجائے بس نشہ اسلام کا
بر نگِ مے ایماں کو آجائے جوش | نہ اپنا رہے اور نہ دنیا کا ہوش
پیے تشنہ کامی سبو در سبو | پیوں شوق سے ملحدوں کا لہو
یہی اب تو کچھ آگیا ہے خیال | کہ گردن کشوں کو کروں پائمال
بہت کوشش جاں نثاری کروں | کہ شرعِ پیمبر کو جاری کروں
دکھا دوں بس انجام الحاد کا | نہ چھوڑوں کہیں نام الحاد کا

اس کے بعد اُس شہر خوباں اور اسی آبروئے ملت اور اس ترکش اسلام کے آبدار خدنگ یعنی حضرت سید احمد شہیدؒ کے لئے مومنؔ کی عقیدتمندی کا رنگ ملاحظہ فرمائیے:-

زہے سید احمد قبول خدا | سر امتحان رسول خدا
جلو میں ہمیشہ رواں ہو ظفر | رکاب اس کے پکڑے رواں ہو ظفر
کہوں کیا لوائے امامت کا اوج | کہ ہیں غوث و ابدال سب اہلِ فوج
خبردار ہو جاؤ اے اہلِ دل | کہ رحمت برستی ہے اب متصل
ہوا مجتمع لشکر اسلام کا | اگر ہو سکے وقت ہے کام کا
ضرور ایسے مجمع میں ہونا شریک | کہ خوش تم سے ہو وحدہٗ لاشریک
حبیب حبیب خداوند ہے | خداوند اس سے رضا مند ہے
امام زمانہ کی یاری کرو | خدا کے لئے جاں نثاری کرو
عجب وقت ہے یہ جو ہمت کرو | حیاتِ ابد ہے گراس دم مرو
یہ ملکِ جہاں ہے تمہارے لئے | نعیمِ جناں ہے تمہارے لئے
شرافت یہاں کی ہے طالع کی اوج | کہ ایسا امام اور ایسی ہے فوج

اور پھر مناجات کا رنگ ملاحظہ ہو۔ مومنؔ کا انکسار اخلاص اور تحریک مجاہدین میں ان کی شرکت کی آرزو ہر ہر شعر سے جھلکتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کی دوسری، تیسری اور چوتھی دہائی میں یہ ملک اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی سچی آرزو سے کس طرح لبریز تھا کہ ایک دہلی کا شاعر رنگیں نوا طبیب حاذق بھی عوامی جذبہ کی لہر سے اپنے کو الگ نہ رکھ سکا:-

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب | یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
الٰہی اگرچہ ہوں میں تیرہ کار | پہ تیرے کرم کا ہوں امیدوار
تو اپنی عنایت کی توفیق دے | عروج شہید اور صدیق دے

کرم کر نکال اب یہاں سے مجھے	ملا دے امامِ زماں سے مجھے
یہ دعوت ہو قبول درگاہ میں	مری جاں فدا ہو تری راہ میں
میں گنجِ شہیداں میں مسرور ہوں	اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں

علی گڑھ تحریک کے تحت جب سرسید اور ان کے رفقاء نے اردو ادب کی جملہ اصناف میں انقلاب برپا کیا۔ انھیں لغو ولاطائل مضامین سے چھٹکارا دلا کر بامقصد فکر انگیز اور معاشرتی اصلاح اور تمدنی فروغ کا وسیلہ بنایا' تو حالی جیسا شاعر منظر عام پر آیا جس نے مسدس مدوجزر اسلام لکھ کر اپنی ملت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے کی کوشش کی۔ اسی شاعر کے قلم سے اردو شاعری کو ایک شاہکار مثنوی "مناجات بیوہ" بھی ملی جس کی زبان پر فریفتہ ہو کر مہاتما گاندھی نے بھی اعتراف کیا تھا کہ اگر آنے والے ہندوستان کی کوئی مشترک زبان ہو سکتی ہے تو وہ "مناجات بیوہ" کی زبان ہوگی۔ اس مثنوی سے اردو میں مثنوی کے دورِ جدید کا آغاز ہوتا ہے' اور اسکا حمد و مناجات کا حصہ شاید اس کا لاثانی حصہ ہے۔ ایک کم عمر بیوہ اخلاص والحاح کی انتہائی کیفیات کے ساتھ اپنے رب سے مخاطب ہے۔ اس میں بے تکلفی' بے ساختگی اور گداز ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ حالی نے ایک بیوہ کا دل کس طرح اپنے سینہ میں لا کر رکھ لیا اور پھر قلم ہاتھ میں لیا اس لئے حقیقی جذبات کی اتنی بے لاگ ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ فنکار اپنے مشاہدہ کو اپنی ذات کا جزو بنائے اور خود اس کا عملی وجود اس کے مشاہدات کی تصدیق کر رہا ہو۔ حالی اس مناجات میں الفاظ کے جادوگر بن کر سامنے آتے ہیں' اور ہم کو عقل و دانش کی ساری زنجیریں توڑ کر اور سرتاپا جذبات بن کر اپنے خالق کے حضور دستِ دعا دراز کرنے کا سلیقہ عطا کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو بیوہ کی مناجات رقت انگیز اور اس سے پہلے حمد کے موتیوں کی طرح چمکدار سڈول اور سجل اشعار ؎

اے سب سے اول اور آخر	جہاں تہاں حاضر اور ناظر
اے بالا ہر بالاتر سے	چاند سے سورج سے امبر سے
اے سمجھے بوجھے بن سوجھے	جانے پہچانے بن بوجھے
سب سے انوکھے سب سے نرالے	آنکھ سے اوجھل دل کے اجالے
جوت ہے تیری جل اور تھل میں	باس ہے تیری پھول اور پھل میں
بید نرا ہے بیماروں کا	گاہک مندے بازاروں کا
بے آسوں کی آس ہے تو ہی	جاگتے سوتے پاس ہے تو ہی
اے اٹکل اور دھیان سے باہر	جان سے اور پہچان سے باہر
ہر دم تیری آن نئی ہے	جب دیکھو تب شان نئی ہے

پھر اسی مثنوی میں مناجات بدرگاہ رب العالمین بھی خاصے کی چیز ہے شاعر نے اپنی سہل ممتنع زبان میں جو سب سے زیادہ انسانوں کے قلوب کی دنیا زیر و زبر کر دینے کی طاقت اپنے اندر رکھتی ہے 'بیوہ کو خدا کے حضور ان الفاظ میں دست بہ دعا پیش کرتے ہیں ۔

اے غم خوار ہر اک بے کس کا — حامی ہر عاجز بے بس کا
عام تری رحمت جب ٹھہری — دور ہے پھر رحمت سے تیری
داد ہر اک مظلوم کو دے تو — اور رانڈوں کی خبر نہ لے تو
عورت ذات کا تنہا جینا — ہر دم خون جگر ہے پینا
یا عورت کو پاس بلالے — یا دونوں کو ساتھ اٹھالے
یا یہ مٹا دے ریت جہاں کی — جس سے گئی ہے پریت جہاں کی
جس نے کئے دل رحم سے خالی — ریت ہے جو دنیا سے نرالی
قوم سے تو یہ ریت چھڑا دے — ہندیوں کی بیڑی یہ تڑا دے

یہ ریت یعنی بیوہ کے عقد ثانی پر پابندی انیسویں صدی کے ہندوستان میں ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں بھی عام تھی 'اور اس کے تلخ ثمرات سامنے آرہے تھے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء نے اس کے خلاف زبردست مہم چلا کر اور خود عملاً اس رسم کے بندھن توڑ دیئے۔ حضرت شہیدؒ نے خود خاندان کی ایک بیوہ کو عقد میں قبول فرمایا۔ شاعری کس طرح معاشرہ کے ناسوروں کا علاج کر سکتی ہے' مناجاتِ بیوہ اس کا روشن ثبوت ہے۔

انیسویں صدی کے ربع اول میں ایک غیر مسلم شاعر جگر بریلوی اپنی مثنوی "پیام ساوتری" میں حمد و دعا سے آغاز سخن کرتے ہیں ملاحظہ ہو ۔

اے خالقِ مہر و ماہ واختر — بنیادِ بشر ہے آرزو پر
ہر چند ہے بے ثبات دنیا — مجبور ہوں کچھ کروں تمنا
رہ سکتی نہیں زبان خاموش — ہاں کھول دے میرے دیدۂ ہوش
اے خالقِ جو ہر معانی — سر چشمہ فیض خوش بیانی
رحمت سے مجھے نہال کر دے — دامان سخن گہر سے بھر دے

اور پھر اقبالؔ اپنی حکیمانہ اور پیمبرانہ شاعری کے ساتھ اردو شعر و ادب کے منظر نامہ پر نمودار ہوتے ہیں۔ اردو مثنوی کے لئے ان کا "ساقی نامہ" ایک نادر الوقوع فنی و فکری کارنامہ ہے 'اور مثنوی میں مناجات کا حصہ اردو شاعری کے سرمایہ مناجات میں شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ اقبالؔ کا پورا فلسفہ حیات 'انکے

دل کی آرزو' ان کا پیام اور ان کی دیرینہ تمنا اپنی ملت بیضا کے لئے ان اشعار میں منعکس ہوتی ہیں۔ شاعری اس منزل پر پہنچ کر سحر حلال ہو جاتی ہے۔ اقبال کا رب کائنات کے حضور بے ساختہ و والہانہ التجا پہاڑوں کے سینے شق کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہے اور شاید اسی مناجات کا اثر تھا کہ پوری دنیائے اسلام میں ملت کے جوانوں کے سینوں میں آرزو کے شرار رقصاں ہو گئے اور جگہ جگہ اسلامی تحریکات کے شگوفے پھوٹنے لگے اور آج اسلام اس پورے کرۂ ارض پر بسنے والے انسانوں کی امیدوں کا آخری محور بن گیا ہے' اشتراکیت شکستہ و پارہ پارہ ہو چکی ہے اور مغربی سرمایہ داری و استعمار بھی دم توڑ رہا ہے۔ شاید اقبال کی اسی مناجات کا فیضان ہے' جو اسی صدی کی تیسری دہائی میں نوائے سروش بن کر فضا میں گونجی تھی۔ ملاحظہ فرمائیں۔

مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا　　میری خاک جگنو بنا کر اڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر　　جوانوں کو پیروں کا استاد کر
ہری شاخ ملت ترے نم سے ہے　　نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے　　دل مرتضیٰ سوز صدیق دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر　　تمنا کو سینے میں بیدار کر
ترے آسماں کے ستاروں کی خیر　　زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوز جگر بخش دے　　مرا عشق میری نظر بخش دے
مری ناؤ گرداب سے پار کر　　یہ ثابت ہے' تو اس کو سیار کر
بتا مجھ کو اسرار مرگ و حیات　　کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات
میرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں　　میرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
امنگیں مری' آرزوئیں مری　　امیدیں مری' جستجوئیں مری
مری فطرت آئینۂ روزگار　　غزالان افکار کا مرغزار
مرا دل' مری رزم گاہ حیات　　گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر　　اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے　　لٹا دے' ٹھکانے لگا دے اسے

غرض اردو شاعری میں قلی قطب شاہ سے اقبال تک جتنی بھی مثنویاں لکھی گئیں' تقریباً سبھی حمد و مناجات کے گوہر تاباں سے مزین ہیں اور دراصل یہی دو گوشۂ تابناک ہے جو اس پورے ذخیرہ کے لئے وجہ جواز بنتا ہے جس میں کہانی و قصہ کے نام پر لغویات کا ایک انبار ہمارے بعض قدیم شعراء نے لگا دیا ہے۔ لیکن خلوت کدۂ حمد و مناجات میں آکر شاعر ایک بندہ محتاج اور اپنی حقیقت سے آگاہ عبد و مملوک بن جاتا ہے

اور اپنے دل کے دریچے کھول دیتا ہے یہاں جو کچھ ہے وہ تصنع وریاکاری سے پاک 'اور لفاظی و لَن ترانی سے مبّرا ہے یقیناً حمد و مناجات نے اردو شاعری کے رتبہ کو بے حد بلند کر دیا ہے کہ شاعری اس مرحلہ میں آکر شاعر کے احوالِ حقیقی کی ترجمان بن گئی ہے اور سچی شاعری وہی ہوتی ہے جس میں شاعر اپنے قال کو اپنے حال میں مدغم کر دے اور اس کا حال اس کے قال کی تصدیق کرنے لگے 'شاید مناجات اسی اعتبار سے اردو ہی نہیں دنیا کی تمام شاعری کا گلِ سرسبد اور دُرِ شہوار ہے جس کی وجہ سے شاعری پیغمبری کا ایک جز بننے کا شرف حاصل کرلیتی ہے۔ اردو شاعری کی یہ خوش قسمتی ہے کہ وہ اس صدی کے وسط میں الحاد و دہریت کے تھپیڑوں سے ٹکرانے کے بعد صحیح سالم اپنی فطری شاہراہ پر آگئی ہے 'اور ہمارے جدید شعراء کا میلان بھی اپنے خالق کے حضور اپنے جذبات کو بزبان شعر پیش کرنے کی طرف بڑھتا جارہا ہے۔ خدا کرے ہماری پوری شاعری حمد و مناجات بن جائے اور ہمارے شعراء کے ہر ہر لفظ سے خدا کی عظمت و کبریائی اور اس کے بے پناہ انعامات و احسانات کی خوشبو پھوٹنے لگے۔

ڈاکٹر طفیل احمد مدنی (بھارت)

حمد و مناجات بیسویں صدی میں

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کا حق بھلا کوئی بشر کیا ادا کر سکتا ہے جبکہ سید البشر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے لا احصی ثناء علیک سے اپنے عجز کا اظہار فرمایا ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی کامل معرفت انسان کے حیطۂ علم و قدرت سے خارج ہے چنانچہ ایک صاحبِ عرفان نے اسی حقیقت کو اس طرح الفاظ کا جامہ پہنایا ہے ؎

مبتدی ہو کوئی یا کہ ہو ختمی　　　　کہتے ہیں دوستو ما عرفنا بھی

اس کے باوجود ہر دور میں علمائے راسخین اور عرفائے کاملین نے اپنے علم و معرفت کے مطابق اللہ جلّ شانہٗ کی حمد و ثنا کی ہے اور کرتے رہیں گے۔

اس موقع پر جی چاہتا ہے کہ تبرکاً مثنوی مولانا روم سے چند ابیاتِ حمد نقل کرنے کی سعادت حاصل کروں۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

خالقِ افلاک و انجم بر ملا　　　　مردم و دیو و پری و مرغ را

(یعنی اللہ تعالیٰ ہی آسمان، ستاروں، آدمی، دیو، پری اور چڑیوں کا خالق ہے۔)

خالقِ دریا و دشت و کوہ و تیہ　　　　مملکتِ او بے حد و او بے شبیہ

(وہی دریا، جنگل، پہاڑ اور میدان کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس کی سلطنت بے حد اور وہ بے مثل ہے)

تا قیامت گر بگویم زیں کلام　　　　صد قیامت بگزرد ویں ناتمام

(اگر اللہ تعالیٰ کی حمد و وصف کو تا قیامت بیان کروں تو بھی ناتمام ہی رہے گی۔)

نیز کسی عارف کے یہ دو شعر بھی اس باب میں بے نظیر ہیں ؎

خدا در انتظارِ حمدِ ما نیست　　　　محمد چشم بر راہِ ثنا نیست

خدا مدح آفریں مصطفیٰ بس　　　　محمد حامدِ حمدِ خدا بس

(یعنی اللہ تعالیٰ ہماری حمد کا منتظر نہیں ہے۔ اسی طرح محمد ﷺ ہماری ثنا و مدح کے امیدوار نہیں ہیں۔ محمد مصطفیٰ ﷺ کی مدح کے لئے اللہ کی مدح بس ہے اور اللہ تعالیٰ کی حمد کے سلسلہ میں محمد ﷺ کی حمد کافی وافی ہے۔ دوسرے کی مدح و حمد کی ضرورت نہیں ہے۔)

مگر ہر مومن کا دلی جذبہ و داعیہ یہ ہونا چاہئے کہ ہماری تمام عمر اسی حمد و ثنا اور مدح و نعت کے کہنے اور سننے میں بسر ہو تاکہ دنیا و دین کی خیر حاصل ہو۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار | بگزارند و خم طرۂ یارے گیرند(۱)

(یعنی ہمارے علم و معرفت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ احباب سب دنیاوی مشاغل کو چھوڑ چھاڑ کر ذکرِ یار اور یادِ محبوب میں مشغول ہو جائیں۔)

حمد و مناجات گوئی فن بھی ہے اور عبادت بھی۔ فن کے لئے جس ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے جب وہی ریاضت حمد و مناجات گوئی کے لئے کام میں لائی جاتی ہے تو عبادت بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر شعراء شعر گوئی کا آغاز تو نظم و غزل یا قطعہ و رباعی سے کرتے ہیں لیکن جب ان کی فنّی ریاضت انتہا کو پہنچتی ہے تو حمد و نعت گوئی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں یہیں سے فنّی ریاضت فنی عبادت کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔

بات محبوب مجازی کی بھی ہو تو غزل میں اس کا پیکر و کردار ابھارنے کے لئے برسوں دشتِ فن کی سیاحی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن جب شاعر کا عشق، عشق الٰہی سے عبارت ہو تو آپ خود ہی سوچئے اس عشق کی منزلوں سے کامیاب و کامران ہو کر گزرنے کے لئے کتنی عرق ریزی اور کس درجہ فکری، فنّی اور روحانی ریاضت و عبادت کی ضرورت ہوتی ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ نعت کے مقابلے میں حمد لکھنا آسان ہے۔ کیونکہ اس میں راستہ صاف ہے۔ جتنا چاہے بڑھ سکتا ہے یعنی حمد میں اصلاً کوئی حد نہیں اور نعت میں افراط و تفریط کے خدشے کے پیش نظر دونوں جانب سخت حد بندی ہے بقول علامہ اقبالؔ۔

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے | نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

حمد و مناجات میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

جب بندہ عجز و انکساری، عشق و سرمستی اور دوری و حضوری کے تمام مراحل سے کامیاب و سرفراز ہو کر گزرتے ہوئے اپنے جذبات و خیالات کو حمد کے اشعار میں ڈھالتا ہے تو کچھ اس طرح کہ عشق کے حضور کون و مکاں کی طنابیں کھنچ جاتی ہیں۔ ایک طرف انسان حیرت و سوال بن کر فراق کی منزلیں طے کرتا ہے، اور دوسری طرف مجسم سپردگی اور وارفتگی بن کر وصال کے سیلاب میں گم ہو جانا چاہتا ہے۔ اور یہ شاعری اپنے اندر ایسی تڑپ اور ایک ایسی کسک رکھتی ہے جو مسلسل عشقِ خداوندی کی آگ میں سلگ سلگ کر سراپا طلب بن جاتی ہے۔ پھر شاعر اس طلب کی منزلیں طے کرتا ہے جو در حقیقت عشق ہی کا دوسرا نام ہے۔

(۱) فیضانِ محبت ص ۱۰۔

یہ فاصلے دوری اور مستوری کی کیفیت میں اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر طے کیے جاتے ہیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور از اول تا آخر مناجاتوں پر مشتمل تھی۔ چونکہ ان کے عہد میں موسیقی وترنم کا رواج تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو مناجاتوں کا معجزہ عطا کیا تھا۔ چنانچہ جب وہ زبور کے نغمے چھیڑتے تھے تو چرندو پرند بھی محو ہو جاتے تھے۔ علامہ شبلی نعمانی اپنے مقالات جلد دوم کے مضمون "فن بلاغت" میں رقم طراز ہیں کہ حضرت داؤدؑ پر جب خدا کے احسانات کا اثر غالب آتا تھا تو بے ساختہ وہ وجد میں آکر رقص کرنے لگتے تھے' ان کا کلام جس قدر ہے سر تاپا شعر ہے جو ان کے پُر جوش دل سے بے ساختہ نکلتا تھا' اسی بنا پر ان کے اشعار کو مزامیر کہتے ہیں۔

میں نے طوالت سے بچنے کے لئے بیسویں صدی کے اردو حمد و مناجات گو شعراء میں سے صرف تین ایسے اہلِ دل نمائندہ شعراء کا انتخاب کیا ہے جن سے ادبِ اسلامی سے دلچسپی رکھنے والے افراد کی اکثریت بخوبی واقف ہے' اور جن کی حسنِ سیرت و کردار کے معترف ان کے تمام ہم عصر علماء و مشائخ رہے ہیں۔ سب سے پہلے میں اسی شہر (رائے بریلی) اور یہاں کے معروف روحانی مرکز (تکیہ کلاں) سے تعلق رکھنے والے ایک شریف النفس' پُر خلوص اور پُر سوز حمد و مناجات گو شاعر مولانا محمد ثانی مرحوم کا ذکر اور ان کا منتخب کلام پیش کرنا چاہتا ہوں۔

"مولانا محمد ثانی مرحوم ایک ایسے نامور خاندان کے چشم و چراغ تھے جس نے اسلامی تاریخ کے ہر دور میں دین کے لئے زیادہ سے زیادہ قربانی دی ہے۔ اور ہمیشہ ابتلاء و آزمائش سے بھی اسے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس خاندانِ والا شان کو اللہ تعالیٰ نے جن بیش بہا انعامات سے نوازا ہے' ان میں توحید و سنت کی دعوت کے ساتھ جہاد کی دعوت اور سر فروشی کے میدان میں سنت کی دولت بھی ہے' جس کی مثال مجاہد کبیر حضرت سید احمد شہیدؒ کی دعوت و تحریک جہاد ہے۔

مولانا موصوف کی طبیعت انتہائی موزوں تھی۔ دیکھنے میں جتنے سادہ' بے رنگ و کیف معلوم ہوتے تھے' اندر سے دل و دماغ اتنے ہی سر سبز و شاداب تھے۔ حمد و مناجات و نعت ان کے محبوب ترین موضوع تھے۔ ان کی شاعری فقیہانہ یا تک بندی والی نہیں تھی بلکہ اس میں روانی اور جوش تھا۔ ترکیبیں چست' بندش مضبوط اور الفاظ نپے تُلے' نیز معنویت سے بھرپور ہوتے تھے۔

ادبی اعتبار سے مولانا موصوف کا بڑا پاکیزہ مذاق تھا۔ ان کے کلام کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ کے ذریعہ ان کے قلب کی کیفیت نمایاں ہو رہی ہے۔ ان کی مناجاتوں کے مجموعے اور درود و سلام کے گلدستے ان کے شعری ذوق کے آئینہ دار ہیں۔ اللہ پاک نے ان کے کلام میں خاص اثر رکھا ہے۔(۱)

---

(۱) ماہنامہ "رضوان" "مولانا محمد ثانی نمبر"۔

نمونے کے طور پر ان کی ایک حمد اور مناجات کے چار چار بند پیش کر رہا ہوں۔ قارئین ان کے کلام کی روانی، برجستگی اور سوز و اثر ملاحظہ فرمائیں۔

حمد

اے خدا صاحبِ عزّ و جاہ و حشم — صاحبِ عرش و کرسی و لوح و قلم
بادشاہت تری گو بہ گو یم بہ یم — حمد تری بیاں آج کرتے ہیں ہم

تیرے اللہ و رحمٰن ہیں پاک نام
پاک تیری صفت، پاک تیرا

ہر جگہ ہر نفس تو ہی تو، تو ہی تو — ہے تری جستجو، ہے تری گفتگو
دونوں عالم کو تو نے دیا رنگ و بو — ترا جود و کرم سر بہ سر گو بہ گو

اے خدا تیری رحمت جہاں میں ہے عام
پاک تیری صفت، پاک تیرا کلام

تو رحیم و ملک تیرے دونوں جہاں — سب پہ تیرا کرم سب پہ تو مہرباں
ہیں تصرف میں تیرے زمان و مکان — تو عیاں، تو نہاں، تو یہاں تو وہاں

تو ہے قدوس اور نام تیرا سلام
پاک تیری صفت، پاک تیرا کلام

تیرے سارے مَلک اور جنّ و بشر — مہر و ماہ و نجوم و فلک بحر و بر
خار و گل ہائے تر اور سب جانور — سال و ماہ و شب و روز، شام و سحر

تو ہے سب کا خدا ہیں ترے سب غلام
پاک تیری صفت، پاک تیرا کلام

مناجات

اے خدا مالکِ آسمان و زمیں — صاحبِ لوح و کرسی و عرشِ بریں
ذکر تیرا مبارک حیات آفریں — جانفزا، دل کشا، دلکش و دلنشیں

پاک تیری صفت، پاک تیرا ہے نام
تو ہمارا ہے مالک، ترے ہم غلام

ہم کو یا رب زبانِ گہر بار دے — ہم کو حسنِ یقیں، حسنِ کردار دے
صدق و اخلاص دے درد و ایثار دے — چشمِ بینا دے اور قلبِ بیدار دے

کر ہمیں خورد و خوش دل و خوش کلام

تو ہمارا ہے مالک، ترے ہم غلام

ہر نفس آبِ کوثر کا ساغر ملے — لذتِ دیدِ روئے منور ملے
ہم کو جنت میں قربِ پیمبرؐ ملے — تیرے دیدار کا لطف اکثر ملے

سلسبیل اور تسنیم کے مشک جام

تو ہمارا ہے مالک، ترے ہم غلام

اے خدا تیرے لطف و کرم پر نثار — تیری رحمت پہ ہر ہر قدم پر نثار
عرش و کرسی ولوح و قلم پر نثار — تیرے محبوب شاہِ امم پر نثار

اس مناجات کو کر دے مقبولِ عام

تو ہمارا ہے مالک، ترے ہم غلام

دوسرے حمد و مناجات گو شاعر سید عبدالرب صوفی ہیں موصوف کی باغ و بہار شخصیت سے تقریباً بھی اہل علم وادب حضرات واقف ہوں گے۔ صوفی صاحب نہایت متدین اور پابند شریعت بزرگ تھے۔ دین وسنت کے خلاف کسی بھی فعل کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے اخلاص کی شہادت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہٗ تک نے "صوفی صاحب مخلص آدمی ہیں" کہہ کر دی تھی۔ نیز مولانا منظور احمد نعمانی نے صوفی صاحب کے انتقال کے موقع پر الفرقان میں تحریر فرمایا "صوفی عبدالرب صاحب اپنے رب کے بڑے وفادار بندے اور مثالی مومن تھے۔ صوفی صاحب شاعر بھی تھے، اور بڑے نادر الکلام شاعر۔" حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، نے تو ان پر ایک مستقل مضمون لکھا ہے جو ان کی تصنیف "پرانے چراغ" میں شائع ہوا ہے۔

کلام اپنے متکلم کے جذبات کا آئینہ دار ہوا کرتا ہے۔ ایک مردِ مومن اور اپنے رب کے وفادار مخلص بندے کا کلام یقیناً ایمان واخلاص اور جذبہ وفاداری کا حامل ہوگا اور اپنے قارئین اور سامعین کے قلوب میں انہیں کیفیات کو ابھارے گا (۱) یہاں نمونے کے طور پر میں ان کی ایک حمد کے چند اشعار نقل کرتا ہوں۔

اے خدا تیری مہک پھیلی ہے گلزاروں میں — اے خدا نور چمکتا ہے ترا تاروں میں
نام رٹتا ہے ترا باغ کا پتہ پتہ — سنگ ریزے ترا دم بھرتے ہیں کہساروں میں
خشک صحرا میں ترے نام کی خاموشی ہے — اور رونق ہے ترے کام کی بازاروں میں
نہیں تسبیح میں مشغول فقط غنچہ و گل — اے خدا تذکرہ ہوتا ہے ترا خاروں میں

---

(۱) کلام صوفی

دودھ پیتے ہوئے بچے بھی نہیں ہیں خاموش
تیری معصوم ثنا خوانی ہے گہواروں میں
لال چہرے میں مجاہد کے جھلک ہے تیری
اور چمک تیرے ہے چلتی ہوئی تلواروں میں
لے کے آئے تھے ملائک تری نصرت کی نوید
غزوۂ بدر کے دن تیغ کی جھنکاروں میں
دھاک بیٹھی ہے غلامان نبیؐ کے تیرے
آج بھی سارے زمانے کے جہانداروں میں
تیرے موسیٰؑ کی جلالت کا مرقع دیکھا
قصر فرعون کی ٹوٹی ہوئی دیواروں میں

اے خدا صوفیؔ مسکین سے بھی راضی ہو جا
وہ بھی ایک عمر سے ہے تیرے طلبگاروں میں

تیسرے حمد و مناجات گو، صاحب عرفان شاعر جن کی حمد اور مناجات کے چند شعر میں ادب اسلامی کے شائقین کی محفل میں تحفتاً پیش کرنا چاہتا ہوں بقیۃ السلف مولانا محمد احمد پرتابگڑھی دامت برکاتہم ہیں۔ ان کی شخصیت ان اطراف میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ "مولانائے موصوف کے عارفانہ و محققانہ منظوم کلام کا مجموعہ "عرفان محبت" کے نام سے طبع ہو کر ایک عرصہ سے افادۂ خاص و عام کر رہا ہے۔ مجھے اس حمد کو خود مولانائے محترم کی زبان سے پُر سوز اور پُر درد انداز میں بارہا سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ اور ہر بار نئی کیفیت محسوس ہوئی ہے۔ اور جب کبھی یہ حمد پڑھی اور سنی جاتی ہے تو بالکل وہی مضمون صادق آنے لگتا ہے جس کی طرف حضرت مولانا نے اپنے اس شعر میں اشارہ فرمایا ہے:-

غائب ہوا جاتا ہے تجلیات کا عالم
مشہود لگا ہونے مغیبات کا عالم

حمد ملاحظہ فرمایئے:-

حمد تیری اے خدائے لم یزل
ہے یہ اپنی زندگی کا ماحصل
توہی خالق ہے توہی خلّاق ہے
توہی رب الناس و آفاق ہے
تیری نعمت کی نہیں کچھ انتہا
شکر تیرا کیا کسی سے ہو ادا
یا علیمؔ، یا سمیعؔ، یا بصیر
توہی قادر اور توہی ہے خبیر
نام تیرا میرے دل کی ہے دوا
ذکر تیرا روح کی میرے شفا
یہ زمین و آسماں، شمس و قمر
دیتے ہیں سب ذات کی تیری خبر
توہی مالک تو ہی رب العالمیں
تیرے در پر جھکتی ہے سب کی جبیں
شان تیری کون سمجھے گا بھلا
ابتدا تو ہی ہے تو ہی انتہا
توہی ہے مقصود، توہی مدعا
جان و دل کرتا ہوں میں تجھ پر فدا
کید سے شیطان کے یارب چھڑا
اور شرورِ نفس سے مجھ کو بچا
یا الٰہی! مجھ کو اب اپنا بنا
کرلے تو مقبول احمدؔ کی دعا

غور فرمایئے تو معلوم ہوگا کہ اس حمد کا ہر شعر باری تعالیٰ کی معرفت کا دفتر اور ہر ہر بیت اللہ رب العزت کے علم و حکمت کا خزینہ ہے اور آخر میں جو دعا فرمائی تو بالیقین کہا جا سکتا ہے کہ وہ دعاؤں کا مغز و خلاصہ ہے' اور اس حمد کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اسمائے حسنیٰ کثرت سے مذکور ہیں جو اس کے شرف و فضل کے لئے کافی ہے۔ نیز اس حمد میں مناجاتِ رب العالمین کا ایسا عنوان ہے کہ اگر کوئی شخص خلوت میں حضور قلب کے ساتھ اس کو پڑھے تو اسے مناجاتِ رب العالمین کی لذت و حلاوت نصیب ہو جائے اور قرب و انابت کی کیفیت وجدانا محسوس ہونے لگے جو یقیناً ایسی دولت ہے جس کو رشکِ صد کرامت کہا جائے تو بجا ہے جیسا کہ حضرت مولانا نے خود فرمایا ہے۔

کرم سے اپنے بخشی مجھ کو توفیق انابت ہے یہ وہ دولت ہے جو واللہ رشک صد کرامت ہے (۱)

اصل مقالہ تو ختم ہو گیا لیکن حمد و مناجات گو شعراء کی اس بزم میں شرکت کی سعادت حاصل کرنے کے لئے میں بھی اپنی ایک حمد کے چند اشعار یہاں پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

ملاحظہ فرمائیں:۔

سکونِ قلب و مداوائے رنج و غم کے لئے کہوں میں حمدِ خدا بخشش و کرم کے لئے
ادب سے مانگتے رہئے دعا کرم کے لئے سلیقہ چاہئے اظہار کرب و غم کے لئے
فقط تو ہی تو سزاوارِ حمد ہے یارب ہے کون جو نہیں جویا ترے کرم کے لئے
تری ثنا میں سبھی کچھ تو لکھ گئے ہیں لوگ کہاں سے لاؤں نئی بات میں قلم کے لئے
یہ میرا دل کہ جو ہے جلوہ گاہِ حسنِ ازل کہیں جگہ نہیں اس میں کسی صنم کے لئے
کہیں رہوں یہ تمنا ہمیشہ رہتی ہے کہ تیرا در ہو میسر جبینِ خم کے لئے
زمانہ ہو گیا یارب طوافِ کعبہ کو تڑپ رہا ہے یہ دل پھر ترے حرم کے لئے
یہ خشک موسم بے آب ہے بہت ہی سخت گدازِ قلب کی دولت دے چشمِ نم کے لئے
الٰہی قبضۂ قدرت میں کیا نہیں تیرے ملے دوا کوئی مجھ کو مرے الم کے لئے

بلا حساب دے یارب طفیلؔ عاصی کو
حساب شرط نہیں ہے ترے کرم کے لئے

آخر میں اس سلسلے کو ایک پاکستانی شاعر رازؔ کاشمیری کی مناجات پر تمام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ رازؔ صاحب پاکستان کے ابھرتے ہوئے حمد و مناجات و نعت نگاروں کی صفِ اول میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ غزل کی سادگی' سپردگی اور تعلقِ خاطر کو حمد و مناجات میں رچا کر پیش کرتے ہیں۔ الفاظ اور تراکیب میں اعلیٰ ذوق کے حامل ہیں۔ قارئین ان کی قادر الکلامی' وارفتگی' سپردگی اور اثر انگیزی کا اندازہ فرمائیں ملاحظہ ہو۔

---

(۱) شرح قصیدہ مدہ حصہ اول" دیباچہ "فیضانِ محبت ص ۴۳

تو دافعِ ہر رنج والم بارِ الٰہا — ہم لوگ ہیں محتاج کرم بارِ الٰہا
اٹھتی ہیں ہر سمت ہی مایوس نگاہیں — کب تک یہ گرانباری غم بارِ الٰہا
منسوب ہے یہ ارضِ وطن نام سے تیرے — لہرائے سدا اس کا علم بارِ الٰہا
بے برگ وثمر نخلِ سرِ راہِ وفا ہیں — تو بادِ صبا ابرِ کرم بارِ الٰہا
آئے ہیں درِ قدس پہ ہم سر کو جھکائے — اک عرض ہے با دیدۂ نم بارِ الٰہا
تیرے ہی تصرف میں ہے بگڑی کا بنانا — تابع ہیں ترے لوح و قلم بارِ الٰہا
جس قوم سے خم کھاتے تھے کل مشرق و مغرب — اب اس میں نہ وہ دم ہے نہ خم بارِ الٰہا
افکار پہ ہے فلسفۂ غرب مسلط — اذہان ہیں اوہام عجم بارِ الٰہا
سینے ہوئے محروم تب و تابِ یقین سے — ہم بھول گئے راہِ حرم بارِ الٰہا
ہم تیری ہدایت کے طلبگار ہیں تجھ سے — بھٹکے ہیں تری راہ سے ہم بارِ الٰہا
کٹتا ہے تو کٹ جائے مگر اپنی دعا ہے — سر ہو تو ترے در پہ ہو خم بارِ الٰہا
مل جائے سبو ہم کو مئے عشق نبیؐ کا — مطلوب نہیں ساغرِ جم بارِ الٰہا
تو صاحبِ اجلال ہے تو صاحبِ اکرام — پھر ہم پہ ہو بارانِ نِعَم بارِ الٰہا
پھر لذتِ توحید سے کر ہم کو شناسا — پھر جذبۂ وحدت ہو بہم بارِ الٰہا
پھر لعبتِ مُرسل بنے تقدیرِ زمانہ — اسباب ہوں پھر سے وہ بہم بار الٰہا

تو دافعِ ہر رنج والم بارِ الٰہا
ہم لوگ ہیں محتاج کرم بار الٰہا

اور اب میں اس مضمون کو صوفی عبدالرب مرحوم کے اس دعائیہ شعر پر ختم کرتا ہوں ' اللہ کرے یہی ہم سب کا حال اور قال بن جائے۔

الٰہی ماحصل ہو زندگی کا گفتگو تیری — مرے صوفی تو لے کر یاالٰہی آرزو تیری

نور احمد میرٹھی

ہندو شعراء کی حمد نگاری

خالق کی ذات و صفات کا احاطہ کرنا مخلوق سے ممکن نہیں ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کی انہی نشانیوں کو دیکھتا ہے جو جلوہ گر ہیں یا جن کا وہ علم رکھتا ہے۔ وہ اپنی فکر و فہم کے حوالے سے حمد و ثنا کرتا ہے مگر خالق ارض و سما کی کتنی مخلوقات پردۂ اخفا میں ہیں، یہ جب معلوم ہی نہیں تو پھر انسان کو کائنات کی لامحدودیت میں اپنی محدودیت کا احساس ہوتا ہے مگر وہ اپنے فکر و تخیل کے آئینے میں نظر آنے والی جن جن چیزوں کو دیکھتا ہے انہیں حوالہ بنا کر حمد و ثنا کرتا ہے۔

مسلمان کے لئے ایک طرف شکر رب اور دوسری طرف شرک سے بچنا ایمان کی سلامتی و پختگی کی دلیل ہے۔ "ش، ک، ر" کیا خوب ہیں اگر اسی ترتیب سے ہوں تو حق بندگی کی کوشش اور درمیان کا "ک" آخر میں آجائے تو اس سے بچے بغیر ایمان کی سلامتی ممکن نہیں ہے۔

مسلمانوں کے علاوہ دوسری اقوام جو اللہ تعالیٰ کی حقانیت پر ایمان نہیں لائیں یا اس کی ذات و صفات کے حوالے سے اس کی تخلیق کردہ دوسری نشانیوں کو خدائی کا درجہ دیتی ہے ان میں بھی ایسے لوگ ہر دور میں ہوئے ہیں جنہوں نے وحدانیت کا اقرار کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ایک مانا ہے، اس کے مظاہر کو اس کی نشانیاں تسلیم کیا ہے اور اپنے سخن سے اس کا اظہار کر کے اپنے حرف و لفظ کو اعتبار بخشا ہے۔

اردو اور فارسی میں بطور خاص ہندوؤں کے تخلیق کردہ ادب کا مطالعہ کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے محض مسلم روایات کی پاسداری میں حمد و مناجات نہیں کہیں۔ ان کے حمدیہ کلام میں دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دے رہی ہیں۔ تو تارام شایاںؔ نے اپنی مثنوی مطبوعہ ۱۸۶۲ء کا آغاز ان اشعار سے کیا ہے جو اس گفتگو کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔ فرماتے ہیں:

دکھائی خدائی وہ قدرت کی شان
کہ مٹی کے پتلے کو بخشی ہے جان
لب و چشم و رخسار دہن و گوش

جگر، دل، جان و حلقوم، دوش
جو ہے خاک سے چرخ تک جلوہ گر
وہ سب ہی ان آنکھوں کے پیش نظر
نہیں کچھ ساعت پہ دارومدار
جو آنکھوں نے دیکھا وہ ہے آشکار

اسی طرح دوسرے بہت سے شعراء نے مختلف اصناف میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی کو تسلیم کیا ہے اور تمام تر صفات کے ساتھ اس کو خالق، یکتا اور بے مثل مانا ہے، یہی نہیں، انہوں نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے کہ کوئی اس کا ثانی نہیں ہے اور بت پرستی صحیح نہیں ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ مٹی کے بت خدا نہیں بن سکتے۔ چودھری جگت موہن لال رواں اناوی (۱۸۸۹۔۔۱۹۳۴) کا یہ قطعہ اس کی شہادت ہے۔

سنگ دل سنگین بدن سنگین قبا ان بتوں سے کیا تمنائے وفا
یہ مدد کیا دیں گے خود معذور ہیں دیوتا بیکار ہیں، مجبور ہیں
(تذکرۂ شعرائے اترپردیش، جلد دوم ص ۱۳۸)

ہندوؤں کے حمدیہ کلام کا کچھ حصہ "اذان دیر" کے نام سے جناب طاہر سلطانی مرتب کر چکے ہیں۔ اس موضوع پر یہ پہلی کاوش ہے جس میں ۴۹ شعراء کا کلام یکجا کیا گیا ہے۔ زیر نظر تحریر میں ان شعراء کے کلام کو شامل نہیں کیا گیا ہے ورنہ یہ مضمون بہت زیادہ طویل ہو جاتا۔ صرف چند شعراء کا وہ کلام شامل ہے جو اس کتاب میں نہیں ہے۔ آیئے غیر مسلم شعراء کے پاکیزہ کلام سے قلب و ذہن کو معطر کیجئے۔

حمد

رام پرکاش ساحر ہوشیار پوری (۱۹۱۳ء۔۱۹۹۷ء)

عین صداقت نام ترا اصل محبت نام ترا
تیرے جلوے لاتعداد نورِ وحدت نام ترا
تیرے کرشمے غیب و ظہور کشف و کرامت نام ترا
تیری شعاعیں فکر و فن مہرِ ذہانت نام ترا
علم و ہنر میں تیرے صدف قلزمِ حکمت نام ترا
تو ہی رب ارض و سما قادر و قدرت نام ترا
ساحر پر بھی ایک نظر شمع ہدایت نام ترا

بیدل کھتولوی، لالہ سکھن لال تلمیذ لالہ سنہرا مل صیدؔ

تو ہی مالک سر دو جہاں تری شان جلّ جلالہٗ
تو ہی زمین تو ہی ہے زماں تری شان جلّ جلالہٗ

تو ہی نور افزا ہے عرش پر، تو ہی جلوہ گر ہے فرش پر
تو ہی ہے نہاں تو ہی ہے عیاں تری شان جلّ جلالہٗ

جسے چاہے کر دے تو بامدا جسے چاہے کر دے تو بے نوا
تیری سب ہیں نعمہ نوازیاں تری شان جلّ جلالہٗ

تو ہی گل شجر پہ کھلائے ہے تو ہی باد صبح چلائے ہے
تو ہی بوستاں تو ہی گلستاں تری شان جلّ جلالہٗ

ہے خموش بیدلؔ خستہ تن وصف کیا ترا ذوالمنن
ہے اتنی تاب و تواں کہاں تری شان جلّ جلالہٗ

ابرؔ دلیش راج شرما (۱۹۱۰ء — ۱۹۶۳ء)

تجھ پر مٹے ہیں دو جہاں کوئی تجھے نہ پا سکا
تیرا حریم پاک ہے فکر و خیال سے بلند

تری ہی شان خاص ہیں تیری کرشمہ سازیاں
خاک میں بحر ہیں رواں اور ہوا خلا میں بند

رحمت بیکراں ہے تو، مجھ پہ بھی ہو نگاہ لطف
عاصیوں میں مجھے بھی کر روز حساب سربلند

مخمورؔ، لکھپت رائے (م ۱۹۰۸ء)

تو ہے ظاہر کہکشاں میں
تو ہے پنہاں پردۂ جان میں

شبنم شبنم آب رواں میں
شعلہ شعلہ برق تپاں میں

قلزم قلزم تو ہے موتی
دریا دریا کوہ گراں میں

تری حمد و ثنا ناممکن
میری زباں میں عام زباں میں

اپنے مخمورؔ خستہ جاں کو
لے لے تو آغوش اماں میں

جوشؔ بدایونی، رادھا رمن (۱۹۰۸ء — ۱۹۹۶ء)

اس کی رحمت جہاں ہے جس پر ہے
وہی تقدیر کا سکندر ہے

خالق کائنات کون و مکاں
معرفت ہو تو دل کے اندر ہے

عکسِ وحدت ہے رنگِ کثرت میں
بے تجاہلی، حجاب پرور ہے

ہے وہی قادرِ حیات و ممات
انحصارِ نجات اس پر ہے

حمد کرتا خدائے برحق کی
یہ بھی فیضِ خدائے برتر ہے

جوشؔ! کیا خوف مجھ کو طوفاں کا
ناخدا جب خدائے برتر ہے

سوزؔ، ہیرا نند (م: ۱۹۲۲ء)

نظر کی روشنی دل کا سرور تجھ سے ہے
مرا خزینۂ عقل و شعور تجھ سے ہے

یہ مہر و مہ یہ ستارے ترا ہی پرتو ہیں
فراز ارض پہ ہر سمت نور تجھ سے ہے

بہار برگ و شجر جگنوؤں کی تابانی
گلوں کا رنگ نوائے طیور تجھ سے ہے

ازل سے ہے ترے تابع زمین کی گردش ہے شب بھی تیری سحر کا ظہور تجھ سے ہے
عطا ہوئی اسے تقدیس تیرے جلوے سے بلند مرتبت کوہِ طور تجھ سے ہے
ہیں وسعتیں تیرے فضل و کرم کی لامحدود ہے اس پہ بھی تیری رحمت جو دور تجھ سے ہے
مجھے غرض نہیں اہل جہاں کے فتووں سے مری سرشت میں عجز و غرور تجھ سے ہے
رکھا ہے سوز کو حمد خدا سے اب تک دور مجھے گلا اے دل ناصبور تجھ سے ہے

چندن بھارتی، اتم چند (م: ۱۹۱۶ء)

یہ احسان کیا کم ہے تیرا خدایا کرم سے مجھے تو نے انساں بنایا
مری ہر نظر نے ترا نور پایا مجھے ہر نظر میں نظر تو ہی آیا
بھنور میں پھنسا جب سفینہ کسی کا تری ذات ہی نے کنارے لگایا
ہر اک دل ہے تیرا ہر اک دل میں تو ہے ہر اک ساز دل نے ترا گیت گایا
نہیں ساتھ دیتا کوئی جب کسی کا سہارا وہ لیتا ہے تیرا خدایا
میں کیسے نہ مٹوں محبت میں تیری کرم سے مجھے تو نے چندن بنایا

عاقل، دھرم پال (م: ۱۹۳۲ء)

اے خدائے کریم! تیرے حضور ہو قبول اس فقیر کا پرنام
عرش پر تو ہے فرش پر تو ہے تجھ سے خالی نہیں ہے کوئی مقام
تیرے جلووں سے رونقِ عالم تجھ سے قائم ہے زندگی کا نظام
تجھ کو دیکھیں نہ دیکھیں شپرہ چشم دیکھتا تو ہے سب کو ربِّ انام
گو کسی حال میں بھی ہو عاقل یاد کرتا رہے تجھے وہ مدام

تربھون باڑوی، تربھون ناتھ سریواستو (۱۹۰۶ء — ۱۹۶۲ء)

لاکھ باتوں کی ایک بات ہوئی لائقِ حمد تیری ذات ہوئی
ہے غفور اور وہ رحیم و کریم ذات اس کی ہمہ صفات ہوئی
اس کی ذرہ نوازیاں ایسی ذرّے ذرّے سے کائنات ہوئی

شریف فرخ آبادی، بابو رام (۱۸۸۶ء ـ ۱۹۶۳ء)

خداوندا بیاں کیا ہوں ترے اوصاف انساں سے فرشتے بھی نہیں واقف ترے اسرار پنہاں سے
ترا شہرہ ہے عالم میں حجاب جلوہ ساماں سے کہ ہر ذرّے میں ہے تو اور پنہاں چشم عریاں سے
زمین کا کرۂ خاکی تو اک ناچیز دنیا ہے ہزاروں اور دنیائیں ہیں پیدا تیرے فرماں سے
تری شانِ کرامت کے مہ و مریخ شاہد ہیں کیا آباد جن کو تو نے مخلوق نوا خواں سے

نہیں شمس و قمر تنہا علم بردار تابانی — بہت سیار و ثابت ہیں مہ و مہر درخشاں سے
ریاضِ رہروانِ حق خبر دیتا ہے عالم کو — کہ بچتے ہیں خس و خاشاک کیوں کر راہِ عرفاں سے
شریف اس واسطے مشغولِ درس پاک رہتے ہیں — نشانِ راہِ عرفاں ڈھونڈتے ہیں شمعِ ایماں سے

عطا شمس آبادی، بنواری لال (۱۸۶۳ء۔۱۹۴۵ء)

وصف کس طرح لکھے بندہ ادنیٰ تیرا — چمن دہر کے ہر گل میں ہے جلوہ تیرا
لاکھ انسان و ملک عقل کے گھوڑے دوڑائیں — عرصۂ حمد نہ طے ہو کبھی حقا تیرا
سحر و شام تری یاد رہا کرتی ہے — ہر گھڑی نام میں لیتا ہوں خدایا تیرا
آج کا عشق نہیں روز ازل سے اے شوخ — جان سے دل ہوا عاشق شیدا تیرا
نظرِ لطف عطا پر رہے اے ربِ کریم — کرم عام ہے عالم پہ ہویدا تیرا

ادیب لکھنوی، گرسرن لال (م: ۱۹۰۲)

حمدِ خالق سے ہے آغازِ سخن — سرمدی ہے نغمۂ سازِ سخن
ہے اسی کی ذات رحمٰن و رحیم — ہے اسی کی ذات غفار و کریم
بالیقیں ہے ایک ربّ العالمین — دین کی بنیاد ہے اس پر یقیں
ہے وہ لاثانی، نہیں اس کا شریک — ذات اقدس ہے اسی کی لاشریک
رہنمائے جادۂ صدق و صفا — کبریا ہے کبریا ہے کبریا
وہ اگر چاہے تو دل ہوں پاک صاف — وہ اگر چاہے خطائیں ہوں معاف
نیک بندوں کا وہی معبود ہے — گم ہے نظروں سے مگر موجود ہے

موج زیبائی، ڈبلیو۔ اے۔ ایس (۱۹۰۹ء۔۱۹۸۴ء)

عجب ہے بانشاں ہو کر بھی تیرا بے نشاں ہونا — ہر اک دل میں مکیں ہوتے ہوئے بھی لامکاں ہونا
شمار نغمہ سنجانِ چمن مرحبا کہیے — سحر ہوتے ہی تیری حمد میں رطب اللساں ہونا
جناب موج کیا کیا صنعتیں ہیں دستِ قدرت کی — زمیں پر بوستاں ہونا، فلک پر کہکشاں ہونا

اعظم جلال آبادی، حکیم ترلوک ناتھ (۱۸۹۶ء۔۱۹۸۹ء)

خدایا تو ہی ہے مرا غم گسار — تو ہی ہے مرے دل کا صبر و قرار
تو ہی جسم ہے بس تو ہی جان ہے — تو ہی مری دنیا ہے ایمان ہے
مرے تن بدن میں ہے طاقت تو ہی — مرے قلب مضطر میں راحت تو ہی
بصارت کی آنکھوں میں تیری ضیاء — سماعت کے کانوں میں تیری صدا
تو ہی سب جہاں کا ہے علم و ہنر — تو ہی آسماں پر ہے شمس و قمر

تو ہی خشک و تر ہے تو ہی بحر و برّ — تو ہی روئے خنداں تو ہی چشمِ تر
ہر اک ابتدا کی ہے تو انتہا — ہر اک انتہا کی ہے تو ابتدا
تو وہم گماں سے بہت دور ہے — عیاں ہے مگر پھر بھی مشہور ہے
دھڑکتا ہے دل تو یہ احساس ہے — کہ شاید تو ہر دم مرے پاس ہے

دانا گوالیاری، منشی کامتا پرشاد (۱۸۵۴ء۔۔۱۹۰۸ء)

ترا ہر چمن میں ہے رنگ و بو تری شان جلّ جلالہٗ — تری طائروں میں ہے گفتگو تری شان جلّ جلالہٗ
تو ہی غنچہ بن کے چٹک اٹھا تو پھول ہو کے مہک اٹھا — تو ہی ڈالیوں پہ ہے کُوبہ کُو تری شان جلّ جلالہٗ

مناجات

چمن لکھنوی، منشی رنگ لال تلمیذ رام سہائے برق

ابھی سرسبز کر میرے سخن کو — بہار بے خزاں دے اس چمن کو
مرے خامے کو دے طوطی کی منقار — رہے تا شکر میں تیرے شکر بار
زباں گلبانگ وحدت سے ہو یکسر — برنگ عندلیب نغمہ پرور
تری حکمت سے ہر گل میں ہے خوشبو — تری قدرت سے بُلبل ہے سخن گو

خوشتر لکھنوی، لالہ جگن ناتھ سہائے (۱۸۰۹ء۔۔۱۸۶۴ء)

مناسب ہے بشر کو وقت حاجات — کرے درگاہ باری میں مناجات
وہی حاجت روائے دوجہاں ہے — کرم فرمائے عالم بے گماں ہے
وہی آمرز گار ہر خطا ہے — وہی روزی دہ شاہ و گدا ہے
اسی کی ذات ہے غفّار و ستّار — اسی کی ذات ہے قہّار و جبّار
وہی دوزخ وہی دیتا ہے جنت — وہی ذلّت وہی دیتا ہے عزّت
بوقت رنج گر فریاد و زاری — کرے جو کوئی سوئے درگاہ باری
شتابی رفع ہو سب اس کی حاجات — بہ روئے "وید" ہے منقول یہ بات

وہبی لکھنوی، شیوپرشاد تلمیذ آفتاب الدولہ خواجہ ارشد علی خان قلق

تو قادر و غیور و غنی و کریم ہے — تو مالک و سمیع و بصیر و علیم ہے
تو وارث و حلیم و غفور و رحیم ہے — تو حافظ و حفیظ و عزیز و کلیم ہے
واحد ہے تو قدیر ہے تو کبریا ہے تو

چاہے جو تو گدا کو بھی ابھی پادشاہ کرے — ذرّہ کو اوجِ نیّرِ اعظم عطا کرے
در کو خذف، خذف کو دُرِ بے بہا کرے — قطرے کو دَم میں قلزمِ بے انتہا کرے

بحر عطا و بخشش جود و سخا ہے تو

ہمدم اکبر آبادی، گوری پرشاد

جرم و عصیاں کا خطا کار ہے بندہ تیرا   بخش دے بخش دے بخشش کا ہے شیوا تیرا
پتے پتے پہ ترے حسن کا نقشہ دیکھا   ڈالی ڈالی سے عیاں صاف ہے جلوہ تیرا
یہ زمیں تیری، فلک تیرا، مہ و مہر ترے   دونوں عالم میں غرض راج ہے شاہا تیرا
کبھی ہمدم پہ بھی ہو جائے عنایت کی نظر   یہ بھی ایک بندہ ناچیز ہے شاہا تیرا

ادیب لکھنوی، گرسرن لال (م: ۱۹۰۲ء)

خدایا میں عبد گنہ گار ہوں   ہوا و ہوس میں گرفتار ہوں
عطا کر شفا مجھ کو بیمار ہوں   ترے ہی کرم کا طلب گار ہوں
نہ مجھ سے ہوا کوئی بھی کارِ خیر   مگر میں نہیں ہوں پرستو غیر
نہیں دیر پا کوئی رنگِ مجاز   سوا تیرے کوئی نہیں کارساز
تری رحمتوں کا نہیں کچھ شمار   تجھی سے ہے یہ زندگی مستعار
تجھی سے ہے میری ہر ایک التجا   نہیں بخشنے والا تیرے سوا
تو ہے مالک یوم دیں اے خدا!   رہے آبرو میری روزِ جزا

منظومات

برق ایٹوی ثم دہلوی، مہاراج بہادر (۱۸۸۴ء__۱۹۳۶ء)

شیرازہ بند دفتر امکاں ہے شانِ حق   سرچشمۂ حیات ہے فیضِ روانِ حق
سیراب ابر لطف ہیں سب تشنگانِ حق   ذرّے زباں حال سے ہیں تر زبانِ حق

حق کی صدا ہے پردۂ ہستی کے ساز میں
در پردہ بس رہی ہے حقیقت مجاز میں

زینت افضائے عالم اسباب ہے وہی   شانِ فروغِ ماہِ نظر تاب ہے وہی
رنگینیٔ رخ گل شاداب ہے وہی   ذو ہش برق غیرتِ سیماب ہے وہی

حق کی ضیا ہے نور کا مطلع جہان ہے
ذرّوں میں آفتاب درخشاں کی شان ہے

روئے مجاز عکس ہے حق کی صفات کا   پرتو اس آئینے میں ہے انوارِ ذات کا
حق اصل کل ہے سلسلہ کائنات کا   اعجاز حق ہے راز طلسمِ حیات کا

ظلمت سرائے دہر میں ہے حق کی روشنی

جلوہ فشاں ہے قادر مطلق کی روشنی
زیب ریاض دہر اگر فیضِ حق نہ ہو　　رنگین کتاب خندہ گل کا ورق نہ ہو
نیرنگ ہفت رنگ بہارِ شفق نہ ہو　　عالم فروز تابشِ مہرِ اُفق نہ ہو
اس تیرہ خاک داں میں برستا جو نور ہے
حق تو یہ ہے یہ جلوۂ حق کا ظہور ہے
دنیا میں ذات حق سے یہ سب بندوبست ہے　　انجام حق ہی ہستیٔ فانی میں ہست ہے
کذب و ریا کو حق کے مقابل شکست ہے　　تابش سے حق کی تیرگی کُفر پست ہے
رکھتا ہے اصل پیش حقیقت دروغ کیا
باطل کو حق کے سامنے ہوگا فروغ کیا

شاکر میرٹھی، پیارے لال

یہ سبزہ و گل، یہ زمین یہ غنچہ عرش بریں!
یہ آفتاب آتشیں! یہ نجم، یہ ماہ جبیں!!
مظہر تری قدرت کے ہیں
شاہد تری صنعت کے ہیں
اے صانعِ ارض و سما
تاباں جو یہ اجرام ہیں روشن جو یہ اجسام ہیں
مینائے آتش! فام ہیں قدرت کے رنگیں جام ہیں
ان سب میں ہے نور ازل
اے خالقِ صمد، عزّوجل
پر تو فگن جلوہ نما!
یہ جنبش باد رواں! یہ شوخیٔ آب رواں!
یہ نکہت، عنبر فشاں یہ طائران نغمہ زن!
اک اک میں قدرت ہے تری
کثرت میں وحدت ہے تری
خلّاق بے چوں و چرا!
ہر سنگ میں تو ہے شرر ہر رنگ میں ہے جلوہ گر
ذرّوں میں تنویرِ سحر تاروں کے جھرمٹ میں قمر

آنکھوں میں تو ہے دل میں تو
لیلیٰ ہے ہر محفل میں تو
ہر شئے میں جلوہ ہے ترا!
تو رنگ افروزِ چمن تو جلوۂ سرو و سمن
تو رونقِ بزمِ کہن تو زیبِ شمعِ انجمن
اُف رے خود آرائی تری!
اے شانِ یکتائی تری
آئینہ وحدت نما!
خلاق بے پایاں ہے تو آسائشِ دوراں ہے تو
ہر درد کا درماں ہے تو یعنی طبیبِ جاں ہے تو
اے چارہ ساز اے چارہ گر
اے چارۂ دردِ جگر
اے دردمندوں کی دوا
اے مرجع شاہ و گدا اے خلق کے حاجت روا
اے گمرہوں کے رہنما! اے ناتوانوں کے عصا
اے مونس رنج و الم
چارہ گر بیمارِ غم
چٹکی میں ہے تیری شفا!
ہستی میں اک طوفاں ہے تو ہر موج میں پنہاں ہے تو
اک قلزم جوشاں ہے تو اک بحرِ بے پایاں ہے تو
مبدائے سر جوش عطا
تیری نہیں کچھ ابتداء
تیری نہیں کچھ انتہا!

سوز، ہیرانند

اے رب باری
یہ پیڑ پودے

زمین کے دامن میں دور تک لہلہاتی فصلیں
یہ کہساروں کی وادیوں میں گھیرے جنگل
یہ ابر باراں
یہ آبشاریں
یہ پربتوں سے سمندروں تک مچلتے دریا
ہیں تیرے فضل و کرم کے مظہر
فلک پہ اڑتے ہوئے پرندوں کی چہچہاہٹ
شجر شجر بلبلوں کے نغمے
تری صدا کی نوید لے کر
ہماری تشنہ ساعتوں کی حلاوتیں بھینٹ کر رہے ہیں
مگر خدایا!
نہ جانے کیسے
منافقت کا دہکتا سورج سروں پہ ہم سب کے آگیا ہے
عناد و نفرت کی دھوپ میں ہم جھلس رہے ہیں
ہمیں عطا کر ٹھنڈی چھاؤں محبتوں کی
ہمارے جسموں کو اپنی رحمت کا سائباں دے

رباعیات

موجؔ، راجیندر بہادر (م: ۱۹۲۲)

اے مالک کرات شموس و اقمار . اے خالق بحر و بر و باد و کہسار
قائم ہے تجھی سے ربط ارضی عرشی پیکر ہوں گناہوں کا تو ہے غفار

تسلیمؔ، منشی رام سہائے ڈپٹی کلکٹر بدایوں (۱۸۵۰۔۱۹۳۰)

لازم ہے خدا کا ذکر ہر دم تسلیم رکھ یاد سے اس کی دل کو خرم تسلیم
ہیں نام ہزار بلکہ بے حد و شمار ہر نام ہے اس کا اسم اعظم تسلیم

فرحتؔ کانپوری، بابو گنگا دھر (۱۹۰۵)

رسوا آیا ہوں خوار آیا ہوں درگاہ میں تری شرمسار آیا ہوں
اپنی رحمت کی لاج رکھ لے مالک ہر چند کہ میں گناہگار آیا ہوں

مہتاب، ستیہ پرکاش (۱۹۲۵)

چرچا لب عالم پہ ہے کیا ہی تیرا　　ہے ذکر نفس لا متناہی تیرا
انسانوں کے صف میں کیا پیدا مجھ کو　　احسان ہے احسان الٰہی تیرا

شاد، راجہ کشن پرشاد (۱۸۶۴ــ۱۹۳۹ء)

پانی جو برس رہا ہے یہ رحمت ہے　　کیا شان ہے معبود کی کیا قدرت ہے
دھوتا ہے گنہ گاروں کے سارے اعمال　　یہ بندہ نوازی ہے عجب حکمت ہے

سرور جہاں آبادی، درگا سہائے (۱۸۷۳ــ۱۹۱۰ء)

میں فرق کے کل تیرے حضور آیا ہوں　　ہاں معترف جرم و قصور آیا ہوں
لے اپنی پناہ مغفرت میں مجھ کو　　دربار میں تیرے یا غفور آیا ہوں

بسمل الہ آبادی، سکھدیو پرشاد سنہا (۱۸۹۹ــ۱۹۷۵ء)

ہر وقت میسر ہو نظارا تیرا　　ملتا رہے گرتے کو سہارا تیرا
بسمل کا مددگار نہیں اور کوئی　　کافی ہے اسے صرف سہارا تیرا

مہر سہسوانی ثم گوالیاری، نارائن پرشاد ورما شھولے (۱۸۶۸ءــ۱۹۴۳ء)

پایا تو نشاں ہے بے نشانی تیرا　　دیکھا تو مکاں ہے لامکانی تیرا
زیبا ہے تجھ ہی کو ناز یکتائی پر　　تیرا نہ عدیل ہے نہ ثانی تیرا

ادیب لکھنوی، گرسرن لال (م: ۱۹۰۲ء)

جو حکم ہے اس کا وہ گوارا ہے مجھے　　ہر حال میں صرف اس کا سہارا ہے مجھے
ہو کاش دم نزع یہ احساس ادیب　　اللہ کی رحمت نے پکارا ہے مجھے

مہر، سورج نرائن

ہر شے میں جمال دلربا کو دیکھا　　ہر چیز میں شانِ کبریا کو دیکھا
مخلوق میں خالق نظر آیا جس کو　　اس دیکھنے والے نے خدا کو دیکھا

محروم تلوک چند (۱۸۸۷ــ۱۹۶۶ء)

ہر صبح جب بلند علم کرتا ہے　　سر تیرے حضور اٹھ کے خم کرتا ہے
لوح افلاک پر شعاعی خط میں　　خورشید تری ثنا رقم کرتا ہے

مشرق کو شدائد فرنگی سے بچا　　مغرب کو مکائد حبشی سے بچا
اے خالق پاک! فطرت انساں کو　　روباہی و گرگی و پلنگی سے بچا

ذکی ٹھاکور، دامودر (و: ۱۹۰۳ء)

انصاف ترا ہے صاف یہ بھی ہے صحیح　　تو بڑوں کے ہے خلاف یہ بھی ہے صحیح
یہ سچ ہے کہ دیتا ہے گناہوں کی سزا　　کرتا ہے گناہ معاف یہ بھی ہے صحیح

شیدا انبالوی، بنارسی داس (و: ۱۹۱۶)

ہر ذرّے میں یا رب! تری صورت دیکھی　　کثرت کے مناظر میں بھی وحدت دیکھی
کافی نہیں کونین کا دامن جس کو　　ہم نے وہ ترے حسن میں وسعت دیکھی

ہر سبزہ جناں میں لٹک ہے تیری　　ہر باغ گل افشاں میں مہک ہے تیری
کوئل ہو کہ طوطی ہو کہ وہ قمری ہو　　ہر طائر پراں میں چہک ہے تیری

ہر ذرہ ترے عکس سے ہے ماہ لقا　　ہر خار ترے دم سے ہے فردوس ادا
ہر سنگ ترے فیض سے ہے طور نما　　ہر دل ترے انوار سے ہے مہر ضیاء

خوش رنگ بہاروں میں ترا ہی جلوہ　　چاند اور ستاروں میں ترا ہی جلوہ
ہر دیدۂ بینا کو نظر آتا ہے　　فطرت کے نظاروں میں ترا ہی جلوہ
جس حسن کا تو دل سے تمنائی ہے　　یوں جس کے تجسس میں تو سودائی ہے
ہر ذرہ اسی حسن کا ہے آئینہ　　ہر دل میں وہی جلوۂ یکتائی ہے

ہر شکل میں یارب! تری صورت دیکھی　　قدرت، تری عظمت، تری صنعت دیکھی
منظر ترے ہر سُو، ترے جلوے ہر جا　　کثرت میں بھی ہم نے تری وحدت دیکھی

برق، بھگوان داس (و: ۱۹۱۸)

ترے کرم ہی سے بگڑی ہوئی بنے گی بات　　ترے کرم ہی سے مشکل ہر اک حل ہوگی
ترا کرم ہے تو سلجھے گی برق ہر گتھی　　نہیں ہے راہ جو ہموار آج، کل ہوگی

بیدآر، کرپال سنگھ (۱۹۱۶ء — ۱۹۷۷ء)

آفاق میں ہر سُو ہے خدائی اس کی　　ہر چیز میں ہے جلوہ نمائی اس کی
جتنے بھی ہیں اعداد جہاں میں، بیدآر　　ہر ایک میں پھیلی ہے اکائی اس کی

تربھون باڑوی، تربھون ناتھ سراپوستو (۱۹۰۶ء۔۔۱۹۶۲)

لاکھ باتوں کی ایک بات ہوئی
لائق حمد تیری ذات ہوئی

تیری ذرہ نوازیوں کے نثار
ذرے ذرے سے کائنات ہوئی

رضا، کالیداس، گپتا (و: ۱۹۲۵)

جو ہے اللہ کا بندہ وہ سب کا ہے ہمارا ہے
خدا کا جو نہیں ہوتا، ہمارا ہو نہیں سکتا

خدا کی بارگاہ میں بے پیمبر کب رسائی ہے
محمدؐ سے بڑا کوئی سہارا ہو نہیں سکتا

مہر دہلوی، منشی سورج نرائن (م: ۱۹۲۰ء)

بندوں پہ تری بندہ نوازی دیکھی
بیچاروں کے حق میں چارہ سازی دیکھی

تجھو نہیں دوست اور دشمن میں تمیز
یارب وہ تیری بے نیازی دیکھی

ہے فکر عبث کہ کام کیوں کر ہوگا
حق چاہے گا جس طرح برابر ہوگا

کام اپنا خدا کے کر حوالے اے مہرؔ
پھر دیکھ کہ بہتر سے بھی بہتر ہوگا

یارب گل و گلزار میں میں نے تجھے دیکھا
ہر وادیِ پُرخار میں میں نے تجھے دیکھا

ہر ساز کے پردے میں صدا تیری سنی ہے
ہر شکل کے اظہار میں میں نے تجھے دیکھا

رواں اناوی، چودھری جگت موہن لال (۱۸۸۹ء۔۔۱۹۳۴ء)

سنگ دل، سنگین بدن، سنگین صبا
ان بتوں سے کیا تمنائے وفا

یہ مدد کیا دیں گے خود معذور ہیں
دیوتا بیکار ہیں، مجبور ہیں

پتّی پتّی، بوٹا بوٹا، شاخ شاخ
خم بہ خم، منزل بہ منزل، کاخ کاخ

ایک لے ہر ایک پیمانے میں ہے
ایک ہی عکس آئینہ خانے میں ہے

عاقلؔ، دھرم پال (و: ۱۹۳۲)

اسرار حقیقت کا شناسا ہو جائے
عاشق ہے جو ذات حق کا شیدا ہو جائے

ہاں! عارف کامل ہے وہی اے عاقلؔ
آئینہ دل جس کا مجلّی ہو جائے

عشق صادق وہ چیز ہے جس سے
پتھروں میں بھی جان آجائے

ہے یقیں میں ترے کمی ورنہ　　تو یقیناً خدا کو پا جائے
دنیائے حقیقت کا تماشا دیکھے　　جو ہو نظر افروز نظارا دیکھے
یارب! یہی حسرت ہے دل عاقلؔ میں　　ہر رنگ میں تیرا ہی وہ جلوا دیکھے

منشی مولچند کو شاہ نصیر سے شرف تلمذّ حاصل تھا۔ انہوں نے اکثرت قصص شاہنامہ کے زبان ریختہ میں لکھے ہیں۔ "شاہنامہ مولچند" کا آغاز انہوں نے ان حمدیہ اشعار سے کیا ہے:

سر نامہ حمد خدائے کریم　　کہ ہے کردگار غفور و رحیم
بلندی وہ خسرواں ہے وہی　　شہی بخش شاہنشاں ہے وہی
کبھی دی فریدوں کو وہ دستگاہ　　کرے گاہے جمشید کو وہ تباہ
کبھی ناتوانوں کو بخشے وہ زور　　سلیمان کو گاہے کرے مثل مور
جن و دیو انسان حور و پری　　مہ و مہر اور زہرہ و مشتری
کئے اس نے قدرت سے پیدا تمام　　نہاں تھے ہوئے سو ہویدا تمام

لالہ پیم چند نے شاہنامہ کی ابتدا حمد باری تعالیٰ کے ان اشعار سے کی ہے۔

خدا تجھو شاہی سزاوار ہے　　صفت کو تری کچھ نہ آکار ہے
ترا نام روشن زبان پر دھرے　　تو باہر و بھیتر اُجالا کرے
جو صادق ترے نام پر ہے مدام　　تو ہے اسے کٹنے رات دن صبح و شام

بھگونت رائے راحت کاکوروی کو سید آغا حسن امانت لکھنوی سے شرف تلمذّ حاصل تھا۔ آپ نے ۱۸۸۴ میں انتقال کیا۔ راحت کاکوروی نے کئی مثنویاں لکھیں جن میں "نگارستان راحت" کافی مشہور ہوئی۔ اس مثنوی کی بھی ابتدا ان اشعار سے کی ہے۔

کروں پہلے ادا حمد خدا کو　　بنایا جس نے ہے ارض و سما کو
ہوا میں جس کے ہیں برگ درختاں　　زباں ہے زبانی سے ثنا خواں
جہاں تک مرغ رہتے ہیں نوا ساز　　اوس کے عشق میں ہیں نغمہ پرواز

اسی طرح لالہ کیدار ناتھ اختر بدایونی کی مثنوی "سرور عشق" ۱۸۹۲ء میں طبع ہوئی۔ اس مثنوی کا آغاز حمدیہ اشعار سے کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

ہے تقاضا دل کا لکھ حمد خدا　　وہ مثل ہے چھوٹا منہ مطلب بڑا
اے خدا کرتو عطا طبع رسا　　تاکہ لکھوں اپنے دل کا مدعا

منشی ہیرالال ناظر سب جج کورٹ، میرٹھ اپنی مثنوی میں شکر پروردگار کو لازم قرار دیتے ہیں۔

شکر پروردگار ہر دم ہو گو مہیا فزوں ہو یا کم ہو

کالوجی رامیشور شاد اپنی نظم "دعا" میں کہتے ہیں۔

مجھ کو شرم آتی ہے یارب اور طلب کچھ تجھ سے کرتے
یہ کیا کم احسان ہے ترا بڑھ کے دیا مجھ کو لاکھوں سے

منتخب اشعار

بسمل کیرانوی، دیوی چند (۱۹۰۳ء۔۔۱۹۸۷ء)

تیرا جلوہ نمایاں ہے ہر اک خلوت میں محفل میں — تو ہی آباد ہر ذرہ میں ہے ہر خانۂ دل میں
نہ دل قربان ہو کیوں صانع قدرت پہ اے بسمل — عیاں ہے جلوہ شمس و قمر اک آنکھ کے تل میں

قمر، چاند پرکاش اہلو والیہ (و:۱۹۲۵ء)

تیرا جمال جلوہ گلہائے تر میں ہے — تیرا جلال آتش و برق و شرر میں ہے
جس نور سے فروغ ملا مہر و ماہ کو — وہ نور جانفروز ہماری نظر میں ہے

حضرت بدایونی، پنڈت دھرم نرائن

حمد خدا کے ساتھ ہی نعت حضورؐ ہو — ایسا ضرور چاہئے ایسا ضرور ہو

رسا بدایونی، رکھی چند عرف رام دیال

ایک ہے حق نہ دوسرا مانو! — جو خدا ہے اسے خدا مانو
رسا اسم خدا ہر دم رکھو ورد زباں اپنا — نہیں کچھ غیر سے لینا، زباں اپنی دہاں اپنا

شوق بریلوی، حکیم لکھن لال (۱۸۵۰ء۔۔۱۸۹۱ء)

شرمندہ گناہ کا اعزاز دیکھئے — آغوش میں لئے ہوئے رحمت خدا کی ہے

شاد سندیلوی، منشی کا کھا پرشاد تلمیذ افضل لکھنوی

بے دست و پا کو غیب سے دیتا ہے رزق تو — پروردگار جان فدا تیری شان پر

احقر، بابو رادھے شیام (و:۱۹۰۶ء)

ہو خاک کی نوک یا گل تر — ہر چیز میں جلوہ خدا ہے
عاصی سے کہو نہ چھوڑے امید — اس کی رحمت کا در کھلا ہے

تو ہی گل میں ہے تو ہی بو میں ہے تو ہی موج میں تو ہی ساز میں
تو ہی نشو میں اور نمو میں تو ہی جملہ نقش و طراز میں

اختر، شوری لال منشی (و: ۱۹۰۹ء)

جس کا فروغ جلوہ شام و سحر میں ہے
وہ حسن لازوال ہماری نظر میں ہے

تنویر جس کی عرش پہ شمس و قمر میں ہے
جلوہ اسی کا فرش پہ اور بحر و برّ میں ہے

شوق، شنکر دت ورما (و: ۱۹۰۴ء)

قبضہ ترا دلوں پر سکّہ ترا جہاں پر
تو ہے خدائے عالم، عالم غلام تیرا

آئے جو در پہ تیرے خالی نہ اس کو پھیرے
جاری جہاں میں ہے کیا فیض عام تیرا

اخگر لکھنوی، پربھودیال (و: ۱۸۸۹ء)

دیکھنے والے اگر چشم حقیقت باز ہے
دیکھ لے ہر ایک ذرّہ جلوہ گاہ ناز ہے

آمدورفت نفس بھی معرفت کا راز ہے
سازِ ہستی نغمۂ توحید کا آغاز ہے

شاکر بریلوی، لالہ کاکھیا پرشاد (و: ۱۸۸۵ء) تلمیذ نوح ناروی

چاند میں شب کو، دن کو سورج میں
ہے جمال اس کا، ہے جلال اس کا

شمع سوزاں میں برق تاباں میں
ہے جھلک اس کی ہے جمال اس کا

عاشق کشمیری، پنڈت کنہیا لال

نہ کی عبادت نہ کچھ ریاضت نہ کی کبھی یاد حق کوئی دم
کئی گناہوں میں عمر ساری الٰہی توبہ الٰہی توبہ

ترا ہے عفو و عطا برابر مرا قصور و خطا سراسر
ہے عفو کی بس امیدواری الٰہی توبہ الٰہی توبہ

محب دریا آبادی، منشی برج بھوکن لال (و: ۱۸۸۳ء)

اٹھے گر چشم ظاہر میں سے پردہ خود نمائی کا
نظر آنے لگے ہر چیز میں جلوہ خدائی کا

وفا الہ آبادی، لالہ شنکر لال

جب تک کہ رہے جان وفا تیرے بدن میں
لازم ہے رہے ورد زباں نام خدا کا

ہندی، رائے کنہیا لال

ہیں زبان داں سینکڑوں موجود لیک
اس کی وحدت میں نہیں کرتے کلام

بے وجود جزو کل میں تیری وحدت کا وجود
نیست اور ہستی میں ظاہر ہے نشاں توحید کا

سرور، ٹھاکر پرشوتم سنگھ (و: ۱۹۰۷ء)

ہر وقت خودی میں یہ بشر ڈوبا ہوا ہے
دل ہو خودی سے دور تو کب دور خدا ہے

نارائن شیل

تیری رحمت کا اشارا چاہیے
بے سہارا ہوں سہارا چاہیے

ہر جگہ تیری تجلّی کو نمود
کیا زمیں کیا آسماں کیا کہکشاں

مشفق رتلامی، رام کرشن

عزت ملی، وقار ملا، مرتبہ ملا جو کچھ ملا ہے مجھ کو بفضل خدا ملا

شوق باندوی،، دوار کا پرشاد سریواستو(۱۸۷۹ء ـ ۱۹۴۵ء)

عجب کیا ہے کہ ہو اس حمد کا ہر لفظ نورانی کہ ہے مذکور اس میں جلوہ انوار یزداں کا

خطا و معصیت سے اس قدر شرمندہ ہوں اپنے کہ بعد مرگ بھی میں نے کفن سے اپنا منہ ڈھانکا

رمز، بہاری لال (م: ۱۳۲۵ھ)

خلاق لا مکاں میرے دل میں مکیں ہوا بیت الحزن مقابل عرش بریں ہوا

شاداں، مہاراجہ چندو لال (۱۱۸۹ء ـ ۱۲۶۱ء)

تو ہی غفار ہے مجرم ہوں ترا خطا کیوں کر نہ ہو آخر بشر ہوں

پردۂ چشم اٹھا دیدۂ تحقیق سے دیکھ جب یگانہ وہ ہوا کوئی نہیں ہے ثانی

آزاد، گورسرن ہیلی

ہر ذرہ کونین ہے گھر ذات خدا کا قبلہ ہے مگر نام فقط قبلہ نما

حواشی

۱۔ انتخاب دواوین مؤلفہ مولوی امام بخش صہبائی مرتبہ ڈاکٹر تنویر علوی
۲۔ تذکرۂ معاصرین' جلد چہارم مؤلفہ مالک رام
۳۔ تذکرہ شعرائے قصبات اودھ مؤلفہ عرفان عباسی
۴۔ ناگپور میں اردو مصنفہ ڈاکٹر شرف الدین ساحل
۵۔ دیدہ و شنیدہ مؤلفہ کریمی الاحسانی
۶۔ تذکرہ شعرائے بدایوں مؤلفہ شہید بدایونی
۷۔ آپ ہیں' حصہ اول و سوم مؤلفہ عرفان عباسی
۸۔ تاریخ شعرائے روہیلکھنڈ جلد اول و دوم مؤلفہ شایاں بریلوی
۹۔ نغزۂ ناقوس مؤلفہ بدھ پرکاش جوہر دیوبندی
۱۰۔ تاریخ' تحقیق و تذکرہ شعرائے برج پردیش مؤلفہ مقبول عرشی
۱۱۔ محراب معانی مؤلفہ سید آفاق جعفری
۱۲۔ موج گنگ مؤلفہ بدھ پرکاش جوہر دیوبندی
۱۳۔ تذکرہ شعرائے اترپردیش' پہلی' تیسری' ساتویں' نویں اور گیارہویں جلد مؤلفہ عرفان عباسی
۱۴۔ چند شناسا ادبی چہرے مؤلفہ جلال افسر سنبھلی
۱۵۔ دکن میں اردو مصنفہ نصیر الدین ہاشمی

۱۶۔ نذرانۂ عقیدت، کرسن لال ادیب لکھنوی

۱۷۔ یاد موج، حشی اختر امرتسری

۱۸۔ انتخاب حمد، غوث میاں

۱۹۔ افکار محروم، مالک رام

۲۰۔ ارج، دامودر ذکی ٹھاکور

۲۱۔ اجالے، کالیداس گپتا رضا

۲۲۔ آتش خاموش، رادھارمن جوش بدایونی

۲۳۔ عزم جواں، نارائن شیل

۲۴۔ سورج میرے تعاقب میں، ہیرانند سوز

۲۵۔ سرچشمہ، چندن بھارتی

۲۶۔ خون جگر، دھرم پال عاقل

۲۷۔ انجمنیں، شیدا انبالوی

۲۸۔ ماہنامہ "شاداب" حیدر آباد، حیدر آباد کے اردو شعراء نمبر

۲۹۔ ہفت روزہ "میرٹھ میلہ" میرٹھ کے مختلف شمارے

حمدیہ
نظمیں

سرشار صدیقی (کراچی)

وحدۃ

صبح ازل کیا
شام ابد کیا
قید مکاں کیا
وقت کی حد کیا
تو ان سب سے بالاتر ہے
تو ہی مخفی تو ہی خبر ہے
سب چہرے تیرے ہی چہرے
سارے نام ترے ہی نام
تو ہی خود اپنا شہ کار
تو ہی خود اپنا انعام

☆☆☆

کرامت بخاری (لاہور)

حمد

میں تو یہ ہی سمجھا ہوں
زندگی کے قصے کو
زیست کی عبارت کو
لفظ سارے تیرے ہیں
اور سارے لفظوں میں
گفتگو بھی تیری ہے

☆☆☆

عنبر بہرائچی (بھارت)

•

قادر مطلق!

سچے موتی جیسا جھل جھل ایک تعلق بس تیرا ہے

میں نے اِس دنیا میں سارے رشتوں کے تیور دیکھے ہیں

اپنے لہو کے ہر قطرے کی طوطا چشمی بھی دیکھی ہے

نوری جذبوں کی بانہوں میں رہ کر اپنی جان گنوائی

بدلے میں زہریلے موسم کی ساری یلغاریں جھیلیں

گرم لہو کا پاکیزہ رم آخر جب تھک ہار گیا ہے

اشکوں کی برسات تری دہلیز پہ سجدہ ریز ہوئی ہے

ایک سہانا لمس دلِ مضطر پر شبنم پاش ہوا ہے

قادر مطلق!

لفظ و معانی، رمز، کنائے، دھندلے پیکر، روشن سائے

باطن و ظاہر، سارے مظہر، اِک آنسو کے آگے ششدر

تیرے اُجالوں کی بارش میں ننھا جگنو مہر منور

سب دستاریں، ساری کلاہیں، سارے ہیرے موتی، نیلم

میرے اشک میں تیرا پرتو دیکھ کے پل میں درہم برہم

کچے رنگوں کی خواہش نے خوب مجھے مسمار کیا تھا

تیری طرف کے تازہ جھونکے نے مجھ کو بیدار کیا ہے

سانسوں کی سرگم پر سیاروں کا رقص عام ہوا ہے

قادر مطلق!

زہد و تقویٰ اور مرا یہ خاکی پیکر

کاہکشاں اور تیرہ شبی کا منظر ابتر

ہاں تیری ہر اک تخلیق سے پیار بہت ہے

تیرے ہر اظہار پہ دل سرشار بہت ہے
میرے قفس میں تیرا شعلہ جھوم رہا ہے
میری دھول کو تیرا ساون چوم رہا ہے
ننھی چڑیا کو میلوں تک صحرا بھی کہسار ملا ہے
قادر مطلق!

یہ خوش رنگ قبا دنیا جب محشر پائے
آہ و بکا، شیون کی صدائیں جب لہرائیں
اپنے آقا سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم
کا انداز شفاعت دیکھوں
ہر اُمت کے لیے پریشاں اُن (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھوں
اُن (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رحمت ریز آنسوؤں کے دامن میں
تیری قہاری پر حاوی تیری شان کریمی دیکھوں
بعد قیامت دوزخ کو بھی خلد بریں کا حصہ دیکھوں
اور آخر میں اک فرحت آمیز خموشی، جب ہر جانب دھوم مچائے
قادر مطلق!
میرے جیسے بنجارے کی ایک تمنا بھی پوری ہو
دشت☆ قرن میں آئندہ تک
میری آنکھیں اشک بہائیں

☆☆☆

(☆ عاشق صادق حضرت اویس قرنیؓ اسی صحرا میں اپنی بکریاں چرایا کرتے تھے)

نصیر احمد ناصر (آزاد کشمیر)

خلاؤں کی اسیری میں دُعا

خداوندا!

میں اک لمحہ تری بے انت صدیوں کا

مری یہ عمر تیرے وقت کی اترن ہے

نیلا آسماں ازلوں سے تیری نیند کی تقدیس ہے

تو رات کے دل میں

ستاروں کے ابد روشن کیے بیٹھا ہے

آوازیں تری خاموشیوں کی گنگناہٹ ہیں

تو نغموں کا سمندر ہے

کراں سے تا کراں پھیلی اُداسی کا مداوا ہے

مگر میری زمینوں کے مقدر میں

خلاؤں کی اسیری ہے

انھیں آزاد کر دے!

کائناتی فاصلوں میں روشنی بھر دے!!

مجھے بے انت کر دے!!!

☆☆☆

سلیم شہزاد (بھارت)

حمد لاشریک

وہ نفس کے تار کو نطق ونوا، سرلہروں، راگوں اور نغموں میں ڈھالتا ہے
وہ لفظ لفظ برسات میں معنی کے رنگوں کو اچھالتا ہے
وہ سنگ سخت بنجر میں اک دانے سے سو دانوں کی فصل نکالتا ہے
وہ پتھر کے دل میں بھی نمو کو پالتا ہے
وہ چاند، ستاروں اور جگنوؤں سے راتوں کو اُجالتا ہے
وہ تند ہواؤں میں چراغ کی لو کو اپنے دست کرم سے سنبھالتا ہے
یہ سچ ہے کہ مجھ کو قدم قدم وہ امتحان میں ڈالتا ہے
اور یہ بھی ہے سچ
یہ نطق ونوا، لفظ ومعنی
پتھر بنجر میں نمود ونما
ظلمت میں نجوم وشمس وقمر
اور گھر میں کتاب، چراغ، آنچل
ان سب کو بھی میرے قدم قدم امتحاں میں اس نے شریک کیا۔
پس یہ بھی ہے سچ
جو اس نے کیا، سب ٹھیک کیا
وہ اسم علی وعظیم ہے جو ہر امتحان کو ٹالتا ہے
مجھے بھنور حصار، اندھیرے سے جو نکالتا ہے

☆☆☆

رئیس وارثی (امریکا)

حمد باری تعالیٰ

خدائے یکتا، عظیم و برتر

تری محبت کی سرخوشی میں

مری جبیں

اور

تری زمیں کا

محیط صدیوں پہ رابطہ ہے

یہ تیری رحمت

کہ میرے دل میں

خیال تیرا بسا ہوا ہے

یہ تیری قدرت

دلوں کے اندر

چھپے ارادوں کو جانتا ہے

تری ثنا میں

پرند سارے

مدھر سروں میں چہک رہے ہیں

تری عطا سے
زمیں کے باسی
حقیر ذرّے
مہر کی صورت چمک رہے ہیں
ترے یقین کرم سے
مولا !
دلوں کے غنچے مہک رہے ہیں

ترے سحاب کرم سے
تشنہ زمیں کا چہرہ
نکھر رہا ہے
تری ہی رحمت کا سبز موسم
تپش گزیدہ رتوں کے آنچل کی دھاریوں میں
دھنک کے
سب رنگ بھر رہا ہے
یہ آسمانوں کی بیکرانی
یہ اُڑتے بادل
یہ بہتا پانی
تری جلالت سے نیلگوں ہیں
یہ حور غلماں
یہ جن و انساں
ملائکہ اور رسول سارے

یہ بزمِ فطرت کے سب نظارے
تری اطاعت میں سرنگوں ہیں

ترے ہیں لطف و کرم سے
مالک!
ہجومِ محشر کے عرصۂ بے اماں میں
لوائے رحمت کے سایۂ بے گماں میں
شفیعِ روزِ جزا سے
اپنی اور اقربا کی
مجھے شفاعت کا آسرا ہے
تری کتابِ مجید میں بھی
اسی شفاعت کا تذکرہ ہے
اور اپنا وعدہ
ہمیشہ تو نے
وفا کیا ہے

☆☆☆

ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی (بھارت)

ابو العتاہیہ، ابو نواس اور اسماعیل صبری کی حمدیہ شاعری

عربی شاعری میں نعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سلسلہ خود عہد رسول ہی میں باقاعدہ شروع ہو چکا تھا۔ بہت سے نعتیہ قصائد آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں پیش بھی کئے گئے جنہیں سن کر آپ نے خوشی کا اظہار کیا اور آپ نے بذات خود حضرت حسان بن ثابت کو حکم دیا کہ وہ حضرت ابو بکرؓ سے علم انساب سیکھ لیں تاکہ قریش کی ہجو کے وقت ان کے نسب نامے پیش نظر ہوں اور اس کی بنیاد پر وہ ان کی سخت ترین ہجویاں کر سکیں۔ (۱)

مذکورہ حکم سرور کائنات ﷺ نے انہیں اس لئے دیا تھا کہ وہ شان رسالت میں طرح طرح کی گستاخیاں کیا کرتے تھے گویا ایک طرف انہیں قریش کی ہجو کا حکم دیا گیا اور دوسری طرف اس سے یہ حکم سمجھا گیا کہ سرور کونین ﷺ کی اصل حیثیت کو منظر عام پر لایا جائے چنانچہ اس کا حق حضرت حسان بن ثابتؓ نے ادا بھی کیا۔ چنانچہ عہد رسول ﷺ سے لے کر اب تک بیشمار نعتیہ قصائد کہے گئے۔ چنانچہ نعت عربی شاعری کی ایک صنف بن گئی آج نعت کے حوالے سے عربی شاعری میں ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ جدید عربی شعراء نے تو بڑے اچھوتے لب ولہجہ میں رسول عربی ﷺ کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کئے ہیں۔

نعت سے قبل حمد کا درجہ آتا ہے لیکن نہ جانے کیوں عربی شعراء نے اس موضوع پر سرے سے توجہ ہی نہ دی۔ عربی شاعری کی ابتداء سے موجودہ عہد تک چلے آیئے ماسوا ابو العتاہیہ اور جدید عہد میں اسماعیل صبری کے کوئی ایسا شاعر نہیں ملتا جس نے حمد پر براہ راست اشعار اور قصائد کہے ہوں۔ اسماعیل صبری پوری عربی شاعری میں تنہا ایسا شاعر ہے جس نے اپنے دیوان کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے کیا ہے۔ اسے اگر شعراء کا غلو کہا جائے تو ہرگز مناسب نہ ہوگا۔ کیونکہ اصلاً تعریف اور تقدیس وتکریم کی مستحق خالق کائنات ہے۔ اللہ تعالیٰ

کے بعد جا کر آنحضور ﷺ کا درجہ ہوتا ہے۔ آخری کتاب دراصل حمد رب العالمین ہے اور اسی کے ضمن میں نعت رسول ﷺ کا ذکر ہے۔ یہ چیز اس بات کی شہادت پیش کرتی ہے کہ نعت رسول سے کہیں زیادہ حمد باری تعالیٰ ہونی چاہئے۔ خود رسول ﷺ بھی فی الحقیقت اس دنیا میں معرفت خدا اور حمد باری تعالیٰ ہی کے لئے تشریف لائے تھے۔ یہ غلو اور کثرت ہماری اردو شاعری میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ نعتوں کے بے شمار دواوین مل سکتے ہیں لیکن حمد پر مبنی دیوان شاید ہی اب تک منظر عام پر آیا ہو۔

میرے اس مقالہ میں تین شعراء ابوالعتاہیہ (۷۴۸ـ۸۲۶ء)، ابونواس (۷۶۳ـ۸۱۴ء) اور اسماعیل صبری (۱۸۵۴ـ۱۹۲۳ء) کے حمدیہ اشعار اور حمدیہ قصائد شامل ہیں۔ ان میں ابوالعتاہیہ اور اسماعیل صبری دونوں ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں حمد کے بڑے واضح خدوخال موجود ہیں۔ دونوں نے اسماء حسنیٰ کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ کی مختلف خصوصیات بیان کی ہیں۔ رہے ابونواس تو انہوں نے اصلاً زہدیات اور مناجات کے زیر سایہ اللہ کی متعدد صفات بیان کی ہیں جو کافی حد تک حمد کا حق ادا کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ عربی شاعری میں اللہ کا ایک تصور تو موجود نظر آتا ہے لیکن حمد کے نام پر ایک سناٹا نظر آتا ہے۔

عربی شاعری میں ابوالعتاہیہ کا نام تعارف کا محتاج نہیں ہے وہ اپنے اسلوب، تراکیب، رنگ و آہنگ اور موضوعات کے لحاظ سے منفرد ہے، اس کی پوری شاعری میں اسلامی روح کارفرما نظر آتی ہے۔ پوری عربی شاعری میں کوئی ایسا شاعر نظر نہیں آتا جس نے دنیا کی بے ثباتی، تقویٰ، ذکر آخرت، قبر کی تاریکی اور اللہ کی مدارت و عظمت پر اتنے سارے اشعار کہے ہوں۔

ابوالعتاہیہ "عین التمر" نامی گاؤں میں پیدا ہوا۔ یہ آفتاب و ماہتاب ۷۴۸ء میں طلوع ہوا اور آج تک اپنی ضیاء پاشیوں سے علمی دنیا کو منور کئے ہوئے ہے۔ اس کا تعلق ایک کمہار پیشہ خاندان سے تھا۔ اسی پیشہ کو سیکھتے ہوئے اس کی نشوونما ہوئی۔ انہی حالات میں وہ طبع آزمائی بھی کرتا۔ عوام اس کے آوے کے قریب اکٹھا ہو جاتے اور اس کے اشعار نقل کر کے لے جاتے۔ ایک وقت وہ آیا کہ اپنی شاعری کی وجہ سے امام الشعراء کہا جانے لگا اور خلفاء کی مجالس کی زینت تصور کیا جانے لگا۔ خلیفہ مہدی کے دربار میں قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھا گیا۔ ہارون رشید کا زمانہ آتے ہی اس کے رجحانات میں کافی تبدیلی آگئی چنانچہ اس نے زہد و ورع کو اپنی شاعری کا مرکزی موضوع قرار دیا۔ ہارون رشید نے اپنی طبیعت کی صالحیت کی وجہ سے اسے اپنا مصاحب قرار دیا۔ ۱۸۲۶ء میں عربی شاعری کا یہ امام ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے

رخصت ہو گیا۔(۲)

ابوالعتاہیہ کو ہر لمحہ اللہ کی عظمت و تقدس کا خیال رہا یہی سبب ہے کہ وہ پورے دیوان میں جا بجا حمد باری تعالیٰ میں مستغرق نظر آتا ہے۔

مقالہ میں آگے مذکورہ قصائد کے علاوہ ابوالعتاہیہ کے دیوان میں بہت سے ایسے قصائد اور مختلف قصائد میں ایسے اشعار مل جائیں گے جن میں رب کائنات کے گن گائے گئے ہیں۔ ابوالعتاہیہ کی پوری شاعری میں زبردست تعلق باللہ پایا جاتا ہے۔ دیوان کو پڑھتے جائیے ایک لمحہ ایسا نہیں آئے گا جہاں آپ کو اللہ کی موجودگی کا احساس نہ ہو۔ یاد الٰہی' ذکر خداوندی اور توجہ الی اللہ کا ابوالعتاہیہ کی شاعری میں دریارواں نظر آتا ہے۔ اسے ہر آن صفات رب کریم کا خیال رہتا ہے۔ اسی لئے جگہ جگہ اس کی شان عظیم میں رطب اللسان نظر آتا ہے۔ سچ پوچھئے تو وہ احساس خداوندی کو اوڑھ لینا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں دنیا کی بے ثباتی' ذکر آخرت' تقویٰ' عذاب قبر' اللہ کی وحدانیت اور اس کی عظمت و رفعت کا ذکر کثرت سے ملتا ہے اور بار بار شکر الٰہی کی لے میں ڈوبا نظر آتا ہے۔ ابوالعتاہیہ کا خیال ہے کہ وہ ایسا منعم اور ایسا معطی ہے کہ جس کی جتنی حمد و ثنا اور تقدیس و تعظیم کی جائے کم ہے۔

ابو العتاہیہ ایک فلسفی شاعر ہے وہ اپنے فلسفیانہ خیالات اور نظریات کو نہایت آسان زبان میں پیش کرتا ہے۔ شاید اس سے اس کا مقصد یہ ہو کہ ترسیل و ابلاغ کا حق ادا ہو سکے۔ اس کی شاعری کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو زہد و ورع سے قریب کر سکے۔ اگر دیکھا جائے تو اس کی شاعری کا کینوس بہت محدود ہے یعنی اس نے زہدیات ہی پر اپنی ساری صلاحیت صرف کر دی لیکن اس میں اس نے اپنا لوہا منوا لیا اور آج جب زہدیات کا سوال اٹھتا ہے تو اسے سر فہرست رکھا جاتا ہے۔

ابوالعتاہیہ کی شاعری میں جگہ جگہ دنیا کے بے ثباتی اس کی حقیقت اور ماہیت کا ذکر ملتا ہے' مختلف اسالیب میں دنیا سے اپنی بیزاری اور اپنی بے یقینی کا ذکر کرتا ہے اسی کے ساتھ ساتھ آخرت کا ذکر اور اللہ سے اپنے تعلق کا اظہار بھی اس کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ اسے بشری کمزوریوں کا شدید احساس تھا' اسی لئے اپنے گناہوں کی معافی کے لئے ہمہ آن اللہ کے حضور دست بدعا رہا۔ اس نے دنیا کی زینت و آرائش کے علی الرغم تقویٰ کو اصل زاد راہ قرار دیا اور خدا سے قربت کو وہ حقیقی زندگی تصور کرتا۔ انہی تمام وجوہ کی بناء پر جا بجا اس کی شاعری میں حمد باری تعالیٰ کے تصورات اور احساسات موجود ہیں۔ اس نے بڑے واضح انداز میں یہ بتایا کہ اصل ٹھکانہ اللہ ہی کے یہاں ہے اور تمام چیزیں اسی کی طرف پلٹ کر جانے والی ہیں ایک جگہ وہ

کہتا ہے۔

كل الى الرحمان منقلبه والخلق مالا ينقضى عجبة

(ہر چیز کو اللہ تعالی ہی کی طرف پلٹنا ہے اور مخلوق کی حیرانی (اللہ کی کارسازی پر) کبھی ختم نہیں ہو گی۔)

سبحان من جلّ اسمه و علا ودنا دوارت عينه حجبة (۳)

(وہ ذات عالیہ تمام آلودگیوں سے پاک ہے جس کا نام بہت ہی عظیم ہے اور وہ قریب ہے لیکن پھر بھی اس سے اس کی ذات پوشیدہ ہے۔)

یہاں پر چند اشعار اس کی مختلف نظموں سے پیش کئے جا رہے ہیں جس میں ایک اچھوتے انداز میں اللہ کے حضور نذرانۂ حمد و ثناء پیش کیا گیا ہے اور اس کی فوقیت اور برتری کو منظر عام پر لایا گیا ہے۔

الحمدلله يقضى مايشاء ولا يقضٰى عليه وما للخلق ماشاء وا (۴)

(تمام تعریفیں اس پروردگار کے لئے ہیں جو اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اس پر کسی کا حکم نہیں چلتا اور مخلوق اپنی مرضی نہیں چلا سکتی۔)

لله نعماء علينا عظمة ولله احسان و فضل عطاء (۵)

(اللہ نے ہمارے اوپر بے پناہ نعمتیں نازل کیں اور اللہ ہی کے لئے احسانات اور بیشمار عطیات ہیں۔)

تبارك الله و سبحانه لكل شيئ مدة وانقضاء (٦)

(اللہ کی ذات بابرکت ہے اور تمام برائیوں سے پاک ہے' ہر چیز کی ایک مدت اور انتہا ہے۔)

سبحان من لاشيئ يعدله كم من بصير قلبه اغمٰى

(پاک ہے وہ ذات جسکا ہمسر کوئی نہیں ہے' کتنے ہی دیکھنے والوں کے دل اندھے ہوتے ہیں۔)

سبحان من اعطاك من سعة سبحلن من اعطاك ما اعطى (۷)

(پاکیزہ ہے وہ ذات جس نے تمہیں فراخی عطا کی' پاکی کے لائق ہے وہ ہستی جس نے تمہیں بے پناہ عطا کیا۔)

ابو العتاہیہ نے اپنی نظم "جل ربی و تعالٰی" میں اللہ تعالی کی مختلف صفتوں کو بیان کیا ہے' اسے عدیم النظیر' واحد ماجد' عالم السر' کاشف الضر اور سمیع الدعاء جیسے اسماء حسنٰی

سے یاد کیا ہے۔

جل رب احادا بالاشیاء واحد ماجد بغیر حفاء

(وہ پروردگار ہے عظیم ہے جو نمایاں طور ہر چیزوں کا احاطہ کرتا ہے وہ تنہا ہے اور صاحب عظمت ہے۔)

(رب ذوالجلال تمام چیزوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ وہ تنہا صاحب مجد اور آشکارا ہے۔)

جل عن مشبه له و نظیر و تعالی حقا علی الفرقاء

(وہ مشابہت اور مثال سے بالاتر ہے اور اصلاً وہ تمام قبائل سے بالاتر ہے۔)

عالم السر کاشفت الضر یعفو عن قبیح الافعال یوم الجزاء

(وہ رازداں اور مصیبت کو ٹالنے والا ہے اور روز جزاء کے وقت میرے افعال کو درگزر کرنے والا ہے۔)

ما علی بابه حجاب ولکن هو من خلقه سمیع الدعاء (۸)

(اس کے دروازے پر کوئی پردہ نہیں ہے اور وہ اپنی مخلوق کی دعاؤں کو سننے والا ہے۔)

نظم "اللہ یعطی بلا حساب" میں ابوالعتاہیہ نے بتایا کہ اللہ تعالی بے حد و حساب دیتا ہے' اور دنیا کی تمام چیزوں کو اس نے ایک حکمت کے پیش نظر بنایا۔ یہ دنیا کا کارخانہ اس کی حکمتوں کے مطابق چلتا ہے یہ خیال کتنے اچھے طور پر اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔

سبحان من یعطی بغیر حساب ملك الملوك و وارث الاسباب

(بابرکت ہے وہ ذات جس نے بے حساب دیا ہے' وہ بادشاہوں کا بادشاہ اور اسباب کا مالک ہے۔)

مدبر الدنیا و جاعل لیلها سکنا و منزل غیث کل سحاب

(وہ دنیا کو چلانے والا' رات کو آرام کے لئے بنانے والا اور ہر بادل سے بارش کا نازل کرنے والا ہے۔)

یانفس! لاتتعرضی لعطیة الا عطیة ربك الوهاب (۹)

(اے نفس! تم کسی عطیہ کو مت طلب کرو' تمہیں تو صرف اپنے عطا کرنے والے رب کے عطیہ کو طلب کرنا چاہئے۔)

نظم "سبحانہ تعالی" میں صرف دو شعر ہیں' لیکن انہی دو شعروں میں کافی حد تک

اللہ کی قدرت و عظمت کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میرے اپنے خیال میں یہ دو شعر طویل سے طویل نظموں پر بھاری ہیں۔

سبحان من لم تـزل له هجج قامت على خلقه بمعرفته

(پاکیزہ ہے وہ ذات جس کے (وجود) کے لئے متعدد دلیلیں ہیں۔ اپنی معرفت کے سبب اپنی مخلوق کے سامنے کھلا ہوا ہے۔)

قد علموا انه الاله و لكن عجزالواصفون عن صفته (۱۰)

(انہیں خوبی معلوم ہے کہ وہی معبود ہے، لیکن اس کی خوبیاں بیان کرنے والے اس کی خوبیوں کے بیان کرنے سے قاصر ہیں۔)

ابو العتاہیہ کی ایک نظم "لك الحمد يا ذا العرش" کے عنوان سے ہے، جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہی عبادت کے لائق ہے اور ہر جگہ ہر وقت موجود رہتا ہے اور کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔

لك الحمد ياذاالعرش ياخير معبود ويا خير مسؤول ويا خير محمود

(اے عرش والے، اے سب سے اچھے معبود، اے سب سے بہتر ذمہ دار اور اے سب سے عمدہ تعریف کے مستحق تیرے ہی لئے تمام تعریفیں ہیں۔)

شهد نالك اللّٰهم ان لست محدثا ولكنك المولى ولست بمجحود

(اے اللہ! ہم گواہ ہیں کہ تو ختم ہونے والا نہیں ہے بلکہ تو ہی مولا ہے اور تمہارا انکار نہیں کیا جاسکتا۔)

وانك معروف ولست بموصوف وانك موجود ولست بمحدود

(اور تم بیشک معروف و مشہور ہو اور تمہاری مکمل صفت بیان نہیں کی گئی ہے اور تم موجود ہو اور محدود نہیں ہو۔)

وانك رب لاتزال و لم تزل قريباً بعيداً غالباً غير مفقود (۱۱)

(اور تم لازوال رب ہو، اور تم مستقل قریب و بعید رہو گے، تمہارا غلبہ دائمی ہے اور تم غیر مفقود ہو۔)

"كل يزول و كل يبيد" میں خداوند کریم کی متعدد صفات پیش کی گئی ہیں۔ پوری نظم سے یہ خیال منظر عام پر آتا ہے کہ بجز اللہ کے تمام چیزیں حادث اور فانی ہیں۔ ابو العتاہیہ کے اسی خیال کو غالب نے یوں کہا تھا۔

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

الا ان ربی قویؑ مجید لطیفؑ جلیلؑ غنیؑ حمید
(اس میں کوئی شک نہیں کہ میرا رب طاقتور' صاحب مجد' مہربان' بلند ترین' بے نیاز اور لائق تعریف ہے۔)

رأیت الملوك و ان عظمت فان الملوك لربی عبید
(میں نے عظیم سے عظیم تر بادشاہوں کو دیکھا ہے۔ بیشک سلاطین میرے رب کے غلام ہیں۔)

واحسان مولاك یا عبده الیك حدی الدھرؑ غض جدید
(اے اس کے بندو! تمہارے مولا کی کرم فرمائیاں تم لوگوں پر زمانے کی حد تک رہیں گی اور ہمیشہ تر و تازہ رہیں گی۔)

ترید من اللہ احسانه فیعطیك اکثر مما ترید
(تم اللہ سے اللہ کے احسان کے خواہاں ہو' تو وہ تمہیں تمہاری خواہش سے کہیں زیادہ دے گا۔)

ولم یکفر العرف الاشقی ولم یشکر اللہ الاسعید (۱۲)
(صرف بدبخت ہی تسلیم شدہ حقیقت کا انکار کر سکتا ہے اور بجز خوش بخت کے کوئی اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا۔)

نظم "لاحاجة مع اللہ الی احد" میں یہ بتایا گیا کہ بندے کو اللہ کے علاوہ کسی کی ضرورت نہیں' وہی قاضی الحاجات اور حاجت روا ہے' مصائب و آلام میں واحد سہارا ہے۔

الحمد للہ الواحد الصمد فھوالذی به رجائی و سندی
(تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جو اکیلا ہے اور (سب کا) سہارا ہے پس وہی ذات ہے جس سے میری امیدیں اور میرا اعتماد جڑا ہوا ہے)

علیه ارزاقنا فلیس مع اللہ بنا حاجة الحا احد (۱۳)
(ہمارے رزق کی ذمہ داری اسی پر ہے' اللہ کے ہوتے ہوئے کسی اور کی ہمیں ضرورت نہیں۔)

دوسری نظم "اللہ یقضی و یقدر" ہے جس میں یہ بتایا گیا کہ قضاء و قدر کا مالک کل اللہ تعالیٰ ہے اس کے حکموں کے سامنے کسی کا حکم نہیں چل سکتا۔

للعمر ابی لواننی اتفکر رضیت بما یقضی علی و یقدر
(میں اپنے والد کی عمر کے حوالہ سے یہ کہہ رہا ہوں کہ کاش میں غور و خوض کرتا

اور اپنے متعلق اللہ کے قضا اور قدر پر راضی ہو جاتا۔)

توکل علی الرحمان فی کل حاجة　　اردت فان اللہ یقضی و یقدر

(اپنی ہر ضرورت کے وقت اللہ کا سہارا ڈھونڈو' کیونکہ اللہ ہی قضا و قدر کا مالک ہے۔)

متی مایرد ذوالعرش امراً بعبده　　یصیبه و ما للعبد مایتخیر

(جب بھی صاحب عرش اپنے بندے کے ساتھ کچھ کرنا چاہتا ہے وہ ہو جاتا ہے اور بندہ اپنی مرضی چلانے سے قاصر ہے۔)

وقد یهلك الانسان من و جة آمنه　　وینجو باذن اللہ من حیث یحذر (۱۴)

(اور کبھی انسان اپنے امن ہی کے سبب ہلاک ہو جاتا ہے اور وہ خطرے کی جگہ سے اللہ کے سبب نجات پاتا ہے۔)

نظم "الی اللہ تصیر الامور" کے تین اشعار نقل کیے جا رہے ہیں جس میں یہ بتایا گیا کہ تمام امور کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔

الا الی اللہ تصیر الامور　　ما اتت یا دنیای الا غرور

(یہ بات ذہن نشین رہے کہ تمام امور اللہ کی طرف پلٹتے ہیں اور اے میری دنیا تم دھوکہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو)

اذا عرفت اللہ فاقنع به　　فعندك الحظ الجزیل الكثیر

(جب تمہیں اللہ کی معرفت حاصل ہو جائے تو اسی پر قانع ہو جاؤ' اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارے حصہ میں بہت بڑا حصہ آئے گا۔)

تبارك اللہ فسبحانه　　من جهل اللہ فذاك الفقیر (۱۵)

(بابرکت ہے اللہ کی ذات اور تمام آلودگیوں سے پاک ہے' جسے اللہ کی معرفت حاصل نہ ہوئی وہی اصلاً فقیر ہے۔)

"اعاجیب اللہ تعالیٰ" میں ابوالعتاہیہ نے یہ بتایا ہے کہ اللہ کی اس کائنات میں بیشمار نیرنگی اور بو قلمونی ہے اس کے عجائبات اور کرشمہ سازیاں عقل انسانی سے بالاتر ہیں۔ اس کی حکمتوں کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ عقلیں دنگ اور اذہان حیران ہو جاتے ہیں۔

وتصریف هذا الخلق للہ وحده　　وكل الیه لامحالة راجعٌ

(تنہا اللہ ہی اس مخلوق کے اندر تصرفات کا مستحق ہے اور لامحالہ ہر شئے کو لوٹ کر اسی کی طرف جانا ہے۔)

وللہ فی الدنیا اعاجیب جمة　　تدل علی تد بیره و بدائع

(دنیا میں اللہ کے بیشمار عجائبات ہیں اس کی نیرنگیاں اس کی حسن تدبیر پر دلالت کرتی ہیں۔)

ولله اسرار الامور وان جرت بها ظاهراً بين العباد المنافع

(اور معاملات کے اسرار اور موز اللہ ہی کے پاس ہیں گرچہ ظاہری طور پر معاملات کے فوائد بندوں کے مابین جاری ہیں۔)

ولله احكام القضاء بعلمه الافهو معط مايشاء و مانع (١٦)

(اور اللہ کے قضاء وقدر کے فیصلے اس کے علم میں ہیں اور وہ جو چاہتا ہے دیتا ہے اور جو چاہتا ہے روکتا ہے۔)

"لارب سواک" میں اللہ کی مختلف صفتوں کو پیش کیا گیا ہے۔ ابو العتاہیہ کا کہنا ہے کہ وہی ہماری آرزوؤں کا ٹھکانہ ہے اگر اس کی طرف سے ہدایت نہ ہوئی تو زندگی تاریکیوں اور ظلمتوں کے سپرد ہو جائے گی اور وہ بنی نوع انسان کا ہر طرح سے احاطہ کئے ہوئے ہے۔

لارب ارجوه لى سواك اذلم يخب سعى من رجاك

(تمہارے علاوہ کوئی رب نہیں ہے کہ جس سے توقع کی جائے۔ تم سے امید کرنے والوں کی کوشش ناکام نہیں ہوگی۔)

انت الذى لم تزل خفيا لم يبلغ الوهم منتهاك

(تمہاری یہی وہ ذات ہے جو مستقل پوشیدہ رہتی ہے۔ وہم وگمان تمہاری انتہاؤں تک رسائی سے قاصر ہیں۔)

ان انت لم فهدنا ضللنا يارب ان الهدى هداك

(اگر تیری ہدایت نہ ہو تو ہم ضلالتوں میں گم ہو جائیں۔ اے میرے رب تیری ہی ہدایت اصلاً ہدایت ہے۔)

اهلت علماً بنا جميعا انت ترانا ولا تراك (١٧)

(ہم تمام لوگوں کا تم نے دانستہ طور پر احاطہ کیا ہے۔ تم ہمیں دیکھ رہے ہو اور ہم تمہارا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔)

"ارغب الى الله" میں شاعر نے اللہ اور بندے کا تعارف پیش کیا ہے۔ بندے کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ ذات الٰہی میں گم ہو جائے اور دنیاوی فتن سے خود کو دور رکھے۔ اس چیز کو کتنے اچھے انداز میں شاعر نے اس طرح پیش کیا ہے۔

الى الله فارغب لاالى ذاو لازاك فانك عبدالله والله مولاك

(یہاں وہاں کے جائے اللہ کے ہو کر رہ جاؤ کیونکہ تم اللہ کے بندے ہو اور اللہ تمہارا کارساز ہے۔)

"تبارك الله" میں بھی اللہ کی مختلف صفات کو منظر عام پر لانے کی اچھی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے چار اشعار یہاں نقل کئے جا رہے ہیں۔

تعالٰی الواحد الصمد الجلیل وحاشیٰ ان یکون له عدیل

(بلند ترین ہے وہ ذات جو بے نیاز ہے اور عظیم ترین ہے اور یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی اس کا ہمسر ہو۔)

هوالملك العزیز و کل شیئٍ سواهٗ فهو منتقص ذلیل

(وہ بادشاہ ہے' طاقت ور ہے اور اس کے علاوہ تمام چیزیں ناقص اور حقیر ترین ہیں۔)

وما من مذهب الا الیه ولا سبیله لهو السبیل

(اس کے راستے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے اور اسی کا راستہ سچ پوچھئے تو راستہ ہے۔)

وانا له لمنا لیس یحصیٰ وان عطاءه لهو الجزیل (۱۸)

(احسانات اسی کے ہیں جن کا استقصاء ممکن نہیں ہے اور اس کے عطیات غیر محدود ہیں۔)

"کل شیئ ماسوی الله زائل" ایک طویل نظم ہے جس میں ابوالعتاہیہ نے بڑے پُرزور انداز میں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ یہ دنیا فانی ہے۔ فنا ہی اس کی اصل شناخت اور بنیادی پہچان ہے۔ صرف واحد ہستی رب ذوالجلال کی ہے جو حدوث و فنا سے عظیم تر ہے۔ اس کے دو شعر یہاں حاضر ہیں۔

الا کل شئی زال فالله بعده کما کل شئی کان فالله قبله

(تمام چیزوں کے زوال کے بعد اللہ برقرار رہے گا اسی طرح تمام چیزوں سے قبل بھی اللہ موجود تھا۔)

الا کل شئی ماسوی الله زائل الا کل ذی نسل یموت و نسله (۱۹)

(اللہ کے علاوہ تمام چیزیں فانی ہیں اور ہر صاحب نسل نیز اس کی نسل ضرور موت کا مزہ چکھے گی۔)

اسی میں دو شعر ایسے بھی ہیں کہ یہ ہمیں ہرگز دھوکہ نہ ہو کہ کوئی چیز اپنے بل سے

حاصل کر سکتے ہیں بلکہ اللہ تو ہمیں ایسی ایسی نعمتوں سے نوازتا ہے جن کے ہم اہل بھی نہیں ہیں۔

وما قال عبد قط فضلا بقوة ولکنه من الا له و فضله

(اور کبھی بھی بندہ کوئی فضل اپنی کوشش سے حاصل نہیں کر سکتا بلکہ بندہ کی ہر شے منجانب اللہ ہے۔)

لنا خالق یعطی الذی هوا اصله ویعفو ولا یجزی بما نحن اهله(۲۰)

(ہمارا ایک خالق ہے، جس کی پہچان یہ ہے کہ دیتا رہتا ہے اور معاف کرتا رہتا ہے اور ہمارے کرتوت کے مطابق نہیں دیتا۔)

ابو العتاہیہ کی ایک نظم "اللّٰہ حلیم کریم رحیم" کے عنوان سے ہے، جس میں اللہ کی مختلف خصوصیات کے حوالہ سے اس کی تعریف کی گئی ہے اس نظم کو پڑھنے سے تضرع اور خشیت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ابو العتاہیہ کا خیال ہے کہ اگر خلوص نیت سے اس کے حضور حاضری دی جائے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ سوالات کو رد کر دے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ اللہ اپنے بندہ سے شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

سمیت نفسك بالكلام حكیما ولقد اراك علی القبیح مقیما

(تم نے اپنے آپ کو حکیمانہ کلام سے منسوب کیا اور میں نے تمہیں اسے دکھلایا جو قبح پر ڈیرا ڈالے ہوئے ہے۔)

وعصیت ربك یا ابن آدم جاهداً فوجدت ربك اذ عصیت حلیما

(اے ابن آدم! تم نے اپنے رب کی شدید نافرمانی کی ہے۔ لیکن نافرمانی کے باوجود تم بردبار پاؤ گے۔)

وسالت ربك یا ابن آدم رغبه فوجدت ربك اذسالت كریما

(اے ابن آدم! تم نے اپنے رب کو چاہت سے پکارا یہی وجہ ہے کہ سوال کے وقت تم نے اسے مہربان پایا۔)

و دعوت ربك یا ابن آدم رهبة فوجدت ربك اذ دعوت رحیما

(اے ابن آدم! تم نے رہبت کے تئیں اپنے رب کو پکارا، یہی سبب ہے کہ اپنی پکار کے وقت تم نے اسے کرم فرما پایا۔)

فلئن شكرت لتشكرن لمنعم ولئن كفرت لتكون عظیما (۲۱)

(اگر تم نے شکر ادا کیا تو تم نے منعم کا شکر ادا کیا اور اگر تم نے ناشکری کی تو یقیناً تم

نے ایک عظیم شخصیت کی ناشکری کی۔)

نظم "تقوی الله اکبر فخر" میں اللہ کے متعدد اسماء حسنیٰ کا ذکر کیا گیا ہے اور متعدد ایسے اشعار ہیں جن میں غفور الرحیم کے گن گائے گئے ہیں۔

ایاربُ یاذا العرش أنت حکیم　　وانت بما تخفی الصدوره علیم

(اے رب! اے صاحب عرش تو تو حکمتوں کا مالک ہے اور تو سینوں میں چھپے ہوئے رازوں سے واقف ہے۔)

فیارب! هب لی منك حلما فانی　　اری الحلم لم یندم علیه حلیم

(اے رب! مجھے بردباری عطا فرما، کیونکہ بردبار اپنی بردباری پر پشیمان نہیں ہوتا ہے۔)

فیارب! هب لی منكَ عزماً علی التقی　　اقیم بهٗ ماعشت حیث اقیم (۲۲)

(اے رب! مجھے تقویٰ پر استقلال عطا فرما۔ میرا جہاں کہیں بھی قیام ہو، تقویٰ ہی پر قیام ہو۔)

"الله لا یبلی له سلطان" میں رب ذوالجلال کی حمد و ثنا کے موتی بکھیرے گئے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابوالعتاہیہ کے جذبات واحساسات امنڈے چلے آرہے ہیں۔ الفاظ وتراکیب قرطاس پر سجتے چلے جارہے ہیں اور دل تک اس نظم میں آورد کا گزر نہیں ہے۔ پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی حقیقت ہے جو آشکارا ہوتی چلی جارہی ہے اور قاری پر اپنا سحر چھوڑتی چلی جارہی ہے۔ یہاں پر چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

سبحان من لاشیئی یحجب علمه　　فاالرا جمع عنده اعلان

(وہ پاکیزہ ذات ایسی ہے جس کے علم سے کوئی شے باہر نہیں ہے راز اس کے نزدیک بالکل واضح اور عیاں ہیں۔)

سبحان من هو لا یزال مسبحاً　　ابداً ولیس لغیره السبحان

(وہ ذات آلائشوں سے پاک ہے اور اس کی ہمیشہ غیر منقطع تعریف ہوتی رہے گی اس کے علاوہ کوئی ذات نقص سے پاک نہیں۔)

سبحان من تجری قضایاه علی　　ماشاء منها غائب و عیان

(وہ فسق وفجور سے پاک ہے اور اس کے امور اس کی مرضی کے مطابق نافذ ہوتے ہیں اُن میں سے کچھ پوشیدہ ہیں اور کچھ عیاں۔

ملك عزیز لا یفارق عزه　　یعصی ویرجی عنده الغفران

(وہ ایسا قوی بادشاہ ہے جس کی شرافت اس سے ملک نہیں کی جا سکتی اس کی بڑائی کے باوجود اس سے بخشش کی توقع کی جاتی ہے۔)

ملك له ظهر القضاء و بطنه   لم قبل جدة ملكه الارملن (۲۳)

(وہ ایسا بادشاہ ہے جو اپنے فیصلہ کو ظاہر بھی کرتا ہے اور پوشیدہ بھی رکھتا ہے۔ زمانے میں کوئی اس کی بادشاہت کی تروتازگی ختم نہیں کر سکتا۔)

ابوالعتاہیہ نے اپنی نظم "یارب انت خلقتنی" میں نہایت عاجزی کے ساتھ اپنے پروردگار سے کہا کہ تم نے مجھے بے پناہ نعمتوں سے نوازا ہے اور میں تیری شکر گزاری میں لگا ہوا ہوں لیکن تمہاری نصرت و معاونت کے بغیر میرے اندر اتنی تاب نہیں کہ تمہارا شکر ادا کر سکوں۔

اس نظم کا ایک شعر ملاحظہ کریں۔

مالی   بشكرك   طاقة   يا سيدى ان لم تُعِنّى (۲۴)

(اے میرے آقا! اگر تمہاری مدد شامل حال نہ رہی تو میرے اندر کہاں اتنی استطاعت کہ تمہارا شکر ادا کر سکوں۔)

ابو نواس اپنے عہد کا نہایت ممتاز شاعر تھا' اسے خمریات کا امام تصور کیا جاتا ہے۔ اس نے شراب کی خصوصیات جس انداز و پیرایہ میں بیان کی ہیں وہ اسی کا حصہ تھا' ایک دور ابو نواس پر ایسا بھی آیا ہے کہ وہ اپنی خمریاتی شاعری سے تائب ہو گیا اور اس کے رگ و پے میں زہدیات کی روح دوڑنے لگی۔ چنانچہ اس نے زہدیات کے موضوع پر بعض ایسے اشعار کہے کہ جن پر ابوالعتاہیہ جیسا عظیم زاہد شاعر اپنی پوری شاعری کو قربان کر دینا چاہتا تھا۔ ابو نواس کی زہدیات میں حمد کا پورا پورا عکس موجود ہے۔

ابو نواس ۷۶۳ء میں علاقہ اہواز کی ایک بستی میں پیدا ہوا' بصرہ میں پرورش ہوئی۔ وہاں سے بغداد گیا۔ ۸۱۴ء میں وہیں انتقال ہوا۔ ابو نواس کو اہل علم کی صحبت کا بڑا خیال تھا۔ مشہور شاعر والبہ بن حباب سے اسے ملنے کا شدید اشتیاق تھا۔ اتفاق سے اس شاعر کا گذر اس عطار کی دکان سے ہوا جس پر ابو نواس کام کرتا تھا' اسے ابو نواس کی ذہانت کا علم ہوا تو اسے ساتھ لیتا گیا۔ چنانچہ بصرہ میں ابو نواس نے شاعری میں اپنا مقام پیدا کیا۔ اسے ہارون رشید کے دور میں بڑی قدر و منزلت ملی۔ ابو نواس صوبوں کے گورنروں کی بھی تعریف کیا کرتا تھا۔ مصر کے گورنر خصیب کی بھی اس نے تعریف کی۔ بعد میں وہ محمد الامین کا درباری شاعر بن کر رہ گیا جس نے ایک جرم میں اسے سزائے قید دی۔ رہائی کے بعد وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملا۔ (۲۵)

ابو نواس کی زہدیہ شاعری بہت تھوڑی مقدار میں ہے لیکن اپنی انفرادیت اور غیر معمولی تاثیر کی وجہ سے عربی شاعری کی تاریخ اس لازوال نقوش کی حیثیت اختیار کر گئی۔

ابو نواس جس طرح اپنی خمریات اور غزلیات کی وجہ سے انفرادیت کا حامل ہے اسی طرح اپنی زہدیات میں اپنی مثال آپ ہے اس موضوع سے متعلق اس کے اشعار میں حد درجہ خدا ترسی تضرع اور خشیت پائی جاتی ہے۔ وہ دنیا سے کٹ کر خود کو اللہ کے سپرد کر دینا چاہتا ہے۔ وہ اللہ کے حضور گڑگڑاتا اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتا ہے۔ وہ اسی در کو حقیقی ملجا اور آخری ماویٰ تصور کرتا ہے۔ زہدیات سے متعلقہ شاعری کو پڑھیے تو وہ ایک سچا مومن اور پکا مسلم نظر آتا ہے اور یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ خمریات کا ماہر رہا ہوگا کیونکہ اس کی زہدیات میں دنیا سے بیزاری اور اللہ تعالیٰ سے غیر معمولی تعلق نیز روز قیامت کا زبردست احساس پایا جاتا ہے۔

وامهد لنفسك قبل ميتك وانخر يوم تفاضل الآخر (۲۶)

(اور اپنی موت سے قبل اپنے نفس کا ٹھکانہ بنالو اور زاد راہ اس دن کے لئے جمع کرو جس دن اچھا بدلہ دیا جائے گا۔)

أوليت شعرى كيف انت اذا غسلت بالكافور والدر (۲۷)

(یا کاش کہ مجھے اس کا علم ہوتا کہ جس وقت تمہیں کافور اور بیری کے پانی سے غسل دیا جا رہا ہوگا تمہاری کیا کیفیت ہوگی۔)

انا العبد الحقر بكل ذنب وانت السيد المولى الغفور (۲۸)

(میں ایک حقیر بندہ ہوں جو اپنے ہر گناہ کا اعتراف کر رہا ہے اور تم سردار، آقا اور بخشنے والے ہو۔)

الم تر جوهر الدنيا المصفى و محزجه من البحر الاجاج (۲۹)

(کیا تمہیں دنیا کے حقیقی جوہر کا اندازہ نہیں ہے یہ قیامت غمگین اور کڑے سمندر سے نکل کر آیا ہے۔)

ایک طرف ابو نواس کی زہدیات میں جہاں عبدیت، گناہوں کا احساس، ذکر آخرت اور دنیا کی ذلت و حقارت کا حد درجہ شعور پایا جاتا ہے۔ وہیں بڑے واضح انداز میں خداوند قدوس کی تسبیح و تعریف پائی جاتی ہے۔ اسی کو تمام قوتوں کا سرچشمہ تصور کیا جاتا ہے اور اسی کے حضور شاعر عفو و درگزر کا طلبگار ہوتا ہے۔

افراليك منك و اين الا اليك يفرمنك المستجير (۳۰)

(تمہارے رتبے کے سبب میں تمہاری طرف بھاگ رہا ہوں اور بجز تمہارے

کہاں جایا جائے اُجرت کا طلبگار تیری ہی طرف بھاگتا ہے۔)

تبارک رب رحا ارضة واحكم لقد يرا قواتها (۳۱)

(بابرکت ہے رب کی ذات جس نے زمین کو بچھایا اور اس کے رزق کی حیثیت کو متعین کیا۔)

غفرالله ذنب من خاف فاستشعر الحذر (۳۲)

(اللہ نے اس شخص کے گناہوں کو معاف کیا جس نے خشیت اختیار کی اور اس کے اندر احساس پرہیزگاری پیدا ہوا۔)

انی لامقت نفسی عند نخوتها فكيف آمن مقت الله اياها (۳۳)

(جب نفس کے اندر کبر و نخوت پیدا ہوا تو میں اس سے نفرت کرنے لگا' میں اس کے سلسلے میں اللہ کی ناپسندیدگی سے کیسے مطمئن ہو سکتا ہوں۔)

مذکورہ اشعار میں ابو نواس نے اللہ تعالیٰ کو حقیقی الٰہ تصور کیا ہے' اسی کو غافر الذنوب قرار دیا اور یہ بتایا کہ زمین کو بچھا کر اس میں نسل انسانی کے رزق کو عام کر دیا ہے۔ اس کے بعد ابو نواس کی ایک نظم "رقیب" نقل کرتا ہوں جس سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ زمانے کے تمام نشیب و فراز سے واقف ہے۔ اس کی نظر سے کوئی پوشیدہ نہیں ہے اس لئے ہر شخص کے پیش نظر یہ چیز ہمہ آن رہنی چاہئے کہ وہ ہمارے تمام اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

اذا ما خلوت الله هو يوماً فلاتقل خلوت و لكن قل على رقيب

(جب تم کسی وقت زمانہ سے الگ ہو جاؤ تو یہ ہرگز مت کہو کہ الگ ہو گیا بلکہ یہ کہو کہ مجھ پر ایک نگراں ہے۔)

ولا تحسبن الله يغفل ساعة ولا ان ما يخفى عليك يغيب

(اور تم ہرگز مت گمان کرو کہ اللہ ایک گھڑی بھی غافل ہے اور تم سے پوشیدہ چیزیں غائب نہیں ہوں گی۔)

لهونا بعمر طال حتى ترادفت ذنوب على آثارهن ذنوب (۳۴)

(عمر دراز میں ہم کھوئے رہے' یہاں تک کہ پیہم گناہ ہوتے رہے اور گناہ پر گناہ لاتے گئے۔)

نظم "الامل الکذوب" میں ابو نواس نے اللہ کی اس طرح تعریف کی ہے۔

سبحان علام الغيوب عجبا لتصريف الخطوب (۳۵

(بابرکت ہے وہ ذات اقدس جو غیب کو بہت جاننے والی ہے اور گردش روزگار

بدلنے والی ہے۔)

ابو نواس کی نظم "اللہ اعلیٰ" میں یہ بتایا گیا کہ بقا اور دوام صرف اللہ کو حاصل ہے اور کوئی چیز اس کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے۔

کل تاع فیتفی کل باك فیبکی

(ہر خبر مرگ دینے والے کی خبر مرگ دے جائے گی اور ہر رونے والے پر عنقریب رویا جائے گا۔)

کل مذهور سیغنٰی کل مذکور سینسی

(ہر جمع کردہ شی عنقریب فنا ہو جائے گی اور ہر ذکر کردہ بات عنقریب فراموش کر دی جائے گی۔)

لیس غیراللّٰه . تبقی من علا فاللّٰه اعلی

(اللہ کے علاوہ کسی کو دوام حاصل نہیں ہے۔ جو شخص بلند ہوا اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ سب سے اعلیٰ ہے۔)

ان شیئا قد کفینا له نسفی و نشقی

(جس چیز کے لئے ہم کوشش کرتے ہیں یا اس کے حصول سے محروم رہتے ہیں دونوں ہی صورت ہمارے لئے کافی ہے۔)

ان للشرو للخیر لسیما لیس تخفی

(تم اپنے نیک اعمال اور اعمال بد سے ہرگز بچ نہیں سکتے ہو۔)

کل مستخف بسرّ فمن اللّٰه بمرأی

(ہر رازدار چیز سے اللہ بخوبی واقف ہے۔)

لا تری شئیاً علی اللّٰه من الاشیاء یخفی

(تم کوئی ایسی شی نہیں پاؤ گے جو کہ خداوند قدوس سے پردہ غیب میں ہو۔)

ابو نواس کی نظم "تضرع" میں جہاں بندہ عجز و انکساری کے ساتھ اپنے گناہوں کی معافی چاہتا ہے، وہیں وہ اللہ کو اعظم، محسن، رحیم اور امیدوں کا مرکز تصور کرتا ہے، یعنی گناہوں کو وہی معاف کر سکتا ہے جو ان صفات سے متصف ہو۔

یا رب ان عظمت ذنوبی کثرة فلقد علمت بان عفوك اعظم

(اے بار الہا! مجھے اپنے گناہ کی کثرت کا اندازہ ہے لیکن یہ بھی مجھے بخوبی معلوم ہے کہ تیری عفو و در گزر اس سے بھی عظیم تر ہے۔)

ان کان لایر جوك الامحسن فمن یلوذو یستجیر المجرم

(وہ تمہیں محسن سمجھتے ہوئے اصلاً لو لگائے ہوئے ہے۔ اب کون ہے جس سے مجرم مدد چاہے اور جس کی پناہ ڈھونڈھے۔)

ادعوك رب کما امرت تضرعا فاذا رددت یدی فمن ذا یرحم

(میں تمہارے حکم کے مطابق تمہیں گڑگڑاتے ہوئے یاد کر رہا ہوں۔ اگر تم میرے ہاتھوں کو جھٹک دیتے ہو تو تم کس پر رحم کروگے۔)

مالی الیك وسیلة الاالرجا و جمیل عفوك ثم انی مسلم (۳۷)

(تم سے امید کے بجز میرا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے اور تیرے حسن عفو سے میں واقف ہوں اور پھر تیرا ہی تو مطیع و منقاد ہوں۔)

نظم "اللہ المدبر" میں ابونواس نے اللہ کی یہ صفت پیش کی ہے کہ وہ اکبر عفو ہے، قاضی، قادر اور مدبر ہے، اس کی تدبیر و ترکیب کے سامنے تمام تدابیر اور تراکیب لایعنی اور مہمل ہیں۔

یا کبیر الذنب عفوا للہ من ذنبك اکبر

(اے بڑے بڑے گناہ کرنے والے تمہیں معلوم نہیں کہ عفو الٰہی تمہارے گناہ سے عظیم تر ہے۔)

اکبر الاشیاء عن اہ خرعفو اللہ اصغر

(بڑے سے بڑا گناہ اللہ کے چھوٹے سے چھوٹے عفو سے بھی چھوٹا ہے۔)

لیس للانسان الا ماقضی اللہ وقدر

(انسان کے لئے کچھ نہیں ہے مگر جو کچھ اس کے لئے وہ فیصلہ کردے اور اس کے حق میں مقرر کردے۔)

لیس للمخلوق تدب یربل اللہ المدبر (۳۸)

(مخلوق کے لئے کوئی تدبیر نہیں ہے بلکہ اصل مدبر اللہ تعالیٰ ہے)

ابونواس نے اپنی نظم "یاسائل اللہ" میں یہ مدعا منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے کہ اللہ اپنے سوالیوں کو مایوس نہیں کرتا۔ انسان اللہ تعالیٰ سے سوال کرکے مایوس ہوتا ہے کہ اللہ کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ سوالات کو رد نہیں کرتا اس لئے انسان کو ان صفات کی حامل ذات سے آس لگانی چاہئے۔

فارغب الی اللہ لا الی بشر منتقل فی البلی و فی الغیر

(پس تم اللہ کی طرف راغب ہو جاؤ نہ اس بشر کی جانب جو مصائب اور گردش روزگار میں گھر جانے والا ہے۔)

فارغب الی الله لا الی جد منتقل من صبا الی کبر

(پس تم اللہ کی طرف بڑھو نہ کہ جسد خاکی کی طرف جو جوانی سے بڑھاپے کی طرف جانے والا ہے۔)

ان الذی لا یخیب سائله جوهره غیر جوهرالبشر (۳۹)

(یقیناً یہ وہ ذات ہے جس سے سوالی مایوس نہیں ہوتا ہے' اس کی اصلیت انسانی اصلیت سے جداگانہ ہے۔)

یہاں پر ابو نواس کی ایک طویل نظم "نجوی و دعاء" نقل کر کے یہ سلسلہ بند کیا جائے گا۔ اس نظم میں اللہ کی مختلف صفات کا ذکر کرتے ہوئے اس کی تسبیح و تقدیس کی گئی ہے۔ اسے سلاطین کا سلطان' وحدانیت کا علمبردار اور شرکاء سے مبرا قرار دیا گیا ہے چونکہ اس نظم میں ایک خاص رنگ اور ایک خاص لے موجود ہے اس لئے اسے پوری کی پوری نقل کیا جارہا ہے۔ اس میں ابو نواس بار بار یہ کہہ رہا ہے کہ تمام کی تمام تعریفیں اللہ واحد کے لئے ہیں' اور ہم دربار الٰہی میں دست درازی کے ساتھ حاضر ہیں۔

الهنا ما اعدلك مليك كل ملك

(ہمارا رب کس قدر انصاف پسند ہے اور وہ تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔)

لبيك قد لبيت لك

(میں تمہارے حضور سر فگندہ ہوں اور تمہاری آواز پر لبیک کہتا ہوں)

لبيك ان الحمد لك والملك لا شريك لك

(میں تمہارا منقاد ہوں کیونکہ تعریف کے مستحق تمہی ہو اور تمہاری بادشاہت میں تمہارا کوئی شریک نہیں ہے۔)

ما خاب عبد سالك انت له حيث سلك

(تم سے سوال کرنے والا کوئی بندہ نامراد نہیں ہوا۔ وہ جہاں جائے تو ہی اس کا دستگیر ہے۔)

لو لاك يا رب هلك

(اے میرے پروردگار! اگر تو نہ ہوتا تو وہ برباد ہو جاتا۔)

لبيك ان الحمد لك والملك لا شريك لك

(میں تمہارا فرمانبردار ہوں کیونکہ اصلاً تم ہی تعریف کے حقدار ہو' تمہاری ملکیت میں کوئی شریک نہیں ہے۔)

کل نبی و ملك و کل من اهل لك

(ہر نبی' ہر بادشاہ اور تمہیں یاد کرنے والا ہر شخص نیز)

و کل عبد سالك سبح او لبی فلك

(تم سے سوال کرنے والے تمام بندوں نے تمہاری پاکی بیان کی یا بڑھ کر تمہاری آواز پر لبیک کہا)

لبیك ان الحمد لك والملك لا شریك لك

(میں تمہارا مطیع ہوں کیونکہ تسبیح و توصیف کے اہل در حقیقت تم ہی ہو اور تمہاری بادشاہت میں تمہارا کوئی شریک نہیں ہے۔)

واللیل لما ان ملك والسابحات فی الفلك

(جس کی تاریک ہو جانے والی رات شاہد ہے' تیز آسمان میں تیرنے والے ستارے شاہد ہیں)

علی مجاری المتسلك

(یہ ستارے اپنی متعینہ جگہوں پر گردش کر رہے ہیں۔)

لبیك ان الحمد لك والملك لا شریك لك

(سر نیاز تمہارے حضور خم ہے کیونکہ حمد و ثنا کے لائق تم ہی ہو اور تمہاری ملکیت میں کوئی شریک نہیں ہے۔)

اعمل و بادر اجلك واختم بخیر عملك

(اچھے عمل کرو اور وقت کو غنیمت تصور کرو اور اپنے کام کو سلامتی کے ساتھ ختم کرو۔)

لبیك ان الحمد لك والملك لا شریك لك (۳۰)

(سر تسلیم تمہاری سرکار میں جھکا ہوا ہے کیونکہ در حقیقت تم ہی تعریف و تقدیس کے سزاوار ہو اور تمہاری بادشاہت میں کسی کی ساجھی داری نہیں ہے۔)

ابو نواس کی حمدیہ اور زہدیہ شاعری سے قطع نظر اس کی طرف اشارہ کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا کہ ابو نواس سے قبل یعنی دور جاہلی سے جو شاعری چلی آ رہی تھی اس میں کھنڈروں' خیموں' محبوب کی قیام گاہوں پر اشک سوئی اور سینہ کوبی کی جاتی' گھوڑوں اور اونٹوں

کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے جاتے، اپنے قبائل کی اعلیٰ نسبی پر صفحات کے صفحات سیاہ کئے جاتے اور اجڑے ہوئے دیار پر کف افسوس ملا جاتا۔ ابونواس نے جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے ان فرسودہ خیالات اور قدیم اسالیب کے خلاف آواز بلند کی اور بتایا کہ ہمارے عہد کے تقاضے اور تہذیب و تمدن چونکہ علاحدہ ہے اس لئے اپنے عہد کے مطابق اپنی شاعری کے موضوعات طے کرنے چاہئیں۔

لاتبك ليلى ولا تطرب على هند ۔ واشرب على الورد من حمراء كالورد

ابونواس نے لیلیٰ اور ہند پر رونے سے منع تو کیا لیکن شراب کی تعریف کرنے کا جو حکم دے رہا ہے یہ کوئی نیا خیال نہیں ہے بلکہ اس سے قبل بھی عرب شاعری میں شراب کا بڑی تفصیل سے ذکر آیا ہے۔ بہر کیف یہاں تو دیکھنا یہ ہے کہ اس نے حمدیہ شاعری میں کیا کمالات دکھائے ہیں۔ میری اپنی حقیر رائے یہ ہے کہ یہاں بھی وہ عظمت کا حامل نظر آتا ہے۔

عربی شاعری میں اسماعیل صبری تنہا ایسا شاعر ہے جس کی یہ کوشش تھی کہ حمد کو باقاعدہ شاعری کی صنف کا درجہ دے دیا جائے۔ بہر کیف وہ خود تو اس پر عمل پیرا ہوا لیکن اس کی یہ کاوش بہر مند نہ ہو سکی۔ البتہ خود اس نے حمد کا بڑا اچھا حق ادا کیا، حمد کے سلسلے میں اس نے قرآن کریم سے کسب فیض کیا، یعنی اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے لئے قرآن عظیم سے کوئی عظیم معیار نہیں ہے۔

اسماعیل صبری ۱۸۵۴ء میں نیل کے ساحلی علاقہ میں پیدا ہوا۔ اسے ایک جدید طرز کے اسکول میں داخل کیا گیا۔ اٹھارہ سال کی عمر اس نے مجلہ "روضۃ المدارس" کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اسی میں اس نے ایک نظم لکھ کر خدیو اسماعیل کو مبارکباد پیش کی۔ ۱۸۷۸ء میں اس نے یورپ سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ وہاں اس نے ایک طرف یورپی حضارت و ثقافت کا بڑے قریب سے مشاہدہ کیا نیز فرانسیسی ادب سے استفادہ بھی کیا۔ مصر واپس آنے کے بعد مختلف مناصب پر فائز رہا۔ ۱۹۰۷ء میں سبکدوشی سے قبل اپنے عہدہ سے مستعفی ہو گیا اور زندگی کے بقیہ ایام مشق سخن کی نذر کر دیئے۔ اپنی عملی شان و مرتبت اور معیاری شاعری کی بناء پر ادباء و شعراء کا مرجع بنا ہوا تھا۔ جدید عربی شاعری کا یہ نمائندہ شاعر ۱۹۲۳ء میں ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ (۴۱)

اسماعیل صبری کی پوری شاعری میں یہ چیز نمایاں ہے کہ وہ جس موضوع پر اظہار خیال کرتا اس پر اسے پوری دسترس ہوتی۔ یہی اس کی خصوصیت حمد میں نظر آتی ہے، اس نے اللہ کی بیشمار صفات کو موضوع بحث بنایا ہے اور موقع و محل کے لحاظ سے ان میں زبردست

معنویت پیدا کی ہے۔

پوری عربی شاعری میں تنہا اسماعیل صبری ایسا شاعر ہے جس نے اپنے دیوان کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے کیا' میرے اپنے مطالعہ میں اسماعیل صبری سے قبل کوئی ایسا شاعر نہیں ملتا جس نے اپنے دیوان کا آغاز حمد سے کیا ہو' اسماعیل صبری نے اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات کو مختلف قصائد میں بیان کیا ہے' پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ اسے خدا کی وحدانیت' عظمت و رفعت اور اس کی رافت و رحمت کا پورا پورا احساس تھا اور اس کی یہ خواہش تھی کہ خداوند قدوس کے عجائب و کمالات تک وہ اپنی رسائی کو ممکن بنا سکے۔ اس کے حمدیہ قصائد پر قرآن کریم کا پرتو نظر آتا ہے۔ یہاں پر اس کے ان قصائد کے عناوین کو نقل کیا جارہا ہے جن میں خالق کائنات کی حمد و ثنا کی گئی ہے' ملاحظہ ہو۔

فاتحة' اسماء اللّٰه الحسنى' البعث والحساب' حكمت البعث. احوال القيامة. الجنة. قدرة اللّٰه - الجحيم - المؤمنون فى النعيم. الشمس - سبيل الايمان - السماء والارض - القمر - سعة ملك اللّٰه - قصر الحياة والاصل - يقظة القلب - تسبيح الخلائق - عالم اللّٰه - فى قبضة اللّٰه - اللّٰه القادر - عظة - فاتحة - البعث - نشيد.

مذکورہ بالا قصائد میں کچھ تو ایسے ہیں جو پورے کے پورے حمد باری تعالیٰ پر مبنی ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن میں جزوی طور پر اللہ کی قدرت و ندرت پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ بہر کیف مذکورہ تمام قصائد سے یہ تاثر منظر عام پر آتا ہے کہ دنیائے عربی شاعری کا یہ پہلا شاعر ہے جس نے حمد کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا وہ بھی نہایت تفصیل و توضیح کے ساتھ ورنہ اس سے پہلے کوئی ایسا شاعر نظر نہیں آتا جس نے اتنا اہتمام کیا ہو' میں نے جہاں تک عربی شاعری کا مطالعہ کیا ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس طرح کی شعوری کوشش کا فقدان ہے۔ ہاں عربی شعراء کے یہاں خال خال کہیں حمد سے متعلق اشعار مل جاتے ہیں۔ اب ہم یہاں کچھ اشعار اسماعیل صبری کے دیوان سے نقل کریں گے تاکہ اس سے اس کی حمدیہ شاعری کا اندازہ لگایا جا سکے۔

رب هب لى هدى و اطلق لسانى — واثر خاطرى و ثبت جنانى

(خدایا! مجھے ہدایت عطا فرما' طاقت لسانی عنایت فرما' اور میرے دل کو سکون عطا فرما اور میری ڈھال کو مستحکم بنا دے۔)

كن معينى ان اعجزتنى القوافى — و نصيرى فى ساميات المعانى

(اگر قوافی سدراہ ثابت ہوں تو تو بلندی معانی کے نظم میں میرا ناصر و مدد گار بن جا)

انت قصدی و غایتی و رجائی　　مالک الملک مبدع الاکوان

(اے مالک الملک! اے ساری کائنات کے موجد! تو ہی تو میری منزل' میری غایت اور میری امید ہے۔)

وجمالا فی کل شیئی تجلّی　　سبح الحسن فیہ للرحمان (۴۲)

(اور تمام اشیاء میں خوبصورتی نمایاں ہے' چیزوں کا حسن و جمال اللہ کی پاکی بیان کر رہا ہے۔)

یہ اس قصیدے کے چار اشعار ہیں جس سے دیوان کا آغاز ہوتا ہے۔ ان اشعار میں شاعر ایک طرف اپنی بے بسی اور ضعف کو پیش کرتا ہے اور دوسری طرف اسے قادر مطلق تصور کرتے ہوئے اپنا ماویٰ و ملجا تصور کرتا ہے۔ اس کے بعد قصیدہ "اسماء اللہ الحسنٰی" ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے مختلف اسماء حسنٰی کو پیش کیا گیا ہے جس سے اللہ کی مختلف خوبیوں پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کے چند اشعار نقل کئے جا رہے ہیں۔

جل شان الا لہ رب البرایا　　خالق الخلق دائم الاحسان

(وہ اللہ جلالت شان کا حامل ہے جو تمام مخلوقات کا رب ہے' مخلوق کو پیدا کرنے والا ہے اور دائمی احسان والا ہے۔)

واحد قاھر سمیع بصیر　　عالم الغیب' صاحب السلطان

(وہ اکیلا ہے' غلبہ والا ہے' سننے والا ہے' دیکھنے والا ہے' عالم الغیب اور صاحب قدرت ہے۔)

حکم' عادل' لطیف' خبیر　　نافذ الامر' واسع الغفران

(وہ حاکم ہے' عادل ہے' مہربان ہے' آگاہ ہے' حکم کو نافذ کرنے والا اور حد درجہ معاف کرنے والا ہے۔)

قابض' باسط' قوی' عزیز　　مرسل الغیث' مقسط المیزان

(وہ قبضہ والا ہے' رزق پھیلانے والا ہے' قوی ہے' طاقتور ہے' بارش بھیجنے والا اور ٹھیک ٹھیک تولنے والا ہے۔

یعلم السرفی الصدور واخفی　　والیہ سیحشر الثقلان

(وہ دلوں کے رازوں کو جانتا ہے اور (کچھ اشیاء کو) پوشیدہ کر رکھا ہے اور جن وانس اسی کے حضور جمع کئے جائیں گے۔)

واعد المتقین جنات عدن ولمن خاف ربہ جنتان (۴۳)

(اس نے پرہیزگاروں سے باغات عدن کا وعدہ کیا ہے اور اپنے رب سے ڈرنے والوں کے لئے دو نہریں ہوں گی۔)

اس حمد میں اللہ تعالیٰ کی اور بیشمار خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے مثلاً ماجد، حلیم، کریم، ظاہر، باطن، قریب، مجیب، منعم، وارث، علی، عظیم، مرجع اور مہیمن وغیرہ۔ اس کا آخری شعر اس طرح ہے۔

وترک الارض انہار اویقضی کل امر ویسجد الخافقان

(اور زمین کثائی سے تباہ ہو جائے گی، ہر معاملہ کا فیصلہ کیا جائے گا اور مشرق و مغرب کے تمام لوگ سر بسجود ہوں گے۔)

قصیدہ "قدرۃ اللہ" میں اللہ تعالیٰ کی مختلف عنایتوں اور الطاف و انعامات کو ہوے واضح لفظوں میں بیان کیا گیا ہے اس نظم کو پڑھنے سے یہ پوری طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ اسے اللہ کی آفاقیت اور ہمہ گیری کا پوری طرح احساس ہے کائنات کا کوئی ذرہ اس کے قبضۂ قدرت سے باہر نہیں ہے، وہ اپنی خواہشات کے مطابق کائنات میں تصرفات کرتا ہے۔

وخشا الناس کلھم فی خضوع اذ تجلت مھابۃ الرحمان

(اور تمام لوگ خشوع و خضوع کے ساتھ دوزانو ہو کر بیٹھ گئے جس وقت اللہ تعالیٰ کا خوف طاری ہوا۔)

لم یغب عنہ فی السماوات شیئی و علیم بما حتی الثقلان

(آسمانوں کی کوئی شئی اس سے پوشیدہ نہیں ہے اور جو کچھ جنّ و انس نے کیا ہے وہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔)

ملأ الارض والسماء وجوداً خالق الکون لم یغب عن مکان

(وجود کے لحاظ سے زمین و آسمان کو بھر دیا ہے کائنات کا خالق کسی جگہ سے غائب نہیں ہے۔)

ملك یرقب الخلائق جمعا وید یر الا فلاك فی الدوران

(اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کو دیکھ رہا ہے اور آسمانوں کی گردش میں ایک نظام برپا کئے ہوئے ہے۔)

یرسل الماء فوق جردار میت فیرد الحیاۃ للودیان

(وہ مردہ زمین پر پانی نازل کرتا ہے، جس کی وجہ سے وادیوں میں زندگی دوڑ جاتی

ہے۔)

روحات النسیم تحمل عبقا   من اریج الزھور والریحان

(بادِ نسیم کے قافلے پھولوں کی خوشبوؤں اور خوشبودار درختوں کی مہک کو اٹھائے اٹھائے پھرتے رہتے ہیں۔)

کل شیئی یسبح اللہ حمداً   لی یؤدی فرائض الشکران

(ہر شئے حمد باری تعالیٰ کے لئے اس کی تسبیح کرتی ہے تاکہ شکر کے فرائض کو انجام دے سکیں۔)

نعم ساقھا المھیمن للناس   فحمداً للمنعم المنان

(اللہ نے نعمتوں کو لوگوں کے لئے ہنکایا ہے' اسی لئے نعمت دینے والے اور احسان کرنے والے کے لئے تعریفیں ہیں۔)

اعجز الخلق عدھا فتعالیٰ   باسط الرزقٖ دائم الاحسان

(اس نے نعمتوں کے شمار کرنے سے مخلوق کو عاجز کر دیا ہے چنانچہ رزق کو عام کرنے والا اور دائمی محسن بلند و برتر ہے۔)

فاطر الارض والسماوات فرد   صاحب الطول فی علو الشان

(زمین اور آسمانوں کا پیدا کرنے والا عدیم النظیر ہے۔ اور وہ بلندی شان میں حد درجہ وسعت کا مالک ہے۔)

عالم الغیب والشھادۃ نور   یملا الکون فیضہ الربانی

(غیب اور حاضر کا جاننے والا ایک نور ہے' فیض ربانی پوری کائنات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔)

نافذ الامر فی جمیع البرایا   مطلق الحکم لم یشارکہ ثان

(تمام مخلوقات کے مابین وہی حکموں کا نافذ کرنے والا ہے' وہ فیصلوں میں تنہا ہے' دوسرا کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔)

اس حمدیہ نظم میں اور بہت سے اشعار ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی وسعتوں' رفعتوں اور عظمتوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اسماعیل صبری نے خالق کل کو کاشف الضرو البلاء (بلا اور مصیبت کو زائل کرنے والا) احکم الحاکمین' کنز العطایا (بخششوں کا خزانہ) ارحم الراحمین' واہب العزم (عزم عطا کرنے والا) واسع الحلم (بہت زیادہ معاف کرنے والا) اور غافر الذنب (گناہ کو چھپانے والا) نیز قابل التوب (توبہ قبول کرنے والا) جیسی قرآنی اصطلاحات سے یاد کیا

ہے۔اس نظم کو پڑھنے کے بعد یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اسماعیل صبری اللہ کی ان صفتوں سے خوبی واقف تھا جو قرآن کریم میں مذکور تھیں۔

قصیدہ "المومنون فی النعیم" میں بہت سے ایسے اشعار ہیں جن میں خداوند قدوس کی شان کبریائی بیان کی گئی ہے' نیز یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو جنت میں بیشمار الطاف و عنایات سے نوازے گا' اس نظم میں ایک طرف جمال جنت کی تصویر کشی کی گئی وہیں اللہ رب العزت کے مختلف پہلوؤں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

یا عباد الرحمان معاقد بلغتم فاشکرو امن ھدی الی الایمان

(اے رحمان کے بندو! تمہیں اچھی طرح معلوم ہے' پس اللہ کا شکر ادا کرو جس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی)

مالك الملك ان وعدك حق من له الحمد غیره کل آن

(اے مالک الملک! تمہارا وعدہ سچا ہے' اور تمہارے علاوہ کون ہے جس کی ہر وقت حمد بیان کی جائے۔)

کل شیئی یسبح الله حمدا ابد الدهر خیفة الرحمان

(ہر چیز اللہ کی تعریف کی تسبیح پڑھتی ہے' یہ تسبیح خشیت الٰہی کے سبب ہے جو ہمیشہ ہمیشہ جاری رہے گی۔)

خالق الخلق من ضیاء و نار و تراب فی رافة و جنان

(اللہ نے مخلوق کو روشنی' آگ اور مٹی سے پیدا کیا' اللہ کی یہ پیدائش الفت و محبت پر مبنی تھی۔)

عرشه الارض و السماء قریب لم یغب فیض نوره عن مکان (۳۵)

(اس کا عرش زمین اور آسمان سے قریب ہے' اس کا فیضان نور تمام جگہوں کو سیراب کرتا ہے۔)

نظم "الشمس" میں بھی خالق کائنات کی کرشمہ سازیوں کا ذکر ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ سورج کو اللہ تعالیٰ نے بقاء انسانی کا ضامن قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ سے دنیا کی تمام چیزوں کو غذا ملتی ہے اگر سورج کا نکلنا بند ہو جائے تو کائنات کی ساری رنگینیاں ماند پڑ جائیں گی۔

صانعٌ مبدعٌ علیمٌ خبیر بالغٌ صنعه ذری الاتقان

(وہ کارساز' موجد' اور علیم و خبیر ہے' حد کمال کو پہنچا ہوا ہے اور اس کی صنعت میں غیر معمولی استحکام ہے۔)

كل حى الى علاه مدين   بالغوالي من انعم الاحسان

(ہر جاندار اپنی بلندی میں عطا کردہ قیمتی ترین نعمتوں کا مرہون منت ہے)

خلق الشمس فى السماء سراجا   وحياة للعالم الحيوانى

(اس نے آسمان میں سورج کو چراغ کے طور پر پیدا کیا اور عالم حیوانی کے لئے اسے زندگی قرار دیا۔)

اسی قصیدہ "السماء والارض" میں خالق دوجہاں کی تعریف و توصیف کی گئی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ آسمان و زمین ایک خاص نظام میں بندھے ہوئے ہیں اور اس نظام کا چلانے والا احکم الحاکمین کے علاوہ کون ہو سکتا ہے۔

هل لهذا الوجود غير اله   واحد فى العلا و فى السلطان

(کیا اس کائنات کے لئے اللہ کے علاوہ کوئی ہے۔ وہ تو اپنے مرتبہ اور بادشاہت میں یکتا ہے۔)

امره الإمر لم يشبه لشيئى   مطلق الحكم مبدع الاكوان

(اللہ کا حکم ہی اصل حکم ہے، کوئی چیز اس کے مثل نہیں ہے، اس کا حکم قطعی ہے اور کائنات کی تمام چیزوں کا موجد ہے۔)

رتب النجم و البروج و اوحى   للنظام العجيب بالدوران

(اس نے ستاروں اور بروج کو سلیقہ سے ترتیب دیا اس حیرت کن نظام کو گردش سے جوڑ دیا ہے)

اسی طرح نظم "القمر" میں بھی اسماعیل صبری خدا کے حضور نغمہ سرا ہیں۔

سخر الماء والهواء فراتاً   و عليلا فوقى الثرى يجريان

(اللہ نے پانی کو سمندر کی صورت میں مسخر کیا اور ہوا کو حریض بنا کر عطا کیا، دونوں چیزیں سطح زمین پر جاری ہیں۔)

جعل الليل والنهار لباسا   و معاشا كلاهما آيتان

(اس نے رات کو آرام کے لئے اور دن کو رزق کے لئے بنایا یہ دونوں چیزیں اللہ کی نشانیاں ہیں۔)

جعل الشمس فى النهار عروسا   تتجلى فى امرأة السلطان

(اللہ نے سورج کو دن میں دولہا بنا کر پیش کیا جو بادشاہ کی بیوی میں نمایاں ہے۔)

نظم "سعة ملك الله" میں اسماعیل صبری نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہر

ذرہ اس کے قبضہ میں ہے' کوئی شی دست قدرت سے ماوراء نہیں' پتہ پتہ اسی کے حکم سے حرکت کرتا اور عالم سکوت میں پہنچ جاتا ہے' دنیا کی ساری رنگینی اور بازار کی تمام چہل پہل اسی کی ذات سے وابستہ ہے اور اس عظیم طاقت کے مقابل تمام طاقتیں لاحاصل ہیں۔

یا نبی الارض ان للہ ملکا واسع الافق بین قاص ودان
(اے اہل زمین! بادشاہت اللہ کے لئے ہے جو قریب و دور افق کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔)

تعلم الارض والسماء بداہ فی سمو الجلال والسلطان
(تمہیں معلوم ہے کہ زمین و آسمان کی حدیں ذوالجلال اور سلطان عظیم کے ہاتھوں میں ہے۔)

سجد الکون للمھیمن شکراً وجلا لا و کبیر الخافقان
(کائنات اپنے نگہبان کے حضور شکر اور جلال کے لئے سجدہ ریز ہے اور جن وانس نے اس کی کبریائی کی)

یخرج المیت من سلالۃ حی و کذا الحی من رحیم فان
(وہ مردے کو زندہ کی اولاد سے نکالتا ہے' اور اسی طرح زندہ کو بوسیدہ اور فانی ہڈیوں سے باہر لاتا ہے۔)

یبعث الخلق من ویاحی قبور ھشمتھا تقلبات الزمان
(وہ مخلوق کو قبور کی تاریکیوں سے اٹھائے گا' جن قبروں کو زمانے کے انقلابات نے تہس نہس کر ڈالا ہے۔)

یجعل الماء من احاج معینا رحمۃ بالنبات و الحیوان
(اللہ نے شدید گرمی کے سبب جاری پانی بنایا جو نباتات اور جاندار کے لئے باعث رحمت ہے۔)

اس نظم میں اللہ تعالیٰ کی مختلف نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ان نعمتوں کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کا شکر ادا کیا جائے اور اسی کے ذکر و فکر سے اپنے دلوں کو آباد رکھا جائے۔ اس نظم کا آخری شعر اس طرح ہے۔

نعم ابدع المصور فیھا ماتناوی عن فطنۃ الانسان (۵۱)
(مصور نے دنیا میں کیا کیا کرشمہ سازیاں کی ہیں' یہ عقل انسانی سے ماوراء ہیں۔)

نظم "عالم البحر" میں اللہ کی ان نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے جو سمندر میں موجود ہیں۔

اس نظم کا آخری شعر اس طرح ہے۔

نعم ساقها الخضم الی الناس　　بامر من مبدع الاکوان (۵۲)

(سردار نے نعمتوں کو لوگوں کی جانب چیزوں کے موجد کرنے والے کے حکم سے ہنکایا ہے۔)

نظم "عالم الطیر" میں اسماعیل صبری نے یہ بتایا ہے کہ چڑیاں بھی اللہ کی تعریف و تحمید میں چہچہاتی رہتی ہیں اور نہایت خوش الحانی کے ساتھ اسے یاد کرتی رہتی ہیں۔

امم الطیر اکثر الخلق حمداً　　ما سهت خطة عن الشکران

(چڑیوں کی مخلوق مخلوقات میں سب سے زیادہ اللہ کی حمد کرتی ہے۔ ان کا ایک لمحہ بھی شکر سے ضائع نہیں جاتا۔)

ما تبدی نور و غشی ظلام　　و مع الکون کثر المشرقان

(جیسے ہی روشنی نمودار ہوئی یا تاریکی پھیل گئی' دونوں ہی حالات میں کائنات میں اہل مشرق و مغرب نے اللہ کی بڑائی بیان کی۔)

اذ تهاوی النسیم بحمل شاواً　　رجعته الآفاق بالا لحان

(باد نسیم رواں ہوتے ہی ترنم اثیری شروع کر دیتی ہے۔ بار بار آفاق کی خوش الحانیوں کا اعادہ کرتے ہیں۔)

سبح الطیر فیه ربا رحیما　　قد تجلی باللطف والاحسان

(چڑیاں رحم کرنے والے رب کی آفاق میں تسبیح بیان کرتی ہیں۔ یقیناً یہ رب رحیم اپنی عنایات و احسانات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔)

یہ ایک طویل نظم ہے اور مختلف انداز میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی گئی ہے اسی طرح عالم الوحش' عالم الانعام اور الاسد ملك الحیوان' میں خداوند قدوس کی قدرت و عظمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ قصیدہ "قصد الحیاة والاصل" میں اسی انداز میں ذات عالیہ کی مدح سرائی کی گئی ہے۔

ایها الجاحد الکنود تذکر　　کیف سواك خالق الاکوانْ

(اے منکر و نافرمان! تم غور سے دیکھو کہ کائنات کے خالق نے تمہاری تخلیق میں کیسی مناسبت رکھی ہے۔)

دع ملاهیك ساعة و تفکر　　فی جلال المهیمن الرحمان

(اپنی لغو مصروفیات میں سے ایک گھڑی باہر آؤ اور نگہبان و رحم فرما اللہ کے جلال

وجبروت کا نور مشاہدہ کرو۔)

این منه المفرو هو محیط بالسرایا جمعا فی کل آن

(اللہ سے فرار نا ممکن ہے۔ وہ ہر آن تمام مخلوقات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔)

حاضرٌ شاهدٌ سمیعٌ بصیر ماتای فیض نوره عن مکان (۵۴)

(وہ حاضر ' دیکھنے والا ' سننے والا اور نظر رکھنے والا ہے اُس کا فیضان نور کسی قطعہ سے دور نہیں ہے۔)

"تسبیح الخلائق" میں اسماعیل صبری نے یہ واضح کیا ہے کہ دنیا میں بےشمار مخلوق ہیں اور تمام مخلوقات اپنے اپنے انداز میں رحمان اور رحیم کے حضور نذرانہ حمد و صلوٰۃ پیش کرتی ہیں اور ایک لمحہ بھی ذکر الٰہی سے غفلت کا شکار نہیں ہوتی ہیں۔ اس نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے

کل شیئی منشی علی الارض حیا او نما فی مراتب الحیوان

(ہر شئے زمین پر زندہ رواں ہے یا وہ جاندار کے طریقے پر نمو پذیر ہے۔)

امم اودع المهیمن فیها ملهمات من فیضه الربانی

(تمام مخلوقات کو سر زمین پر اللہ نے امانت کے طور پر اتارا ہے اور سب کے سب فیض ربانی کے فیض یافتہ ہیں۔)

شاکرات لانعم الله دوماً ذاکرات الأه کل آن

(سب کے سب اللہ کی نعمتوں کے دائمی شکر گزار ہیں اور ہر وقت اس کی نعمتوں کے ذکر میں کھوئے ہوئے رہتے ہیں۔)

السن . سبحت بذکر الله خالق رازق عظیم الحنان

(زبانیں مستقلاً اللہ ' خالق ' رازق اور بے پناہ شفقتوں کے حامل کے ذکر و شکر میں رواں رہتی ہیں۔)

اس نظم کے بعد "عالم اللہ" ہے اس میں بھی ذات اقدس کی انگنت صناعیوں اور عجائبات کا جائزہ لیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ سوائے ذات باری کے کوئی ایسی ذات نہیں ہے جو اس کارخانے کے نظام کو چلا سکے اس نظم کا آغاز دیکھئے۔

یا ابن حواء من امات و احیا و اقتدارآ احاط بالاکوان

(اے حوّا کے بیٹو ! کون مارتا اور جِلاتا ہے ؟ اور کون ہے جس نے پوری کائنات کا اقتدار کے ساتھ احاطہ کیا ہے۔)

یبعث الارض کل عام فتحیا بعد موت بهیجة الاعصان

(وہی ہے جو ہر سال زمین کو زندہ کرتا ہے چنانچہ موت کے بعد شاخوں کی شادابی عود کر آتی ہے۔)

تنبت الحب والثمار و تزهو فی بساط مرصع الالوان

(زمین ہی دانوں اور پھلوں کو اگاتی ہے اور اپنے رنگ برنگ بچھونوں کے ساتھ آراستہ ہوتی ہے۔)

یمزج الماء وهو یجری حثیثا فی جذوع النبات بلادهان (٥٦)

(وہ پانی کو تیل میں ملاتا ہے اور پانی نباتات کی جڑوں میں تیزی سے دوڑتا ہے۔)

اس کے بعد قصیدہ "فی قبضة الله" ہے۔ اس میں بھی نظام قدرت کی عکاسی کی گئی ہے اور اس کی ناقابل تصور قوتوں کو عوام کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں خصوصاً اس چیز کو منظر عام پر لایا گیا ہے کہ آسمان کو ستاروں سے آرائش و زیبائش کر کے اپنے ہونے کا یقینی ثبوت پیش کیا ہے۔

سابحات الافلاك فی كل برج تذكر الله خيفة كل آن

(ہر برج میں آسمانوں کی گردش خوف الٰہی کے سبب سے ہر وقت ذکر خداوندی میں مصروف ہیں۔)

باسم رب السماء كالبرق تجری كل نجم بدور فی حسبان

(ہر ستارہ آسمان کے رب کے نام سے تجلی کی طرح جاری و ساری ہے اور ایک خاص حساب سے گردش کر رہا ہے۔)

فلك دائرة بابهی نظام رتبت عقدة يد الرحمان

(آسمان ایک مناسب نظام کے ساتھ گردش کر رہا ہے اور رحمان کے ہاتھ نے اس کے یار کو منظم کیا ہے۔)

زينتها كواكب لامعات من شموس و من بدور حسان (٥٧)

(سورج اور خوبصورت چاند کے چمکدار ستاروں نے آسمان کو مزین کیا ہے۔)

اس کے بعد "الله القادر" ہے۔ اس میں بھی اسماعیل صبری نے اللہ کی قوت و طاقت کو پیش کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ کائنات کی تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کے لئے مسخر کر دیا ہے۔ اس کی نعمتوں اور عنایتوں کو شمار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

نعمة الله لا تعدد حاشا ان تناول الاحصاء فی الحسبان

(تمہارے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا حساب لگا سکو۔)

منعم يمنح البرايا جميعا طيبات الحياة للعمران

(منعم (اللہ تعالیٰ) نے اپنی تمام مخلوقات کو زندگی گزارنے کے لئے پاکیزہ چیزیں عنایت کیں۔)

رازق محسن رؤف رحيم كل شيئى لديه طوع البنان

(وہ رزق دینے والا' احسان کرنے والا' مہربانی اور رحم کرنے والا ہے۔ ہر چیز کا پور پور اس کے آگے سرنگوں ہے۔)

كل من فى الوجود من كائنات يتبارى فى الحمد والشكران

(کائنات کی تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کی حمد و شکر میں لگی ہوئی ہیں۔)

اس کے بعد نظم "يوم البعث و الوعيد" ہے جو نہایت طویل ہے اس میں قیامت کی مختلف تصاویر پیش کی گئی ہیں اور پوری نظم میں حمد باری تعالیٰ کی آواز سنائی دیتی ہے ایک جگہ فرشتوں کے باب میں بتایا گیا کہ وہ اس انداز میں اپنے اللہ کی حمد بیان کرتے ہیں۔

حول ارجائه الملائك صفت هم جنود المهيمن الرحمان

(فرشتے عرش الٰہی کے چاروں طرف صف بصف کھڑے ہیں یہ نگہبان رب کی افواج ہیں)

اس کے بعد بھی اسماعیل صبری کے دیوان میں متعدد نظمیں ہیں جن سے مختلف پہلوؤں اور مختلف اسالیب میں اللہ کی جلالت شان کو آشکارا کیا گیا ہے۔ یہاں پر طویل تر نظم "عظمة" سے تین اشعار نقل کرتے ہوئے اس سلسلے کو ختم کیا جا رہا ہے۔

واقيموا الصلوٰة لله شكراً وانكروه فى السر والا علان

(شکر خداوندی کے لئے نماز قائم کرو اور اعلانیہ طور پر نیز خاموشی کے ساتھ ذکر الٰہی میں مشغول رہو۔)

سبحوا الله بكرة واصيلا فى سجود ماضوا المشرقان (٦٠)

(صبح و شام اپنے سجدوں میں اس اللہ کی پاکی بیان کرو جس نے مغرب و مشرق کو روشن کیا ہے۔)

خواشی

(۱) ص ۶۱' (۲) ص ۱۱' (۳) ص ۱۳' (۴) ص ۲۱' (۵) ص ۲۴' (۶) ص ۱۶

(۱) المدائح النبوية' زكى مبارك' مطبع مصطفى البانى الحلبى ۱۹۳۵ء ص ۲۷

(۲) تاریخ الادب العربی۔ احمد حسن الزیات۔ ص ۱۱۲۔ ۲۱۳

(۳) دیوان ابی العتاہیہ۔ دار صادر، بیروت۔ ۱۹۶۴ء ص ۶۱

(۴) ایضاً ص ۱۱ (۵) ایضاً ص ۱۴ (۶) ایضاً ص ۲۱

(۷) ایضاً ص ۲۴ (۸) ایضاً ص ۱۶ (۹) ایضاً ص ۵۴

(۱۰) ایضاً ص ۱۰۲ (۱۱) ایضاً ص ۱۳۲ (۱۲) ایضاً ص ۱۳۴

(۱۳) ایضاً ص ۱۵۸ (۱۴) ایضاً ص ۱۷۷ (۱۵) ایضاً ص ۱۹۸

(۱۶) ایضاً ص ۲۵۴ (۱۷) ایضاً ص ۳۰۳ (۱۸) ایضاً ص ۳۳۲

(۱۹) ایضاً ص ۳۷۳ (۲۰) ایضاً ص ۳۷۲ (۲۱) ایضاً ص ۳۹۰

(۲۲) ایضاً ص ۳۹۲ (۲۳) ایضاً ص ۴۱۹ (۲۴) ایضاً ص ۴۳۴

(۲۵) تاریخ الادب العربی۔ ص ۲۱۶۔۲۱۸ نیز دیکھئے :ابونواس۔ عمر فروخ۔ منشورات۔ دار الشرق الجدید۔ الطبعۃ الاولیٰ۔ بیروت ۱۹۶۰ء

(۲۶) دیوان ابونواس الحسن بن ہانی۔ دار الکتب العربی۔ بیروت لبنان۔ ۱۹۵۳ء ص ۶۰۹

(۲۷) ایضاً ص ۶۱۰ (۲۸) ایضاً ص ۶۱۰ (۲۹) ایضاً ص ۶۱۰

(۳۰) ایضاً ص ۶۱۰ (۳۱) ایضاً ص ۶۱۱ (۳۲) ایضاً ص ۶۱۲

(۳۳) ایضاً ص ۶۱۳ (۳۴) ایضاً ص ۶۱۵ (۳۵) ایضاً ص ۶۱۵

(۳۶) ایضاً ص ۶۱۷ (۳۷) ایضاً ص ۶۱۸ (۳۸) ایضاً ص ۶۲۰

(۳۹) ایضاً ص ۶۲۲ (۴۰) ایضاً ص ۶۲۳

(۴۱) دیوان اسماعیل صبری ابو امیہ (مرتبہ احمد کمال زکی وحامد محمد خیری محمد القصاص) وزارۃ الثقافۃ والارشاد القومی (غیر مورخہ) ص ۵۔۱۵

(۴۲) ایضاً ص ۲۷ (۴۳) ایضاً ص ۲۷ (۴۴) ایضاً ص ۳۱۔۳۲

(۴۵) ایضاً ص ۳۵ (۴۶) ایضاً ص ۳۸ (۴۷) ایضاً ص ۴۰

(۴۸) ایضاً ص ۴۱ (۴۹) ایضاً ص ۴۲ (۵۰) ایضاً ص ۴۳

(۵۱) ایضاً ص ۴۳ (۵۲) ایضاً ص ۴۵ (۵۳) ایضاً ص ۴۵

(۵۴) ایضاً ص ۵۶ (۵۵) ایضاً ص ۵۷ (۵۶) ایضاً ص ۵۹

(۵۷) ایضاً ص ۶۰۔۶۱ (۵۸) ایضاً ص ۶۳ (۵۹) ایضاً ص ۶۴

(۶۰) ایضاً ص ۴۷

ڈاکٹر محمد ثناء اللہ عمری

سعدی کی حمد و مناجات

نامِ نامی شیخ شرف الدین بن عبداللہ، مصلح لقب جو اصلاحی خدمات کے عوض ملا تھا۔ سعدی حاکم وقت سعد بن ابو بکر کی طرف نسبت جس کے نام سے شیخ نے اپنی کتاب "گلستاں" معنون کی یہی نسبت تخلص کا درجہ اختیار کر گئی، شیراز میں پیدا ہوئے، پیدائش ۱۱۸۹ء کی ہے۔ مدرسہ نظامیہ بغداد کے سپوت ہیں۔ بڑے جہاں دیدہ، نوّے سال کی عمر پائی، زندگی کے بڑے نشیب و فراز دیکھے۔ ان کی دو کتابیں عالمی ادب کا قابل فخر سرمایہ ہیں۔ ایک وہی گلستاں، یہ شیخ کے وہ رشحات قلم ہیں جو خودان کی اپنی نظم و نثر کا حسین امتزاج ہیں اور آٹھ ابواب پر مشتمل ہیں، دوسری بوستاں ہے جو تمام تر نظم ہے، یہ "در منظوم" دس بابوں میں منقسم ہے۔ ان ابواب کے علاوہ سب سے پہلے "حمد باری تعالیٰ عزاسمہ" بھی موجود ہے اس میں کل ۱۶۸ اشعار ہیں، مگر اخیر کے چار شعر حمدیہ نہیں نعتیہ ہیں۔

آئندہ سطروں میں ہم انہیں شعروں کو ترجمہ اور مختصر سی تشریح کے ساتھ پیش کر رہے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ شیخ کا دل ایمان سے کیسا معمور، ان کا ذہن کیسا شاداب اور ان کا اشہب قلم کیسا توانا تھا۔ ان حمدیہ اشعار کے نقل و ترجمہ سے پہلے یہ بتادینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ادب میں حمد و مناجات کا آغاز کیوں کر ہوا؟ اس صنف نظم کی تخلیق کا سبب کیا تھا؟

ہمارے خیال میں اس سوال کا جواب سورۂ فاتحہ ہے، جو قرآن پاک کی سب سے پہلی سورت ہے۔ جو ایک بندۂ مومن کی زبان پر شب و روز بار بار طاری ہوتی رہتی ہے۔ اس کے دل کا یقین اور اس کی روح کی صدا ہے، اس کا اسلوب یہ ہے کہ ابتدائی تین آیتیں ربوبیت، رحمت اور ملوکیت کی الٰہی صفتوں کی بنا پر اللہ کی عالمگیر حمد سے شروع ہوئی ہیں۔ اس حمد کے بعد بقیہ تین آیتیں جو اسی کی عبادت، استعانت اور طلب ہدایت سے عبارت ہیں، اس کے دربار میں کی جانے والی دعا ہے، سرگوشی اور مناجات ہے، اس حمد اور مناجات میں واسطے اور طلب والحاح کا تعلق ہے، گویا ایک بندہ اپنے اللہ کو اس کی صفتوں سے یاد کرتا اور ان صفتوں کی وجہ سے اسی کو ہر قسم کی ستائش کا سزاوار قرار دیتا اور اسی کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر سر نیاز خم کر دیتا ہے، اسی کے روبرو اپنے معروضات پیش کرتا ہے۔

پھر نماز کے اندر ہو کہ نماز سے باہر، قرآنی زبان میں ہو کہ کسی اور زبان میں، ایک سچے مومن کے دل میں یہی جذبات موج زن رہتے ہیں، اس کی زبان سے اسی پاک عقیدے کا اظہار ہوتا ہے، اس کے قلم

سے بھی حمد و مناجات کے ترانے ہی نکلتے ہیں۔

قفسے بیادِ قوی زنم چہ عبارت و چہ معانیم

چنانچہ اسلامی ادب کے نمائندوں نے اپنی نثر و نظم میں سب سے پہلے اللہ جلّ جلالہٗ و عمّ نوالہٗ کی حمد بیان کی۔ ایک تو اس لئے کہ وہ مسلمان تھے اور چاہتے تھے کہ ان کا ہر کام خالق کونین کے نام اور اس کی صفات کے تذکرے سے شروع ہو۔ دوسرے اس لئے کہ جو علمی اور ادبی مہم انہیں درپیش ہے اس کے لئے اسی اوپر والے کی طرف سے ان کا شرحِ صدر ہو۔ خالص رزمیہ شاعری میں بھی ہمیں حمد و مناجات کا اہتمام صاف دکھائی دیتا ہے۔ نظامی کا سکندر نامہ اور فردوسی کا شاہنامہ بھی جو مادّی فتوحات و کشور ستانیوں کی منظوم داستانیں ہیں، حمد و مناجات سے مزیّن ہیں۔ رہے سعدی تو ان کی گلستاں اور بوستاں ابوابِ عشق و جوانی کو استثناء کر کے تمام تر اصلاحی ادب کا عظیم سرمایہ ہیں۔ لہٰذا یہ فطری بات ہے کہ ایک مصلح اپنے نصب العین کی تکمیل کے لئے مُسَبِّبُ الْاَسباب حقیقی کی طرف رجوع کرے۔ شیخ نے ان چونسٹھ (۶۴) اشعار میں یہی کیا ہے، اسی کی ذات والا صفات کا تذکرہ کیا ہے اور انہی صفات کا واسطہ دے کر دست سوال دراز کیا اور اشہب قلم کو چابک لگایا ہے۔ ہمارے خیال میں ایک حافظ شیرازی ایسے شاعر ہیں۔ جنہوں نے حمد و نعت کا اہتمام نہیں کیا ہے، ان کے مطبوعہ اور مخطوطہ دیوان میں ادب کی یہ صنف نظر نہیں آتی، حالانکہ ان کے کلام میں عشق مجازی کے ساتھ عشق حقیقی کے نمونے بھی ملتے ہیں۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد لیجئے، اب سعدی کی اس حمد و مناجات پر کان لگایئے جو بوستان کی زینت ہے۔

۱۔ بنام جہاں دار جاں آفریں حکیم سخن بر زباں آفریں

"سارے جہانوں کے مالک اور جاندار مخلوقات کے خالق کے نام سے شروع کرتا ہوں جو دانا ہے، اور زبان کو قوت گویائی عطا کرنے والا ہے۔" یہاں اللہ تعالیٰ کی چار صفتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

۲۔ خداوند بخشندۂ دستگیر کریم خطا بخش و پوزش پذیر

"ہر چیز کا دینے والا، ہر مصیبت میں مدد کرنے والا، ازراہ بزرگی گناہ معاف کرنے والا اور معذرت قبول کرنے والا ہے۔" یہاں چار باتوں میں تین صفتوں کا ذکر ہے۔

۳۔ عزیزے کہ ہر کہ از درش سر بتافت بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

"ایسے غلبے اور قدرت والا کہ اس کے دربار سے جو بھی سر تابی کرے گا، اور کسی اور دروازے پر دستک دے گا کوئی عزت نہیں پائے گا۔" یہ گویا تذلّ من تشاء کا ترجمہ ہے۔

۴۔ سر پادشاہان گردن فراز بدرگاہِ او بر زمینِ نیاز

"بڑے بڑے صاحبِ جبروت و سطوت بادشاہوں کے سر بھی اس کے دربار میں عجز و انکسار سے

جھک جاتے ہیں۔" وہ احکم الحاکمین ہے۔

۵۔ نہ گردن کشاں را بگیرد بفور   نہ عذر آوراں را براند بجور

"نہ سرکشوں اور نافرمانوں کی گرفت میں جلدی کرتا ہے نہ توبہ کرنے والوں کو بے رحمی سے ہانک دیتا ہے۔" اس کے ہاں مہلت بھی ہے اور رحمت بھی' پہلا قانون سرپھروں کے لئے ہے اور دوسرا قانون شرمساروں کے لئے۔

۶۔ وگر خشم گیرد بکر دار زشت   چوباز آمدی ماجرا در نوشت

"اگر بدعملی کی بنا پر غضبناک ہوتا بھی ہے تو توبہ کرنے پر جو کچھ ہوا اسے معاف کر دیتا ہے۔" یعنی وہ قہّار بھی ہے اور غفّار بھی۔

۷۔ اگر با پدر جنگ جوید کسے   پدر بے گمان خشم گیرد بسے

"اگر کوئی اپنے باپ سے برسرِ پیکار ہو تو یقینی بات ہے کہ باپ کو بہت غصہ آئے گا۔" یہاں صرف تمثیل مقصود ہے۔ عیسائی تثلیث نہیں۔ نعوذُباللہ۔

۸۔ وگر خویش راضی نباشد ز خویش   چو بیگانگانش براند ز پیش

"اگر کوئی قرابتدار اپنے کسی عزیز سے ناراض ہو تو اجنبیوں کی طرح اسے دھتکار دے گا۔" تمثیل جاری ہے گو تعبیر الگ ہے۔

۹۔ و گر بندہ چابک نیاید بکار   عزیزش ندارد خداوندگار

"اگر نوکر چاکر اپنے فرائض کی انجام دہی میں مستعد نہ ہوں تو آقا انہیں نہیں چاہے گا۔" یہ بھی ایک مثال ہی ہے۔

۱۰۔ وگر بر رفیقاں نباشد شفیق   بفرسنگ بگریزد از وے رفیق

"اگر ہم راہی اپنے رفقاء پر مہربان نہ ہو تو یہ لوگ اس سے کوسوں دور بھاگیں گے۔" یہ چوتھی مثال ہے۔

۱۱۔ وگر ترک خدمت کند لشکری   شود شاہِ لشکر کش ازوے بری

"اگر کوئی سپاہی فوجی خدمت سے دست بردار ہو کر بیٹھا رہے تو کمانڈر انچیف اس سے کوئی سروکار نہ رکھے گا۔" یہ پانچویں اور آخری مثال ہے۔ ان مثالوں کے بعد جو انسانوں کے باہمی روابط پر حتی ہیں' اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے تعلق کی بات بیان ہو رہی ہے اور دونوں کے مابین جو فرق و اختلاف ہے اسے واضح کیا ہے۔

۱۲۔ و لیکن خداوندِ بالا و پست   بعصیاں درِ رزق بر کس نہ بست

"لیکن آسمان و زمین کا مالک کسی پر اس کی نافرمانی کے باعث رزق کا دروازہ بند نہیں کرتا۔ برابر

روزی پہنچاتا ہی رہتا ہے۔"

۱۳۔ دو کونش یکی قطرہ در بحر علم گنہ بیند و پردہ پوشد بحلم

"دنیا اور آخرت اس کے سمندر علم کا ایک قطرہ ہیں۔ تمام گناہ دیکھتا ہے مگر اپنی بردباری سے ان پر پردہ ڈال دیتا ہے۔" اللہ سب کچھ جانتا بوجھتا ہے۔ مگر پردہ پوشی کرتا ہے لیکن انسان دیکھے بھالے بغیر بے پر کی اڑاتا ہے۔

۱۴۔ ادیم زمیں سفرۂ عام اوست چہ دشمن بریں خوان یغما چہ دوست

"روئے زمین اس کا عام دستر خوان ہے' اس صلائے عام میں دشمن اور دوست دونوں برابر ہیں۔" ہماری ضیافتوں کی طرح نہیں' جو دوستوں اور عزیزوں کے لئے مخصوص ہوتی ہیں۔ گلستاں کا یہ قطعہ بھی اسی شعر کا ہم معنی ہے:

اے کریمے کہ از خزانہ غیب گبر و ترسا وظیفہ خورداری

"اے ان داتا! جس کے ان دیکھے خزانے سے آتش پرست اور نصرانی مستقل روزی پاتے ہیں۔"

دوستاں را کجا کنی محروم تو کہ با دشمنان نظر داری

"تو جو حق کے دشمنوں تک کی خبر گیری کرنے والا ہے' اپنے دوستوں اور حق پرستوں کو کیوں محروم کرنے لگا۔"

۱۵۔ اگر بر جفا پیشہ بشتافتی کہ از دست قہرش اماں یافتی؟

"اگر وہ ظالموں کا مواخذہ کرنے لگے تو اس کی دار و گیر سے کسے امان مل سکتی ہے۔؟" یہ گویا اس ارشاد ربانی کی ترجمانی ہے۔ وان یخذلکم فمن ذالذی ینصرکم من بعدہ (آل عمران: ۱۶۰)

۱۶۔ بری ذاتش از تہمت ضد و جنس غنی ملکش از طاعتِ جن و انس

"اس کی ذات بابرکات کسی بھی شریک و سہیم کے الزام سے بری ہے' اس کی حکومت و سلطنت جنوں اور انسانوں کی اطاعت سے بے نیاز ہے۔" ان کی عبادت اس کی شان نہیں بڑھاتی' نہ ان کی سرکشی اس کی عظمت گھٹا سکتی ہے۔

۱۷۔ پرستار امرش ہمہ چیز و کس بنی آدم و مُرغ و مور و مگس

"تمام اولاد آدم' پرندے' مور' مکھی' غرض ہر جاندار اور بے جان مخلوق اسی کی تابع فرمان ہے۔" تشریعاً نہیں تو تکویناً تو ضرور ہے۔

۱۸۔ چناں پہن خوان کرم گسترد کہ سیمرغ در قاف قسمت خورد

"اپنے فیاضانہ دستر خوان کو وہ اس قدر پھیلائے رکھا ہے کہ کوہ قاف کا مکین پرندہ سیمرغ بھی اپنی روزی پاتا ہے۔" کیوں نہ ہو وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا (ہود: ۶)

۱۹۔ لطیف و کرم گستر و کارساز   کہ دارای خلق ست و داناے راز

"اللہ تعالیٰ باریک بیں، مہربان اور مرادوں کا بر لانے والا ہے کیونکہ تمام خلائق کا مالک اور تمام رازوں کا جاننے والا ہے۔"

۲۰۔ مراد را رسد کبریاء و منی   کہ ملکش قدیم ست و ذاتش غنی

"بزرگی اور عظمت اسی کو سزاوار ہے کیونکہ اس کی سلطنت ازل سے ہے اور اس کی ذات بے نیاز ہے۔" سب اس کے محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں۔

۲۱۔ یکی را بسر بر نہد تاج بخت   یکی را بخاک اندر آرد ز تخت

"کسی کے سر پر خوش قسمتی کا تاج رکھتا ہے، تو کسی کا تخت اُلٹ کر اسے ذلیل کرتا ہے۔" یہ شعر اس آیت کی صدائے بازگشت ہے۔ قل اللّٰھم مالك الملك تؤتی الملك من تشآء و تنزع الملك ممن تشآء (آل عمران: ۲۶)

۲۲۔ کلاہِ سعادت یکی بر سرش   گلیم شقاوت یکی در برش

"کسی کو سعادت کا تاج پہناتا ہے تو کسی کے جسم پر بدبختی کا کمبل اوڑھا دیتا ہے۔" تعزّ من تشآء و تذلّ من تشآء کی تفسیر۔ (ایضاً :۲۶)

۲۳۔ گلستاں کند آتشی بر خلیل   گروہی بآتش برد زآب نیل

"آگ کے الاؤ کو خلیلؑ کے لئے گل گلزار کر دیتا ہے اور ایک بڑے لاؤ لشکر کو دریائے نیل کی راہ سے جہنّم رسید کر دیتا ہے۔" پہلی تلمیح حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی سلامتی کی ہے اور دوسری فرعون اور اس کے لشکریوں کی غرقابی کی۔

۲۴۔ گر آن ست منشور احسان اوست   ورین ست توقیع فرمان اوست

"وہ واقعہ اس کے لطف و احسان کا مظہر ہے اور یہ حادثہ اس کی ناراضگی کے فرمان کا شاخسانہ ہے۔" یہاں لف و نشر مرتّب ہے۔

۲۵۔ پس پردہ بیند عملہائے بد   ہمو پردہ پوشد بآلائے خود

"چھپے چھپے ہوتے والی برائیاں دیکھتا ہے تاہم اپنے عفو و درگزر کے اوصاف سے اس کی پردہ پوشی کرتا ہے۔" اس کے لئے باطن بھی ظاہر ہی کا حکم رکھتا ہے مگر وہ اس ظاہر کو دنیا والوں کے حق میں باطن قرار دیتا ہے۔

۲۶۔ بہ تہدید اگر بر کشد تیغ حکم   بمانند کرو بیاں صم و بکم

"ڈرانے دھمکانے کو اپنے فرمان کی تلوار کھینچتا ہے تو ملائکہ مقرّبین بھی گم صُم ہو جاتے ہیں۔" کسی کو چوں چرا کرنے کی مجال نہیں۔

۲۷۔ وگر درد ہدیک صلائے کرم عزازیل گوید نصیبے برم
"اگر خوان کرم کی دعوت دیتا ہے تو اور تو اور شیطان بھی کہنے لگتا ہے کہ میں بھی اپنا حصہ لوں گا۔" حالانکہ وہ اللہ کا کھلا دشمن ہے۔

۲۸۔ بدرگاہِ لطف و بزرگیش بر بزرگان نہادہ بزرگی ز سر
"اس کے لطف و بزرگی کے دربار میں بڑے سے بڑے لوگ بھی عجز و انکسار کا سر جھکا دیتے ہیں۔" یہاں پہنچ کر ان کا سارا دم خم جاتا رہتا ہے۔

۲۹۔ فروماندگاں را برحمت قریب تضرّع کناں را بدعوت مجیب
"عاجزوں اور ناچاروں سے اس کی رحمت قریب ہوتی ہے۔ گریہ وزاری کرنے والوں کی دعائیں ضرور سن لیتا ہے۔" ایک اور شاعر نے یہی بات الفاظ بدل کر یوں کی ہے۔

در کوئے ما شکستہ دلے می خرند و بس بازار خود فروشی ازاں سوئے دیگر است
"ہماری گلی میں تو صرف ٹوٹے دلوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے' رہی فخر و پندار کی منڈی تو وہ دور اس طرف کہیں ہے۔"

۳۰۔ بر احوالِ نابودہ علمش بصیر باسرار ناگفتہ لطفش خبیر
"جو حالات ابھی پیش نہیں آئے ہیں اس کا علم انہیں بھی گھیرے ہوئے ہے' جو راز ابھی سربستہ ہی ہیں اس کی باریک بینی انہیں بھی جانتی ہے۔" وہ بصیر ہے خبیر ہے' لطیف ہے۔

۳۱۔ بقدرت نگہدارِ بالا و شیب خداوندِ دیوانِ روزِ حسیب
"اپنی قدرت کاملہ سے آسمان و زمین کی حفاظت کرنے والا اور روز جزاء کے دربار عالم کا مالک ہے۔" پہلے مصرعہ میں اس آیت کی ترجمانی کی گئی ہے۔ ان اللّٰه یمسك السموات والارض ان تزولاولئن زالتا ان امسکهما من احد من بعدہٖ انه کان حلیما غفورا(فاطر :۴۱) دوسرا مصرعہ مالك یوم الدّین (فاتحہ :۳) کا ترجمہ ہے۔

۳۲۔ نہ مستغنی از طاعتش پشت کس نہ بر حرف او جائے انگشت کس
"اس کی فرمانبرداری سے کوئی فرد بشر بے نیاز نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی صناعی پر کوئی انگلی اٹھا سکتا ہے۔" اس کے کام نقائص سے پاک ہیں۔

۳۳۔ قدیمی نکوکار نیکی پسند بکلک قضا در رحم نقش بند
"ازل سے اچھے کام کرنے اور اچھے کام پسند کرنے والا ہے۔ قضاو قدر کے قلم سے رحم مادری کے اندر نقش و نگار بنانے والا ہے۔"

۳۴۔ ز مشرق بمغرب مہ و آفتاب رواں کرد و گستر د گیتی بر آب

"چاند اور سورج کو مشرق سے مغرب کی طرف رواں دواں کر دیا اور زمین کو پانی پر پھیلا دیا۔"
دوسرا مصرعہ والارض فرشناها فنعم الماهدون (ذاریات: ۴۸) کا ترجمہ ہے۔

۳۵۔ زمیں از تپ لرزہ آمد ستوہ فرد کوفت بر دامنش میخ کوہ

"زمین جب حرکت واضطراب سے عاجز آگئی تو اللہ نے اس کے دامن پر پہاڑ کی میخیں ٹھونک دیں۔" اس مضمون کی آیتیں بھی کئی ایک ہیں۔

۳۶۔ دہد نطفہ را صورتی چوں پری کہ کرد است بر آب صورت گری؟

"نطفہ کو پری کی سی شکل وصورت عطا کرتا ہے اللہ کے سوا پانی پر نقاشی کس نے کی ہے؟" واہ کیا بات کہی ہے! نقش بر آب انسان سے کہاں ہو سکتا ہے؟

۳۷۔ نہد لعل و فیروزہ در صلبِ سنگ گلِ لعل در شاخِ فیروزہ رنگ

"سخت پتھر کے اندر لعل جیسا لال اور فیروزہ جیسا ہرا قیمتی پتھر رکھ دیتا ہے اور ہرے رنگ کی شاخ پر سرخ رنگ کا پھول پیدا کر دیتا ہے۔" ان متضاد رنگوں کی چیزوں کا پہلو بہ پہلو تذکرہ ادبی حسن سے خالی نہیں جو شاعر کے ذہن کی شادابی کا نتیجہ ہے۔

۳۸۔ ز ابر افگند قطرۂ سوی یم ز صلب آورد نطفہ در شکم

"بادلوں سے سمندر کے اندر بارش کے قطرے ٹپکاتا ہے' باپ کی پیٹھ سے ماں کے پیٹ میں نطفہ کی بوند پہنچاتا ہے۔" آگے فرماتے ہیں۔

۳۹۔ از آں قطرہ لولوئ لالا کند وزیں صورتی سرو بالا کند

"اس قطرۂ آب سے ایک آبدار موتی بنا دیتا ہے اور اس آب پشت سے ایک سرو قد نقشہ تیار کر دیتا ہے۔" یہ شعر سابق شعر کا لف ونشر مرتب ہے۔

۴۰۔ بر و علم یک ذرہ پوشیدہ نیست کہ پیدا و پنہاں بنزدش یکیست

"اس کے علم سے کوئی بھی ذرہ چھپا ہوا نہیں ہے کیونکہ ظاہر وباطن دونوں اس کی نظر میں برابر ہیں۔" وہ عالم الغیب والشہادہ ہے۔

۴۱۔ مہیا کن روزئ مار و مور وگر چند بے دست و پایند و زور

"سانپ اور مکھی تک کو روزی فراہم کرنے والا ہے اگرچہ کہ یہ حشرات الارض وغیرہ بے دست وپا اور لاچار ہیں۔" وما من دآبة فی الارض إلا علی اللہ رزقها (ہود: ۶) کی تفسیر ہے۔

۴۲۔ بامرش وجود از عدم نقش بست کہ داند جز او کردن از نیست ہست

"اسی کے حکم سے عدم نے وجود کی شکل اختیار کر لی۔ ظاہر ہے کہ اس کے سوا کس کی طاقت ہے کہ نیست کو ہست کر دے۔؟" یہ وہی کن فیکون (یٰسین: ۸۲) والی بات ہے۔

۴۳۔ دگر رہ بجتم عدم در برد و ز آنجا بہ صحرائے محشر برد

"پھر وہ موجود چیزوں کو معدوم کر دے گا اور وہاں سے میدان محشر میں لا حاضر کرے گا۔"

منها خلقناكم و فيها نعيدكم ومنها نخرجكم تارة اخرىٰ۔ (طٰہٰ:۵۵)

۴۴۔ جہاں متفق بر الٰہیتش فرو ماندہ در کنہ ماہیتش

"اس کی اُلوہیت پر تمام دنیا والوں کا اجماع و اتفاق ہے' سب کے سب اس کی حقیقت کی دریافت سے قاصر ہیں۔" عبادت گاہ کشمیر کے لئے ابوالفضل کا تجویز کردہ کتبہ اس پہلے مصرعہ کی کیسی اچھی تشریح ہے۔ الٰہی بہ ہر خانہ کہ می نگرم جویائے تو اند وبہ ہر زبان کہ می شنوم گویائے تو۔ رہا دوسرا مصرعہ تو اس کی شرح میں یہ اردو شعر پیش کیا جا سکتا ہے۔

تھک تھک کے ہر مقام پر لاچار ہو گئے تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟

۴۵۔ بشر ماورای جلالش نیافت بصر منتہائے جمالش نیافت

"اس کے جلال سے ورے کیا ہے' کوئی انسان اسے نہ پا سکا' رہی اس کے جمال کی انتہا تو کوئی آنکھ اسے بھی دیکھ نہ سکی۔" اس کی ظاہری اور باطنی صفات کا ادراک انسانی حواس سے باہر ہے۔" لاتدركه الابصار وهو يدرك الابصار (انعام:۱۰۴)

۴۶۔ نہ براوج ذاتش پرد مرغ وہم نہ در ذیل وصفش رسد دست فہم

"نہ اس کی ذات عالی صفات کی بلندی پر وہم و گمان کا پرندہ پر مار سکے۔ نہ اس کی صفات عالیہ کے دامن تک عقل و فہم کی رسائی ہو سکے۔" ليس كمثله شئى (شوریٰ:۱۱)

۴۷۔ دریں ورطہ کشتی فروشد ہزار کہ پیدا نہ شد تختۂ بر کنار

"اس بھنور میں ہزاروں جہاز ڈوب گئے حد یہ کہ ان کا کوئی تختہ بھی کنارے نہیں لگا۔" خرد اور عقل کی رنجوری اور مجبوری کی طرف اشارہ ہے۔

۴۸۔ چہ شبہا نشستم دریں سیر گم کہ دہشت گرفت آستینم کہ قم

"میں کئی راتوں۔ مدت مدید۔ تک عقل کے گھوڑے دوڑاتا ہوا گم رہا' تا آنکہ حیرت اور دہشت نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا 'اٹھ'۔ یہاں سے شیخ اپنی حیرانی کا ذکر کرتے اور اپنے وجدان سے جواب یہ پاتے ہیں کہ اللہ کی حقیقت کو پا لینا کسی کے بس کا روگ نہیں۔ بعد کے اشعار بھی حمدیہ ہی ہیں جیسے اس شعر سے پہلے کے ہیں۔

۴۹۔ محیط است علم ملک بر بسیط قیاس تو بروے نگردد محیط

"اس بادشاہوں کے بادشاہ کا علم تمام موجودات کے گھیرے ہوئے ہیں' تمہارا قیاس اور ظن اسے اپنے احاطے میں لے نہیں سکتا۔" یہ محالات سے ہے۔

۵۰۔ نہ ادراک در کنہ ذاتش رسد — نہ فکرت بغور صفاتش رسد

"تیرے ادراک کی رسائی اس کی حقیقت ذات تک نہیں ہو سکتی۔ نہ تیرا غور و فکر اس کی صفات کی تہہ تک باریاب ہو سکتا ہے۔

۵۱۔ تواں در بلاغت بسحباں رسید — نہ در کنہ بیچون سبحاں رسید

"بلاغت و فصاحت میں سحبان وائل کی ہمسری ہو سکتی ہے، مگر بے مثل و بے نظیر خدائے پاک کی حقیقت تک رسائی نہیں ہو سکتی۔" ساری بلاغت و فصاحت دھری کی دھری رہ جائے گی۔

۵۲۔ کہ خاصان دریں رہ فرس راندہ اند — بلا احصی از تگ فرو ماندہ اند

"کیونکہ اللہ کے خاص بندے اس راہ میں فکر و نظر کی جولانیاں دکھا چکے ہیں لیکن اپنے عجز و نیاز کا اعتراف کر کے اپنی تگ و دو سے باز آگئے ہیں۔" جب انبیاء و اولیاء کا یہ حال ہے تو ہما شما کس شمار میں ہیں۔

۵۳۔ نہ ہر جای مرکب تواں تاختن — کہ جاہا سپر باید انداختن

"کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ ہر جگہ گھوڑے دوڑانا ہو نہیں سکتا، بہت سے مقامات پر سپر ڈال دینی پڑتا ہے۔

۵۴۔ وگر سالکی محرم راز گشت — ببندند بروے در بازگشت

"اگر کوئی سالک اسرار خداوندی سے واقف ہو جاتا ہے تو اس پر واپسی کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔" یہی سعدی گلستاں میں فرماتے ہیں 'آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد۔

۵۵۔ کسی را دریں بزم ساغر دہند — کہ داروی بے ہوشیش می دہند

"اس مجلس میں جس کسی کو جام و سبو دیئے جاتے ہیں اسے گویا بے ہوشی کی دوا پلا دی جاتی ہے۔" یہ شعر مجازاً بھی صحیح ہے اور حقیقتاً بھی۔

۵۶۔ یکی باز را دیدہ بر دوختہ است — یکی دیدہا باز و پر سوختہ است

"ایک شخص ایسا ہے کہ باز کو دیکھنے کے بعد اس کی آنکھیں بند ہو گئی ہیں، دوسرا وہ ہے کہ اس کی آنکھیں تو کھلی ہیں مگر پَر جل گئے ہیں۔" ظاہر ہے کہ یہ دونوں حالتیں افشائے راز سے مانع ہیں۔ "آنکھیں بند ہونے" سے مقصود یہ کہ غیر اللہ کی طرف نظر نہیں اٹھتی۔

۵۷۔ کسی رہ سوی گنج قاروں نبرد — وگر برد رہ باز بیروں نبرد

"کوئی قارون کے خزانے تک پہنچا نہیں، اگر پہنچا تو واپس آیا نہیں۔" قارون کے خزانے سے مراد یہاں مادی خزانہ نہیں، روحانی اور عرفانی گنج گرانمایہ ہے۔

۵۸۔ بمردم دریں موج دریائے خوں — کز و کس نبرد است کشتی بروں

"میں اس خونیں ندی کی موجوں میں ہلاک ہو گیا کیونکہ کشتی کو اس سے باہر کوئی نہیں لے جا

سکا ہے۔ گویا۔

اک آگ کا دریا ہے اور تیر کے جانا ہے

۵۹۔ اگر طالبی کہ این زمیں طے کنم — نخست اسپ باز آمدن پی کنم

"اگر اس میدان میں کود پڑنے کے خواہاں ہو اور واپسی کے وسائل قطع کرنے کے لئے آمادہ ہو۔" یہاں سے شیخ کا خطاب یا تو اپنے آپ سے ہے یا اپنے قاری سے۔

۶۰۔ تامل در آئینہ دل کنی — صفائی بتدریج حاصل کنی

"دل کے آئینہ کو زنگ آلودنہ ہونے دو' رفتہ رفتہ اخلاص کی دولت پالو۔"

۶۱۔ مگر بوی از عشق مستت کند — طلبگار عہد الستت کند

"ممکن ہے اللہ کی محبت کی بو تمہیں مست کر دے اور الست کا وعدہ تمہیں یاد دلا دے۔ اس پر کاربند ہونے کا آرزومند بنا دے۔" یہ تلمیح ہے آیت مبارکہ الست بربکم قالو ابلیٰ (اعراف: ۱۷۲) کی۔

۶۲۔ بپای طلب رہ بدینجا بری — وز ینجا ببال محبت پری

"طلب شوق کے پیروں سے یہاں پہنچو گے اور عشق و محبت کے پَروں سے یہاں سے اڑو گے۔"

عشق تو راہ می برد' شوق تو زادمی دہد

۶۳۔ بدرد یقیں پردہائی خیال — نماند سرا پردہ الا جلال

"یقین خیال و وہم کے پردے چاک کر دیتا ہے' صرف ایک بڑا پردہ رہ جاتا ہے جو جلال الٰہی کا پردہ ہے۔" یعنی قرب و عرفانِ خداوندی حاصل ہوتا ہے۔

۶۴۔ دگر مرکب عقل را پویہ نیست — عنانش بگیرد تحیر کہ ایست

"اگر عقل کی جولانیاں درمیانی رفتار کی نہ ہوں تو حیرت ان کی باگ پکڑ کر کہے گی کہ رک جاؤ۔" یعنی یہ مرحلے انسانی عقل کی قلابازیوں سے طے ہونے والے نہیں ہیں۔

قرآن حکیم کی ایک آیت ہے **وللہ الاسمآء الحسنیٰ فادعوہ بہا** (اعراف: ۱۸۰) "اللہ تعالیٰ کے بہترین نام ہیں۔ پس اسے انہی ناموں سے پکارو۔" چنانچہ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے "بوستاں" کے مذکورہ چونسٹھ اشعار میں اسی قرآنی حکم کی تعمیل کی ہے' یہ صحیح ہے کہ انہوں نے تمام اسمائے کا بالاستیعاب ذکر کیا ہے مگر یہ بھی صحیح ہے کہ ان حمدیہ اشعار کا محور یہی اسماء الٰہی ہیں' ان میں اللہ جل جلالہ کی الوہیت' ربوبیت' رحمت' قدرت' صنعت' جلال و جمال' پادشاہت' قہر و غضب' عفو و درگزر' حکمت' علم و ادراک' خلق و ابداء' رزاقی' تدبر امور' قدامت و استغناء' اس کا خبیر' بصیر اور لطیف ہونا' اس کا مجیب الدعوات اور قاضی

الحاجات ہوتا اس کی ستاری اور فیاضی وغیرہ صفات مقدسہ کا ذکر بڑے والہانہ انداز سے ڈوب کر کیا ہے۔ اس ذکر باری تعالیٰ کے مقابلے میں بندگان خدا کی بے بسی، محتاجی اور عجز و قصور کی بھی وضاحت کی ہے جو تمام معاملات میں ظاہر ہے، چاہے یہ امور عالم محسوسات سے متعلق ہوں، چاہے عالم غیب سے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عقائد کے سلسلہ میں کہیں بھی کسی جھول کا دور دور پتہ نہیں، یہ حمد و مناجات شروع سے آخیر تک توحید کا سبق ہے۔ اللہ کی محبت کے استغراق کا عکاس ہے۔ اور "باخدا دیوانہ باش" کا مظہر ہے۔ وفی ذالک فلیتنا فس المتنافسون۔

تین کتابوں پر دس ہزار روپے کے تصنیفی ایوارڈز

☆ 1998ء اور 1999ء میں شائع شدہ اردو کی بہترین شعری و نثری کتابوں پر ادارہ "الکوثر" نے تصنیفی ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

☆ برصغیر ہند و پاک کے مصنفین و مرتبین سے درخواست ہے کہ ہر کتاب کی پانچ کاپیاں بذریعہ رجسٹری ادارہ "الکوثر" کو ارسال فرمائیں۔

☆ کتابیں موصول ہونے کی آخری تاریخ 31/ جنوری 2000ء ہے۔

.... ☆ پتا ☆ ....

ایڈیٹر "الکوثر" دارالعلوم خیریہ نظامیہ سہسرام- 821115 (بہار) انڈیا

ڈاکٹر محمود الحسن عارف

فارسی حمد و مناجات میں

مولانا عبدالرحمٰن جامی کا مقام

"حمد و مناجات" کی شاعری کا موضوع اچھوتا ہی نہیں، ٹوٹے ہوئے دل اور افسردہ تمناؤں کا آئینہ دار بھی ہے۔ انسان کا جب بھی دل ٹوٹتا ہے، اس کی تمنائیں اور خواہشیں پارہ پارہ ہوتی ہیں اور اس کی آزردہ آرزوئیں خونِ حسرت میں نہا کر کفن پوش ہوتی ہیں، تو وہ اسی معبودِ برحق کے دامن میں اور اسی کی آغوشِ رحمت میں پناہ ڈھونڈتا ہے، خود قرآن مجید میں کئی مقامات پر اسی مضمون کو بیان کیا گیا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے:

قُلْ مَنْ يُنَجِّيكُمْ مِنْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُونَهُ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً (سورۃ الانعام ۶، ۶۳)

"کہو بھلا تم کو جنگلوں اور دریاؤں کے اندھیروں سے کون مخلص ہوتا ہے جبکہ تم اسے عاجزی اور نیاز پنہائی سے پکارتے ہو۔"

آخر کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے سوا کوئی ذات اور ہستی بھی دردِ دل کا درماں مہیا کرنے کی سکت نہیں رکھتی۔

اسی بناء پر "حمد و مناجات" کی شاعری زمانۂ قدیم سے چلتی آتی ہے، اس ضمن میں قدیم ترین مثال ہمارے سامنے "زبور" (یا مزامیر داؤد) کی ہے، جن میں سے ہر ایک "نظم" "حمد و مناجات کے انوکھے زاویوں کی ترجمانی کرتے ہے، اسی لئے حضرت داؤد علیہ السلام جب قدرت کی حمد خوانی کرتے تھے، تو ان کے ساتھ صفحۂ کائنات کی ہر چیز "ہم نوا" ہو جاتی تھی، قرآن مجید میں ہے:

انا سخرنا الجبال معه يسبحن بالعشي والاشراق. والطير محشورة. كل له اواب

(سورۃ ص ۳۸، ۱۸۔۱۹)

"ہم نے پہاڑوں کو ان کے زیر فرمان کر دیا تھا کہ صبح و شام ان کے ساتھ (خدائے) پاک (کا) رکوع کرتے تھے اور پرندوں کو بھی کہ جمع رہتے تھے، سب ان کے فرمانبردار تھے۔"

یہ سلسلہ حضرت داؤد علیہ السلام پر ہی بس نہیں ہو جاتا بلکہ تمام کے تمام انبیاء علیہم السلام اور

اللہ تعالیٰ کے نیک و برگزیدہ بندے ہمیشہ سے ہی خدا تعالیٰ کی حمد خوانی میں مصروف رہے' اسی لئے قدیم صحف' جو کسی بھی صورت میں ہم تک پہنچے ہیں' سب میں اللہ تعالیٰ کی "حمد و مناجات" کا مضمون قدر مشترک کے طور پر موجود ہے۔

"حمد و مناجات" کے اس مضمون کو قرآن مجید نے جو "کتب سماویہ" کا اسی طرح خاتم ہے جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سلسلۂ نبوت کے خاتم ہیں' نہ صرف منتہائے کمال تک پہنچایا بلکہ اس کو بیان کرنے کے لئے متنوع استعمال تراکیب اور اسالیب بیان بھی تعلیم دیئے اور دنیا کو پہلی مرتبہ "حمد و مناجات" کے آداب' اور اس کے طریقے سکھائے' قرآن مجید کا آغاز ہی "سورۃ الفاتحہ" سے ہوتا ہے جو حمد و مناجات کا ایک بحر بیکراں ہے۔ جس کے متعلق یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اس میں قادر مطلق نے معانی کے سمندر کو الفاظ کے کوزے میں بند فرما دیا ہے' پھر ایک سورۂ فاتحہ ہی پر کیا موقوف ہے "قرآن مجید" نے اپنی سورتوں اور مضامین کا بہت بڑا حصہ حمد و مناجات کے موضوع کے لئے "وقف" اور مختص کر دیا ہے' مھبط وحی' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی ہدایات کی روشنی میں اس مضمون کو جس طرح لوح کمال پر پہنچایا ہے' وہ محتاج تعارف نہیں' آپ ارشاد فرماتے ہیں:

لا احصی ثناءً علیک ــــ کما اثنیت علی نفسک (۱)

"(اے اللہ) میں تیری "حمد و ثناء" بیان کرنے کا یارا نہیں رکھتا'

تو' تو ویسے ہی ہے' جیسے تو نے خود اپنی حمد و ثنا بیان کی ہے۔"

اس حدیث نبویؐ میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرنے سے اگرچہ آپ نے اپنا عاجز و بے بس ہونا بیان کیا ہے' مگر باطنی بصیرت رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہاں "عجز و قصور" میں بھی حمد و مناجات کا ایک بحر معانی موجزن ہے' اس لئے کہ خالق و مالک کائنات کی بارگاہِ قدس میں انسان کی جانب سے سب سے بڑی حمد و مناجات یہی ہے کہ وہ اس کے بیان سے اپنے عجز و قصور کا اعتراف کرے' بھلا جس پروردگار کی حمد و ثناء کے مضامین کا ساری دنیا کے درخت قلمیں بن کر اور سارے سمندر اور اتنے ہی سات اور سمندر روشنائی بن کر احاطہ نہ کر پائے' ایک بندے کی زبان اس کا احاطہ کیونکر کر سکتی ہے' قرآن مجید میں ارشاد ہے:

ولو ان ما فی الارض من شجرۃ اقلام والبحر یمدہ من بعدہ سبعۃ ابحر ما نفدت کلمت اللہ (سورۃ لقمان' ۳۱' ۲۷)

"اور اگر یوں ہو کہ زمین پر جتنے درخت ہیں (سب کے سب) قلم ہوں اور سمندر کا تمام پانی سیاہی ہو' اور اس کے بعد سات اور (سیاہی ہو جائیں) تو خدا کی باتیں (یعنی اس کی صفات) ختم نہ ہوں گی۔"

---

(۱) صحیح مسلم' مطبوعہ قاہرہ' طبع محمد فواد عبدالباقی' ۱: ۳۵۲۔ الصلاۃ' حدیث ۲۲۲

بقول جامی۔

وصف حق حق خود تواند گفت
این گہر را خروند اند سفت

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے ساتھ 'جو خصوصی نسبت ہے اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ آپ کے ذاتی اسمائے مبارکہ کا اشتقاق اسی مادّے سے ہوا ہے' چنانچہ آپ محمد ﷺ (حرف میم کی زبر کے ساتھ) بہ معنی محمود (تعریف کیے ہوئے) اور حرف میم کی زیر کے ساتھ محمِّدؐ بہ معنی حامد ہیں۔ جبکہ دوسرے اسم مبارکہ "احمد" میں بھی یہی دو احتمالات پائے جاتے ہیں۔ جبکہ آپ کی امت کو حمادون (۱) قرار دیا گیا ہے 'اسی اعتبار سے خالق کائنات کی جتنی حمد و ثنا اس امت نے بیان کی ہے' اور قیامت تک کرتی رہے گی' اتنی حمد و ثنا کسی امت نے بیان کی اور نہ بیان کر پائی ہے' حمد و ثناء کی اس خصوصیت کے پیش نظر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو تاکید فرمائی کہ:

کل امر ذی بال لا یبدا فیہ بالحمدا قطع (۲)

"جس اہم کام کی ابتدا اللہ تعالیٰ کی حمد سے نہ کی جائے' وہ کام بے برکت ہوتا ہے۔"

نبی اکرم ﷺ کی اس "وصیت" کا جو اثر ہوا' وہ اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے اپنی ہر کتاب کا آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد و مناجات سے کیا' اسی پہلو سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کی تصنیف کردہ لاکھوں' کروڑوں کتابوں میں حمد و مناجات کا جو ذخیرہ موجود ہے اور نت نئے انداز و اسلوب بیان سے موجود ہے' اس کا سوائے خالق و مالک کائنات کے کوئی احاطہ نہیں کر سکتا۔

الغرض قرآن و سنت کی ان نصوص کا اثر نہ صرف مسلمانوں کی زندگیوں میں منعکس رہا بلکہ اس کے اثرات ان کی نظم و نثر اور تصنیف و تحقیق پر بھی نمایاں ہوئے۔

اس تمہید کے بعد اب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں' اس بارے میں ہمارے سامنے سب سے پہلا سوال یہ آتا ہے کہ "فارسی ادب" میں "حمد و مناجات" کے مضمون کی ابتداء کیونکر ہوئی' اس کے متعلق حتمی طور پر تو کچھ کہنا مشکل ہے' لیکن چونکہ یہ بات یقینی ہے کہ فارسی زبان کی تمام "نشوونما" عہد اسلامی میں اسلامی تعلیمات و اثرات کے تحت ہوئی' اس لئے اگر یہ کہا جائے تو بالکل بر محل ہوگا کہ "اسلامی اثرات" اس زبان کی فطرت کا خمیر ہیں' اس لئے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید ہی کسی زبان نے "دینی و مذہبی اثرات" اتنی تیز رفتاری اور اتنی گہرائی کے ساتھ قبول کئے ہوں۔ جتنے فارسی زبان نے قبول کئے ہیں۔ اس سلسلے میں اردو زبان کی مثال ثانوی ہوگی' پھر جیسا کہ آپ جانتے ہیں فارسی زبان کے ارتقاء میں شاعری نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ فارسی شاعری کا سینہ مذہبی اثرات سے لبالب

---

(۱) الدارمی: سنن' مقدمہ ۲ (۲) ابن ماجہ' السنن' کتاب النکاح' ج ۱۹' اوب ۱۸

بھرا
ہوا ہے کیونکہ اس کا ارتقاء بھی عربی اور اسلامی اثرات ہی کی سرپرستی میں ہوا ہے۔

فارسی شاعری میں یوں تو کئی اصنافِ سخن پیدا ہوئیں مگر ہمارے نقطۂ نگاہ سے اس کی ایک صنف خاص طور پر توجہ کی مستحق ہے۔ اور وہ ہے مثنوی۔ آیئے مثنوی کی ترویج و ترقی پر ہم ایک نظر ڈال کر اپنے مطلب کی بات تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

فارسی زبان میں "مثنوی کا ارتقاء"

بقول محققین سب سے پہلی مثنوی ابو شکر البلخی نے لکھی۔ جو نوح بن نصر (۳۳۱ھ/۹۳۲ء تا ۳۴۳ھ/ ۹۵۴ء) کا درباری شاعر تھا۔ (۱) اسی عہد میں ابوالمؤید بلخی نے بھی جو نوح ہی کا درباری شاعر تھا مثنوی یوسف زلیخا لکھی (۲) اسی دربار سے منسلک اہم ترین شاعر رودکی تھا اسے "کلیلہ و دمنہ" کو فارسی نظم کا جامہ پہنچانے کا شرف حاصل ہے۔

عنصری (۳۵۰ھ۔۹۶۱ء تا ۴۳۱ھ۔۱۰۳۹ء) دربار غزنی کا ملک الشعراء تھا۔ جس کے سامنے بڑے بڑے شعراء پانی بھرتے نظر آتے تھے' دیگر اصنافِ سخن کے ساتھ ساتھ اس نے کچھ مثنویاں بھی لکھی تھیں لیکن فی الوقت سوائے مثنوی "وامق و عذرا" کے سب ناپید ہیں' اس کے علاوہ اس نے "جنگ مت و سرخ بت" "عین الحیوان" وغیرہ (۱) کے نام سے بھی مثنویاں تصنیف کیں۔

امام الشعراء فردوسی (ولادت حدود ۳۲۹ھ۔۹۴۰ء) نے مشہور زمانہ کتاب "شاہنامہ" کی تکمیل (۴۰۰ھ) بھی اسی زمانے میں کی' ایک اور شاعر ناصر خسرو کی دو مثنویاں "روشنائی نامہ" اور "سعادت نامہ" دونوں ناصحانہ ہیں جو بحر ہزج میں لکھی گئی ہیں۔ شاعر کا تعلق باطنی فرقہ سے ہے لہٰذا اس کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ رومانی مثنوی کا بانی نظامی گنجوی (۵۳۰ھ تا حدود ۵۹۹ھ) ہے جس نے پانچ مثنویاں لکھ کر اپنے ماہر فن ہونے کا لوہا منوایا جو حسب ذیل ہیں :

(۱) مخزن الاسرار' موضوع اخلاق و تقویٰ
(۲) خسرو شیریں (۳) لیلیٰ و مجنوں
(۴) ہفت پیکر (یا بہرام نامہ) (۵) سکندر نامہ

جامی نے خمسہ' نظامی کی تقلید میں سات مثنویاں لکھیں جن کی تفصیل آگے آتی ہے۔

مولائے روم' مولانا" جلال الدین رومی" کی "مثنوی معنوی" اپنی طرز کی عدیم المثال مثنوی ہے جس کی مثال نہ اس سے پہلے کی شاعری میں نظر آتی ہے اور نہ ہی اس کے بعد کی تاریخ میں ہے۔

---

(۱) تاریخ ادبیات ایران : ص ۳۹ از شفق (۲) ذبیح اللہ صفا' تاریخ ادبیات در ایران' ص ۳۹
(۳) ذبیح اللہ صفا : تاریخ ادبیات در ایران ۔ ص ۳۹

برصغیر پاک و ہند میں امیر خسرو کی پانچ مثنویاں "مطلع الانوار شیریں و خسرو مجنوں لیلیٰ آئینۂ سکندری ہفت بہشت" مشہور ہیں۔

علیٰ ہٰذا القیاس فخر الدین اسد گرگانی نے جو سلجوقی حکمران طغرل بیگ (۴۲۹ھ۔ ۱۰۳۷ء تا ۴۵۵ھ۔ ۱۰۶۳ء) کا درباری شاعر تھا مثنوی ویس ورامین (در حدود ۴۴۶ھ۔ ۱۰۵۴ء) لکھی 'جبکہ مشہور شاعر سنائی (م ۵۴۵ھ) کو مثنویوں کی بدولت ہی شہرت حاصل ہوئی اس کی مشہور مثنویاں یہ ہیں :

(۱) حدیقۃ الحقیقت و شریعۃ الطریقت (۲) طریق التحقیق

(۳) سر العباد الی المعاد بالنوز الرموز (۴) کارنامہ۔

اول الذکر مشہور مثنوی ہے۔

تحفۃ العراقین خاقانی شروانی افضل الدین بدیل بن علی تولد در حدود (۵۲۰ھ۔ ۱۱۲۶ء در حدود ۵۹۵ھ۔ ۱۱۸۹ء) کی یادگار ہے۔

خواجہ فرید الدین عطار (م ۶۲۷ھ) نے بھی 'جو مولانا رومی کے پیش رو تھے 'مثنوی "منطق الطیر" تصنیف کی انہوں نے خسرونامہ کے عنوان سے بھی دو مثنویاں لکھیں "مصیبت نامہ" اور "الٰہی نامہ"

محمود شبستری (م ۷۲۰ھ۔ ۱۳۲۰ء) کی "مثنوی گلشن راز" شہرت کی حامل مثنوی ہے 'جس میں ۱۵ سوالات کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح اوحدی مراغی (حدود ۶۷۰ھ تا ۷۳۸ھ) نے مثنوی "دہ نامہ" یا "منطق العشاق" لکھی۔

خواجوی کرمانی (۶۷۹ھ تا ۷۵۳ھ) نے بھی پانچ مثنویاں تصنیف کیں :

(۱) ہما و ہمایوں (۲) گل و نوروز (۳) روضۃ الانوار (۴) کمال نامہ (۵) گوہر نامہ۔

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ فارسی زبان کے جتنے بھی نامور شعراء گذرے ہیں 'ان سب نے اس عنوان پر خامہ فرسائی کی اور اپنی مہارت و طلاقتِ لسانی کا ثبوت ملا۔ "مثنوی" لکھ کر بہم پہنچایا۔

آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ میرا موضوع "حمد و مناجات" ہے اور میں آپ کو مثنویوں کی تصنیف و تخلیق کی بات بتا رہا ہوں 'دراصل قصہ یہ ہے کہ فارسی زبان میں "حمد و مناجات" کے عنوان سے ہمیں مستقل طور پر تو زیادہ شاعری نہیں ملتی 'البتہ ہر مثنوی گو شاعر نے اپنی مثنوی کی ابتداء التزامی طور پر اللہ تعالیٰ کی "حمد و ثناء" کے عنوان سے کی ہے 'اس بارے میں شاید ہی کوئی استثنائی مثال مل سکے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ حدیث نبوی میں ہر "اہم کام" کو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء سے ہی شروع کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور چونکہ مثنوی کا تصنیف کرنا اہم کاموں کے ضمن میں آتا ہے 'اس لئے تمام مسلم شعراء نے التزامی طور پر اپنی مثنویوں کی ابتداء "حمد و مناجات" سے کی ہے اور ہر ایک شاعر نے اس مضمون کو بندھے طریقے سے ہٹ کر ایک نئی جدت اور تخلیقی ذہن کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے اس

لئے مذکورہ بالا مثنویوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء پر اتنا ذخیرہ موجود ہے جو شاید خود عربی شاعری میں بھی موجود نہ ہو اور چونکہ فارسی شاعری تخیلاتی یا فلسفیانہ شاعری ہے اس لئے اس حمد و مناجات کے اس ذخیرے میں ہمیں عصری علوم و تصورات کی جھلک بھی بھرپور طریقے سے نظر آتی ہے۔

میرے خیال میں اگر کوئی صاحب نظر و فکر اس تمام سرمائے کو جمع کردے تو یہ "حمد و مناجات" کے عنوان پر ایک گراں قدر خدمت ہوگی اور اس گراں بہا خزینہ میں ہر شخص کو اس کے اپنے جذبوں کی دھڑکن خوبی محسوس ہوگی۔

ان مثنوی گو شعراء کے علاوہ بعض دیگر شعراء نے بھی اس عنوان پر طبع آزمائی کی ہے جن میں

عمر خیام ؎

بر سینۂ غم پذیر من رحمت کن — بر جان و دل اسیر من رحمت کن
بر پائے خرابات رو من خشائے — بر دست پیالہ گیر من رحمت کن

نیز ؎

من بندہ عاصیم رضائے تو کجا است — تاریک و لم نور صفائی تو کجا است
مارا تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی — آں بیع بود لطف عطای تو کجا است

انوری (محمد اوحد الدین م ۵۴۷ھ) شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی (م ۶۹۱ھ) وغیرہ بھی شامل ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب میں اپنے موضوع کے دوسرے حصے کی طرف آتا ہوں جیسا کہ سطور بالا میں ذکر آچکا ہے کہ علامہ عبدالرحمٰن جامی نے دوسرے شعراء کی طرح مثنوی کی صنف پر بھی بھرپور طبع آزمائی کی ہے اور سات مثنویاں ہفت اورنگ لکھ کر داد تحقیق لی ہے۔ ان مثنویوں پر اظہار خیال کرنے سے پیشتر ہمارے لئے علامہ جامی کی حیات پر ایک نظر ڈالنا مناسب ہوگا۔

علامہ عبدالرحمٰن جامی کا پورا نام مولانا نورالدین عبدالرحمٰن اور جامیؔ تخلص ہے۔ آپ ضلع جام کے قصبہ خرجود میں بتاریخ ۲۳ شعبان المعظم ۸۱۷ھ۔ ۷ نومبر ۱۴۱۳ء کو پیدا ہوئے اور ہرات میں ایک بھرپور زندگی گذار کر بتاریخ ۱۸ محرم ۸۹۸ھ۔ ۹ نومبر ۱۴۹۲ء کو وفات پائی۔

جامیؔ نے اپنے زمانۂ طفلی میں اپنے والد محترم کے ہمراہ ہرات اور سمرقند کا سفر کیا اور ممتاز علماء سے کسب تعلیم کیا۔ بعد ازاں عملی تربیت کے لئے سعدالدین محمد الکاشغری (خلیفہ شیخ بہاؤالدین نقشبندؒ) کا دامن پکڑا اور ان کی وفات کے بعد ان کے جانشین بنے۔ ان کے بعد انہوں نے خواجہ عبیداللہ احرار کے در دولت پر حاضری دی اور ان سے تصوف کے رموز و معارف سیکھے۔

علامہ عبدالرحمٰن جامیؔ علوم و عرفان کا ایک سمندر تھے۔ انہیں اگر ایک "کتاب خانے" سے مشابہت دی جائے تو بجا ہوگا۔ انہوں نے متنوع موضوعات پر تقریباً ۹۹ کتب تصنیف فرمائیں جن میں سے

ہر تصنیف بجائے خود کئی کئی تصانیف کا مرقع ہے' تاہم ان میں سے بقول آقائی مرتضٰی پچاس کے قریب کتب دستیاب ہو سکی ہیں۔(۱)

ان کتابوں پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ "جامی" کے سینے میں اللہ تعالیٰ نے کتنی وسعت رکھی تھی۔ انہوں نے ایک طرف علوم متداولہ مثلاً عقائد (اعتقادنامہ) سیرت طیبہ (شواہد النبوّۃ)' تصوف (کتاب لوائح' اشعۃ اللمعات) عبادات (مثلاً مقدمات.....حج) سیرت و سوانح (نفحات الانس) علم حدیث (چہل حدیث) علم الاخلاق (بہارستان) علم نحو (شرح جامی) متعدد کتابوں کی شروح اور دیگر موضوعات پر مدلل کتب لکھیں تو دوسری جانب شاعری میں اپنی فصاحت و بلاغت کا لوہا منوایا' وہ ایک طرف شاعری کے میدان میں فتح و کامرانی کے جھنڈے گاڑتے نظر آتے ہیں' تو دوسری جانب علوم و فنون کے سمندر میں مردانہ وار شناوری کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

علامہ عبدالرحمٰن جامؔی کو یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی زندگی ہی میں اتنی شہرت اور مقبولیت عطا کر دی تھی کہ بڑے بڑے بادشاہ ان کی نظر کرم کے منتظر رہتے تھے۔ چنانچہ ترکی کے نامور عثمانی حکمران محمد ثانی نے انہیں استنبول آنے کی دعوت دی' مگر آپ تشریف نہ لے گئے' بعد ازاں بایزید ثانی نے انہیں دو مکتوبات ارسال کئے۔(۲)

سلطان ظہیر الدین بابر (م ۹۳۰ھ ۔ ۱۵۳۷ء) نے اپنی توزک میں علامہ جامؔی کا تذکرہ کرتے ہوئے کیا خوب لکھا ہے:

"جامی کو کسی مدح و ستائش کی ضرورت نہیں' یہاں ان کا ذکر محض برکت و سعادت حاصل کرنے کے لئے کیا گیا ہے..... علوم عقلی و نقلی میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا۔"(۳)

فارسی شعراء میں جہاں سب سے زیادہ تصنیف و تحقیق کی سعادت ان کے حصے میں آئی ہے (۴)۔ وہاں قدرت نے "حمد و مناجات" کے عنوان پر سب سے زیادہ عمدہ شاعری کرنے کی سعادت بھی انہی کو نصیب کی ہے' بادی النظر میں یہ دعویٰ بہت بڑا معلوم ہوتا ہے' لیکن جب عملی طور پر علامہ عبدالرحمٰن جامؔی کی شاعری میں موجود "حمد و مناجات" کے ذخیرہ کو دوسرے شعراء کے کلام کے ساتھ موازنہ کر کے دیکھا جاتا ہے تو اس دعوے کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

علامہ عبدالرحمٰن جامؔی نے نہ صرف یہ کہ اس عنوان پر مستقل نظمیں' قصیدے' رباعیاں اور ابیات کہے ہیں بلکہ خاص حمد و مناجات پر مستقل مثنوی تحریر کرنے کا شرف بھی حاصل کیا ہے' میری مراد

(۱) مقدمہ مثنوی ہفت اورنگ' ص نوزدہ

(۲) یہ دونوں مکتوبات فریدون نے منشات ۱: ۳۶۱ ۔ ۳۶۴ میں جمع کر لئے ہیں۔

(۳) توزک بابری۔ (۴) آقائی مرتضٰی۔ ص نوزدہ

ان کی مثنوی "سبحۃ الاسرار" سے ہے جس میں مختلف اخلاقی اقدار کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ سے ان کے حصول کی دعا و مناجات کی گئی ہے اس طرح ان کی شاعری میں "حمد و مناجات" کے موضوع پر بہت بڑا ذخیرہ جسے گنجینۂ جواہر کہنا چاہئے موجود ہے۔

ان کی حمد و مناجات کی شاعری میں ان کے سات مثنویوں کو جو "ہفت اورنگ" کے نام سے معروف ہیں بہت بڑا دخل ہے۔ ان تمام مثنویوں کی ابتدا حمد و مناجات سے ہی کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر "ہفت اورنگ" میں سے پہلی مثنوی "سلسلۃ الذہب" کی ابتداء میں حمد و مناجات کے عنوان پر حسب ذیل پانچ طویل نظمیں موجود ہیں:

(۱) مطلع دیباچہ نظم قدیم۔

للہ الحمد قبل کل کلام بصفات الجلال والاکرام

(۲) اشارہ تنزیہ و تقدیس حضرت سبحانہ و تعالیٰ

جل من لا الہ الا ھو لا تقل کیف ھو ولا ماھو

(۳) دربیان آنکہ حقیقت حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ ہستی ساذج است و وجود مطلق:

در بیان بارگاہ الست پیش ازیں رہ نبردہ اند کہ ہست

(۴) اشارت بہ معنی تنزیہ کہ مقتضای عقل و تنبیہ کہ موجب سمع است با تنبیہ (تقید) بر آنکہ کمال در مرتبہ جمع است۔

وصف حق حق خود تو اند گفت ایں گہر را خردند اند سفت

(۵) مناجات در تضرع و ابتہال بحضرۃ ذی الجلال والافضال جل جلالہ و عم نوالہٗ

ای ظہور تو باطون و مساز وی بروز تو باکمون ھمراز

مناجات کا آخری شعر بھی توجہ چاہتا ہے آپ فرماتے ہیں:

پسندم ازان صحیفۂ تجل یوم یطوی السماء کطی سجل

ان ابتدائی پانچ طویل نظموں کے علاوہ بھی اس مثنوی میں علامہ جامی نے جگہ جگہ حمد و مناجات کا مضمون باندھا ہے۔ مثال کے طور پر صفحہ ۷ پر آپ نے ایک عنوان قائم کیا ہے:

"قطع۔ الطناب و ختم بر دعاء استجابت مآب"

اس عنوان کے تحت آپ فرماتے ہیں:

جامی الطناب در سخن نہ سزاست قصہ کوتاہ کن کہ وقت دعا است

نہ دعای کہ شاعرانہ بود از رہ صدق برکرانہ بود

اسی طرح صفحہ ۵۳۰ پر ایک اور عنوان کا اضافہ کیا ہے:

اشارۃ الی تفسیر قوله تعالیٰ "فاینما تولوافثم وجه اللّٰہ"

از نبی ایما تو لواخسوان ثم وجه اللّٰہ الهش متمم دان

اسی طرح اس مثنوی میں شاعر نے حرف الف (ص ۸۲) معنی اسم اللہ (ایضاً)، دربیان معنی اسم الرحمٰن الرحیم، وغیرہ نے مستقل عنوان قائم کر کے ان پر طویل و مفصل نظمیں کہی ہیں جنہیں ہم "حمد و ثنا" ہی کے ضمن میں شمار کر سکتے ہیں۔

(۲) مثنوی سلامان

علامہ موصوف کی دوسری مشہور مثنوی "سلامان" ہے۔ اس مثنوی کا موضوع ایک قدیم قصہ یعنی سلامان و ابسال کی عشقیہ داستان ہے۔ علامہ عبدالرحمٰن جامی نے اس کی بسم اللہ، اللہ تعالیٰ کے پاک و برتر نام سے کی ہے:

ای بیادت تازہ جان عاشقان ز آب لطفت تر زبان عاشقان

از تو بر عالم فتادہ سایہ خوبرویان راشدہ سرمایہ

(۳) تحفۃ الابرار

علامہ جامیؔ کی دوسری مثنوی "تحفۃ الابرار" ہے جو ایک قسم کی دینی و عرفانی مثنوی ہے، اس مثنوی کے آغاز میں علامہ جامی نے سات مستقل نظموں میں حمد و مناجات کا مضمون باندھا ہے۔

(۱) آغاز نظم کے بجائے "نثر" سے ان الفاظ کے ساتھ دیا ہے:

حامداً لمن جعل جنان کلّ عارف مخزن اسرار کماله ولسان کل واصف مطلع انوار جماله۔

گنجینۂ اسرار کمالش مائیم آئینۂ انوار جمالش مائیم

دور افگن استار جلالش مائیم دستان زن او تار نوالش مائیم

(۲) در فتح باب سخن بسملہ کہ رندانہ بابش کلید در گنج حکیم است و نوای سیئش صلای سر خوان کریم۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہست صلای سر خوان کریم

(۳) در اراد ان تسمیہ تحمید کہ فاتحۂ کتاب مجید و فاتح ابواب مزید است۔

آنچہ نگارد زی این رقم بر سر ہر نامہ دبیر قلم

(۴) مناجات اول متضمن "اشارات بشواہد جود و دلائل وجود حق سبحانہ و تعالیٰ ما اعلی شانہ و ما اجلی برہانہ۔

ای صفت خاص تو واجب بذات بستہ ہو سلسلہ ممکنات

(۵) مناجات دوم: متضمن اشارات بآنکہ حقیقت حق وجود صرفست و ہستی مطلق جلّ ذکرہ ولا الٰہ

غیرہ و عم برہ۔

ای علم ہستی بلبا تو پست نیست حو د ہست ہو ہر چہ ہست

(۶) مناجات سوم: متضمن باشارت بآنکہ موجب غفلت ہمی از نور شہود لو .....

ای ز وجود تو نمود ہمہ جود تو سرمایہ سود ہمہ

(۷) مناجات چہارم در التجاء و اعتصام بذی الجلال والاکرام و طلب توفیق در تحقیق این مقصود و مرام۔

ای ذکرم چارہ گر کارہا مرہم راحت نہ آزارہا

(۴) سجۃ الاسرار

یہ مثنوی جیسا کہ اوپر گذرا مکمل طور پر حمد و مناجات کی مثنوی ہے۔ جو چالیس مقالوں پر مشتمل ہے جس میں مختلف صفات عالیہ و اخلاق جلیلہ کا تذکرہ کر کے اللہ تعالیٰ سے ان کے حصول کی دعا کی گئی ہے۔ اس مثنوی کی ابتداء بھی حسب معمول حمد و مناجات سے ہی کی گئی ہے:

المنۃ للہ کہ خون گر شتم یک چند غنچہ عاقبت بشگفتم

از کشمکش دہر بسی آشفتم کز گوہر را ز سبحہ داری سفتم

(۵) مثنوی یوسف زلیخا

اگلی مثنوی "یوسف زلیخا" ہے جس کے آغاز میں چار مستقل عنوانات قائم کر کے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کا مضمون بیان کیا گیا ہے۔

(۱) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہست صلای سر خوان کریم

الٰہی غنچہ امید بگشای گلے از روضۂ جاوید بنمای

(۲) افتتاح نامہ بنام یگانہ کہ چشمہ روشن مہر از دریای نوالش یک نم است و دفتر ملون سپہر از آیات کمالش یک رقم:

بنام آنکہ نامش حر ز جا نہا است ثنایش جوہر تیغ زبانہا است

(۳) ترتیب دلائل ہستی واجب تعالیٰ نمودن و ترغیب بتامل در ان فرمودن:

ولا تاکی درین کاخ مجازی کنی مانند طفلان خاک بازی

توی ان دست پرور مرغ گستاخ کہ بودت آشیان بیرون ازیں کاخ

(۴) دست بدامن بمناجات بدستیاری ارباب حاجات۔

خداوندا زہستی سادہ بودیم زہم نیستی آزادہ بودیم

(۵) تخصیص مناجات بناظم بدستیاری مشارک دعاہم:

من آن مرغم کہ دامم دانہ تست فسون و چشم افسانہ تست

(۶) مثنوی لیلیٰ مجنوں

اس سلسلے کی چھٹی مثنوی لیلیٰ مجنوں ہے، جس میں عرب میں مشہور المیہ قصے کو نظم کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ اس کے آغاز میں حمد و ثناء پر دو نظمیں شامل کتاب ہیں:

(۱) ای خاک تو تاج سربلند ان مجنوں تو عقل ہوشمندان

(۲) دست فکرت در سلسلہ ممکنات زدن دبذر و توحید واجب برآمدن

نظارگیان بایں کہن دیر در مرحلہ نظر سبک سیر

(۷) مثنوی خردنامہ اسکندری

اورنگ ہفتم "مثنوی خردنامہ اسکندری" پر مشتمل ہے، جس کی ابتداء ایک حمد:

الٰہی کمال الٰہی تراست جمال جہاں بادشاہی تراست

اور ایک مناجات:

کرم گسترا عاجز و مضطرم بجستر سحاب کرم بر سرم

سے ہوتا ہے:

یہ تو مثنویوں میں آنے والی حمد و مناجات کی نظموں کا تذکرہ تھا جبکہ علامہ جامیؔ نے اس صنف سخن کو فقط مثنوی تک محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے دیوان میں بھی اس پر طبع آزمائی کا سلسلہ جاری و ساری رکھا ہے:

(۱) قصیدہ صائے

ان کے دیوان کا آغاز قصائد سے ہوتا ہے، ان قصائد میں سے متعدد قصیدے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور مناجات کے موضوع پر مشتمل ہیں:

(۱) فی توحید سبحانہ وتعالیٰ:

آنکہ تسبیح حصابر صدق او آمد گوا گاہ احصای ثنایت گفتہ لا احصی ثناء

(۲) فی توحید عزاسمہ:

درین صحیفہ جو آغاز کردم املا را گرفتم از ہمہ اولی ثنای مولی را

(۳) انما اللہ واحد واحد صمد لم یلد و لم یولد

(۴) انما اللہ الہ واحد فھو الغائب و ھوالشاھد

(۵) ایک اور قصیدہ تحمید خداوند تعالیٰ وتقدس کے عنوان پر ہے:

زان پیش کزمداد دہم خامہ رامدد جویم مدد زفضل توای فضل لمہ

ان قصائد میں بعض نہایت عمدہ اور اچھوتی مناجات بھی ہیں۔ مثال کے طور پر ۵-۱۱۱ کے تحت جو مناجات دی گئی ہے اس میں آپ فرماتے ہیں :

ایا کاشف الاسرار ویا قابض الانوار ویا مقصد الابرار ویا مونس الاحرار
منم ماندہ گرفتار بدین نفس خطاکار بہ رحمت ہم داراز ین دشمن غدار

انہی قصائد میں ایک قصیدہ اللہ عزاسمہ کی توحید پر بھی ہے جس کا عدد ۶۲-۱ ہے اس میں علامہ جامیؔ فرماتے ہیں :

سبحان من تحیّر فی ذاتہ من سواہ فہم خرد بہ کنہ کمالش نبردہ راہ

(۲) ترجیع بندھا

"ترجیع بند" بھی شاعری کی ایک لطیف صنف ہے اس عنوان سے علامہ جامی نے متعدد ترجیع بند کہے ہیں جو متنوع موضوعات اور لطیف معانی پر مشتمل ہیں۔ اگرچہ ترجیع بندوں کا آغاز نعت نبویؐ سے ہوتا ہے لیکن جلد ہی ہمیں توحید الٰہی اور اس کی حمد و ثناء اور دعاو مناجات پر متعدد ترجیع بند ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک نظم میں متصوفانہ انداز میں آپ فرماتے ہیں :

لاح برق یہیّج الا نواق تازہ شد درد عشق و داغ فراق
شربت مرگ اگرچہ جان سوز است نیست چون فرقت تو تلخ مذاق

ایک اور ترجیع بند کا آغاز آپ نے یوں کیا ہے :

طال شوقی الیک یامولائی ہنا آن رخ جہان آرای
رفت عمرم بہ درد حرمان آہ سوخت جانم بہ داغ ہجراں وای

(۳) ترکیب بند

"ترکیب بند" کی صنف پر علامہ جامی نے جو شاعری کی ہے اس میں اگرچہ حمد و مناجات کا مستقل عنوان تو مفقود ہے البتہ مختلف اشعار میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے صوفیانہ محبت وارفتگی کا ذکر ملتا ہے مثال کے طور پر آپ فرماتے ہیں :

بنشیم و باغم تو سازم پنہاں زتو وبا تو عشق بازم

(۴) غزل

علامہ جامیؔ نے "غزل" کی صنف پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اس طبع آزمائی میں وہ مختلف گلی کوچوں، صحراؤں اور دریاؤں سے گزرے ہیں۔ غزلوں کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور اس سے دعاو

مناجات پر متعدد غزلیں ملتی ہیں۔ مثلاً۔

یا من یدا جمالك فی کل مابدا — باداهزار جان مقدس ترا فدا
حرزجا نها است نام دلبر — ما اَعزَّ اسمهٗ وما اعلیٰ
ہستی مطلق است و وحدت صرف — این هُو این اَنت این اَنا

(۵) مثنوی ھا

اسی دیوان میں علامہ جامیؔ کی متعدد مثنویاں بھی شامل ہیں اور ہر مثنوی کے شروع میں حمد و ناجات کے مضمون کا التزام کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر پہلی مثنوی میں جو سلطان بوسعید کی مدح میں ہے، فرماتے ہیں:

بہ نام خدائی پست و بلند — ز خورشید فضلش بود بہرہ مند

(۶) رباعیہا

دیوان میں مولانا کی متعدد رباعیاں بھی شامل ہیں جن میں سے بعض ہمارے زیرِ بحث موضوع اور مضمون سے بھی متعلق ہیں۔ اس کی پہلی رباعی ہے:

سبحانك لا علم لنا الّاما — علّمت والهمت لنا الهاما
مارا برهان زما وآگاهی ده — از سر معیتی داری یاما

مناجات کے عنوان پر شاید اس سے بہتر کچھ کہنا ممکن نہ ہو:

یارب زود کون بے نیازم گردان — وزافسر فقر سرفرازم گردان
در راہ طلب محرم رازم گردان — زان رہ کہ نہ سوی تست بازم گردان

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ علامہ جامیؔ نے حمد و مناجات پر اتنا بڑا خزینہ چھوڑا ہے جو ہمیں شاید ہی کسی اور شاعر کے ہاں مل سکے۔

(۳) حمد و مناجات پر علامہ جامی کی شاعری کی خصوصیات

اب ہم اپنے مضمون کے آخری حصے پر پہنچ چکے ہیں جس میں علامہ جامیؔ کی اس صنفِ شاعری پر مختصر سا تبصرہ کیا جائے گا۔

علامہ عبدالرحمٰن جامیؔ نے گو ہر جگہ اپنے آپ کو متبکر یعنی نت نئے اسالیب اور اچھوتے مضامین تخلیق کرنے والا قرار دیا ہے، لیکن ان کے ناقدین انہیں ایک متبکر کی جائے ایک مقلّد شاعر کی حیثیت دینے پر مصر ہیں۔ آقائی مرتضٰی مقدمۂ "ہفت اورنگ" میں لکھتے ہیں:

"جامی باہمہ این مؤلفات علمی و فنّی در شیوۂ نظم و نثر ہنر مندی متبکر و مبدع و سبک تازہ دارد و

شیوۂ نو ندارد بلکہ شخصی است مقلّد و در تقلید کاملاً استاد و ہنر مند است۔" (مقدمہ، ص نوزدہ)

چنانچہ یہی بات علامہ جامیؔ کی حمد و مناجات کی صنف شاعری پر بھی راست آتی ہے۔ علامہ جامیؔ نے جو بحریں، جو ترکیبیں اور جو مضامین بیان کئے ہیں ان میں زیادہ تر انہیں نے اپنے پیش رو شعرا کی تقلید کی ہے۔ البتہ ان کے بیان کرنے اور شعر کہنے کا انداز ایسا ہے کہ ان کے ہاں پہلے کی ہوئی بات بھی ایک نیا حسن و جمال کا پیکر اتم بن کر نمودار ہوتی ہے۔ اس لئے ان کا مقلد شاعر ہونا ہمارے خیال میں ان کے لئے کوئی ایسا عیب نہیں رہتا کیونکہ انہوں نے ہر شعر میں اتنی مہارت اور ہنر مندی کا مظاہرہ کیا ہے کہ کوئی پرانی بات پرانی نظر نہیں آتی بلکہ وہ اپنا ایک خاص انداز اور اسلوب رکھتی ہے اور اس میں کمال کے ساتھ ساتھ جدّت کا پہلو بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

(۲) فلسفیانہ و صوفیانہ خیالات کی کثرت

علامہ عبدالرحمٰن جامیؔ بذات خود ایک متبحّر عالم دین، صوفی، منطقی اور فلسفی تھے۔ اس لئے ان کی تمام شاعری میں بالعموم اور حمد و مناجات کی شاعری میں بالخصوص ان کے ان خیالات و تصورات کی جھلک بہت نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر مثنوی "سلسلۃ الذہب" میں اشارت تنزیہ و تقدیس حضرت سبحانہٗ (ص ۳۔۴) کے تحت فرماتے ہیں:

جلّ من لا الٰہ الاّ ہو	لا تقل کیف ہو ولا ماہو
ہرچہ مفہوم عقل و ادراک است	ساحت قدس اوازان پاک است
قدس ذات چو برتر از کیف است	کیف ہو گفتن اندر و عیب است
ماوہو چیست لا وھو میگوی	راہ ازیں لا و ہوبدان میجوی
لاوہو ہر دو نفی و اثبات اند	نافی غیر و مثبت ذات اند
ہیچ ذاتی بذات او فرسد	عقلِ کل در صفات او نرسد
دو جہاں جلوہ گاہ وحدت تو	شہد اللہ گواہ وحدت تو

اسی طرح مثنوی یوسف زلیخا میں فرماتے ہیں:

خداوند از ہستی سادہ بودیم	زہم نیستی آزادہ بودیم
نخست از نیست مارا ہست کردی	بقید آب و گل پابست کردی
ز ضعف ناتوانی نای رساندی	زنادانی بداناى رساندی
میان نیک و بد تخلیط کردیم	گہی افراط و گہ تفریط کردیم

علیٰ ہذا القیاس علامہ جامیؔ اپنے شعروں میں فلسفیانہ موشگافیاں اور متصوفانہ نکات بیان کرتے

چلے جاتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ہر بات اتنے عمدہ اور اتنے نفیس پیرائے میں کہی گئی ہے کہ مشکل الفہم ہونے کے باوجود سہل الفہم محسوس ہوتی ہے۔

(۳) عشق الٰہی کا جذبۂ صادق

علامہ جامؔی کی شاعری کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ جذبۂ عشق الٰہی سے سرشار نظر آتی ہے۔ جامی کی شاعری کا ایک ایک شعر، ایک ایک لفظ گہرے عشق و محبت کی غمازی کرتا ہے، جامی کی شاعری کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں مرغ بسمل کی طرح تڑپتے رہتے تھے، اسی لئے ان کی شاعری میں جو درد و فراق، جو حزن اور جو سوز دروں ہے، وہ ہمیں کسی اور شاعر کے کلام میں نظر نہیں آتا۔ مثال کے طور پر جامؔی اپنے ایک ترجیع بند میں فرماتے ہیں:

لاح برق یبتج الاشراق   تازہ شد درد عشق و داغ فراق
شربت مرگ اگرچہ جان سوز ست   نیست چون فرقت تو تلخ مذاق
تو بہ لب جان نازنینی و من   کمترین بندہ بہ جان مشتاق
گر تو بااین جمال جلوہ کنی   شور و افغان برآید از عشاق
کز دو عالم ہمیں وصال تو بس   بلکہ یک پرَ تو از جمال تو بس

اسی طرح کی ایک دوسری نظم میں جو مشہور، مگر مشکل بحر میں کہی گئی ہے۔ جامی اپنے قلبی سوز دروں کا یوں اظہار فرماتے ہیں:

نفحات وصلک او قدت جمرات شوقک فی الحشا   زعت بہ سینہ کم آتشی کہ نزد زبانہ کما تشاء
توچہ مظہری کہ ز جلوۂ تو صبحہ صوفیان   گذرد ز ذروۂ لامکان کہ خوشا جمال ازل خوشا
ہمہ اہل مسجد و صومعہ می ورد صبح و دعای شب   من و ذکر طلعت و طرۃ تو من الغداۃ الی العشا
زکمند زلف تو ہر شکن گرہی فکندہ بہ کار من   بہ گرہ کشای لعل خود کہ زکار من گرہی کشا
دل من بہ عشق تو می نہد قدم وفا بہ رہ طلب   فلئن سعافیہ سعادلئن مشافیہ مشا
بہ تو داشت خو دل گشتہ خون ز تو بود جان مرا سکون   فہجر تنی و جعلتنی متحیراً متوحشا
چہ جفا کہ جامؔی خستہ دل زجدای تو نمی کند   قدم از طریق جفا بکش سوی عاشقان جفا کش

(دیوان، ص ۱۰۵)

اس درد و سوز کا ایک پس منظر علامہ جامی پر آنے والے پے بہ پے مصایب و آلام بھی تھے، جن میں علامہ ساری زندگی مبتلا رہے۔ جس میں ان کی نرینہ اولاد کا بچپن اور عہد جوانی میں فوت ہونا اور سیاسی حالات کی دگرگونی بھی ہے۔

اسی لئے درد و سوز جامی کی دل کی گہرائی سے نکلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس میں شاعرانہ تو تعلی یا تخیل ہی نہیں بلکہ سوز قلب کی رعنائیاں بھی شامل حال ہوتی ہیں۔ اپنی ایک مثنوی میں ایک مناجات میں آپ حقیقت حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

جامی الحذر در سخن نہ سزاست   قصہ کوتاہ کن کہ وقت دعا است
نہ دعای کہ شاعرانہ بود   ازرہ صدق بر کرانہ بود
خواہی آنہا زایزد حعال   کہ بود در قیاس عقل محال
بل دعا قرین صدق و صفا   مشتمل بر مصالح دوسرا
ہم در دجاہ و حشمت دینی   ہم در و عز و دولت عقبی
سرنہی بر زمین عجز و نیاز   کای خدای کار او بلطف بساز
عدل را در دلش چناں جاکن   کہ نراند بدون زعدل سخن

ان مذکورہ بالا خوبیوں کے علاوہ جامی کی شاعری میں دینی و مذہبی خاص طور پر متشرعانہ خیالات تخیلات کی ندرت اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء میں الحاح وزاری عربی و قرآنی الفاظ و تراکیب کی کثرت وغیرہ قسم کی خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ جن پر اختصار کی بناء پر گفتگو کو مختصر کر دیا گیا ہے۔

آخر میں میں اس موضوع کی عظمت اور اپنی کوتاہی پر اس مضمون کو ختم کرنے کی اجازت چاہتا ہوں بقول سعدی ۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را بیان پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

مولانا عبید اللہ کوثی

کلامِ اقبالؔ میں حمد و مناجات

شاعر مشرق علامہ اقبالؔ کے کلام میں دعا اور حمد و مناجات کے بڑے جاندار اور دلکش نمونے موجود ہیں' ان میں ان کی مشہور نظم "شکوہ" ایک طویل مناجات ہے' اور اس کو کلام اقبالؔ میں اپنے درد دل' اپنے طاقتور اسلوب' دلکش انداز بیان اور تاثیر کی وجہ سے نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس میں وہ خدا سے مخاطب ہیں' پھر ان کے یہاں جواب آں غزل کے طور پر "جواب شکوہ" بھی موجود ہے۔ شکوہ میں انہوں نے خدا سے ہم کلام ہوتے ہوئے جن بنیادی سوالوں کو چھیڑا ہے' اور خار زندگی کی جس چبھن کا شکوہ کیا ہے' اس کا مداوا جواب شکوہ میں اس خوبصورتی سے پیش کر دیا گیا ہے کہ زندگی کو رواں دواں اور جاوداں بنانے کی تحریک ہوتی ہے اور جمود اور سکون' حرکت و عمل میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

اقبالؔ اپنے کلام میں جب انسانوں سے مخاطب ہوتے ہیں تب بھی اکثر ان کا روئے سخن' خدا کی طرف ہو جاتا ہے۔ اقبالؔ کے خلاف' فرشتوں نے بارگاہ الٰہی میں جو شکایت کی ہے' وہ بھی مناجات ہی کا ایک رنگ ہے۔ (۱)

کی حق سے فرشتوں نے اقبال کی غمازی — گستاخ ہے کرتا ہے فطرت کی حنا بندی
خاکی ہے مگر اس کے انداز ہیں افلاکی — رومی ہے نہ شامی ہے کاشی نہ سمرقندی
سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے — آدم کو سکھاتا ہے آداب خداوندی

پھر جب اقبالؔ نے شکوہ میں اسرار خودی اور رموز بے خودی کے جوہر دکھلائے تو زمین پر اگرچہ اس دراز نفسی سے چشمک نے گل کھلائے' شکایت نے دہن کھولے مگر فلک کے فرشتے بھی اس پر مہر بہ لب نہ رہ سکے۔ (۲)

پیر گردوں نے کہا سن کے' کہیں ہے کوئی — بولے سیارے' سر عرش بریں ہے کوئی
چاند کہتا تھا نہیں' اہل زمیں ہے کوئی — کہکشاں کہتی تھی پوشیدہ یہیں ہے کوئی

---

(۱) دیکھئے کلیات اقبال اردو۔ بال جبریل (غزل) ص ۱۷ (۲) بانگ درا (جواب شکوہ) ص ۱۹۹

کچھ جو سمجھا مرے شکوے کو تو رضواں سمجھا
مجھے جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

جنت سے نکالا ہوا یہ انسان اپنے چمن کی یادوں کو بھلا نہ سکا اور اقبال بھی شکوہ اور جواب شکوہ کی حدود سے باہر نکلے تب بھی انہوں نے بے بسی کے ساتھ انسان کے اس ترک وطن پر خدا سے گفتگو جاری رکھی۔(۱)

کیا کہوں اپنے چمن سے میں جدا کیونکر ہوا	اور اسیر حلقۂ دام ہوا کیونکر ہوا؟
دیکھنے والے یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں تجھے	پھر یہ وعدہ حشر کا صبر آزما کیونکر ہوا؟
پرسش اعمال سے مقصد تھا رسوائی مری	ورنہ ظاہر تھا سبھی کچھ، کیا ہوا کیونکر ہوا؟

اقبال کے یہاں دعا و مناجات کی مستقل صنفیں اگرچہ بار بار مختلف صورتوں میں پائی جاتی ہیں مگر بارگاہ الٰہی میں سرگوشی اور ہم کلامی کا یہ رنگ ان کی غزلوں اور نظموں میں بھی شوق و سرمستی کی بہاریں دکھلاتا ہے۔ ان میں شوخی کے ساتھ ادب، ناز کے ساتھ نیاز مندی، احساس عبدیت کے ساتھ خدائے تعالیٰ کے وفور رحمت اور کمال بندہ نوازی پر وہ اعتماد ہے جس نے ان کے سازِ دل کے ہر نغمہ کو جاں فزا اور ہر شعر کو بادۂ معرفت بنا دیا ہے۔ وہ روپ بدل بدل کر اپنے خالق و مالک اور داتا کے دربار میں آتے ہیں، کبھی اپنے دل کا سوز بچوں کی زبان سے ادا کرتے ہیں۔(۲)

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری	زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

یہ پوری دعا اپنی روانی، دل کشی اور تاثیر میں اپنی مثال آپ ہے۔ اقبال مسلمانوں کی زبان حال سے مناجات پیش کرتے ہیں تو ان کی دعا میں مرد مسلمان کا امتیازی کردار جھلکنے لگتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے یہاں مسلمان کسی خاص نسلی گروہ کا نام نہیں ہے۔ ان کے نزدیک مسلمان ایمان و کردار سے آراستہ اس فرد یا جماعت کی علامت ہے جس کے اندر چند در چند خوبیاں درکار ہیں اور یہ وہ خوبیاں ہیں جن کی یافت یا دریافت کی تمنا دنیا کے ہر ایک انسان کے دل میں ہونی چاہیے۔(۳)

یارب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے	جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے
پھر وادیٔ فاراں کے ہر ذرے کو چمکا دے	پھر شوق تماشا دے پھر ذوق تقاضا دے
بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل	اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے

اس دعا میں وہ محبت سے لبریز دل، خودداری اور حریت، بے لوث محبت، بے باک صداقت، بصیرت، شفاف دل، آثار مصیبت کا احساس اور امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا کی طلب کرتے ہیں اور آخر

---

(۱) بانگ درا (غزل) ص ۱۰۰ — (۲) بانگ درا (بچے کی دعا) ص ۳۳ — (۳) بانگ درا (دعا) ص ۲۱۲

میں۔

میں بلبل نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا ۔ تاثیر کا سائل ہوں' محتاج کو داتا دے

اقبال اپنی ایک اور دعا "آرزو" (۱) میں اپنے رب کو مخاطب کر کے یہ کہتے ہیں کہ میں دنیا کی محفل سے اکتا گیا ہوں' دل بجھا ہوا لطف محفل معدوم' دل شورش سے بھاگ کر ایسا سکوت چاہتا ہے جس پر زباں آوری بھی نچھاور ہو' آرزو ہے کہ دامن کوہ کے معمولی جھونپڑے میں غم دنیا کا کانٹا دل سے نکال کر خموشی میں اپنی فکر کو آزاد کر دوں' چشمے کی شورش سے پیدا ہونے والے ساز اور چڑیوں کے سرود کی لذت میں اپنے ساغر جہاں نما کو جو دل کہلاتا ہے محو تماشا کر دوں' گل کی کلی کھلے تو اس کا پیام ساغر دل میں بھر جائے' سبزہ کا بچھونا ہو اور ہاتھ کا سرہانا' خلوت میں وہ ادا ہو جس پر جلوت شرمسار ہو' ہرے بوٹے صف بستہ ہوں ایسے کہ شفاف پانی ان کی تصویریں لے رہا ہو' کہسار کا نظارہ ایسا دلفریب ہو کہ پانی بھی موج بن کر اٹھ کے دیکھتا ہو' غرض فطرت کے یہ اور ایسے دوسرے مناظر سامنے ہوں اور اس وقت۔ (۲)

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے ۔ رونا مرا وضو ہو' نالہ مری دعا ہو

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے ۔ تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہر درد مند دل کو رونا مرا رلا دے

بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

اقبال کا یہی ذوق مناجات اندلس کی سرزمین میں "طارق کی دعا" بن کر سامنے آیا جہاں طارق کی زبان سے اور کلام اقبال کی راہ سے ہمارے آپ کے ساز دل کا یہ ترانہ۔ (۳)

دو عالم سے کرتی ہے بے گانہ دل کو ۔ عجب چیز ہے لذت آشنائی

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا ۔ خبر میں نظر میں اذان سحر میں

طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو ۔ وہ سوز اس نے پایا انہیں کے جگر میں

کشاد در دل سمجھتے ہیں اس کو ۔ ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں

دل مرد مومن میں پھر زندہ کر دے ۔ وہ بجلی کہ تھی نعرہ لاتذر میں

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے

نگاہ مسلماں کو تلوار کر دے

اقبال قرطبہ گئے تو سرزمین اندلس کا شاندار ماضی اور اس کی گزشتہ شوکت و جمال انہوں نے مسجد قرطبہ کے آئینہ میں دیکھی۔ گل اپنے کشاد کے لئے دست صبا کا محتاج ہوتا ہے مگر اقبال کا جوش جنوں ہی ان کی بقائے فکر و خیال کو کھول دینے کے کافی تھا' وہ ایسی جگہ تھے جہاں جوش جنوں نے کئی صدیوں کے

---

(۱) بانگ درا ص ۴۶ (۲) ایضاً ص ۴۷ (۳) بال جبریل ص ۱۰۵

پردے اٹھا دیئے تھے، وہ شعور ذات کی منزل میں آئے اور یوں گویا ہوئے۔

ہے یہی میری نماز، ہے یہی میرا وضو — میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو
راہ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق — سر خوش و پر سوز ہے لالہ لب آبجو

میرا نشیمن نہیں درگہ میر و وزیر — میرا نشیمن بھی تو شاخ نشیمن بھی تو
تجھ سے گریباں مرا مطلع صبح نشور — تجھ سے مرے سینہ میں آتش اللہ ہو
تجھ سے میری زندگی سوز و تب و درد و داغ — تو ہی مری آرزو، تو ہی مری جستجو
پاس اگر تو نہیں شہر ہے ویراں تمام — تو ہے تو آباد ہیں اجڑے ہوئے کاخ و کو

اور اب اقبال حقیقت ازلی کی بارگاہ میں عرفان حق کی منزل میں پہنچتے ہیں جہاں ان کے احساسات بے حجاب ہو جاتے ہیں۔(۲)

پھر وہ شراب کہن مجھ کو عطا کر کہ میں — ڈھونڈ رہا ہوں اسے، توڑ کے جام و سبو
چشم کرم ساقیا دیر سے ہیں منتظر — جلوتیوں کے سبو، خلوتیوں کے کدو

مناجات کے ان لمحات میں اقبال مقام قرب پر پہنچتے ہیں تو ان کے شوق اور راز و نیاز کے پر کھل جاتے ہیں مگر گومگو کی کیفیت ہے کچھ کہا اور بہت کچھ کہنے سے رہ گیا، وہ بارگاہ عظمت اور پھر فلسفہ و شعر کی محدود سر زمین، اور زمان و مکان کے پابند انسان کی کوتاہ اور محدود قوت گویائی۔

تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ — اپنے لئے لامکاں، میرے لئے چار سو
فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا — حرف تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

اقبال نے زبان فارسی میں مناجات اور حمد و دعا کا ایک گلزار پیدا کر دیا ہے اس میں بھی ان کے یہاں بڑا تنوع ہے غزلوں کے علاوہ نظم کے مختلف اصناف میں ان کے ذوق تکلم نے مختلف مواقع پیدا کر لئے ہیں تاہم یہاں ان کے دید کی شنید کا یا ان کے شنید کو دہرانے کا موقع نہیں۔ اس بادہ سے سرشاری کے لئے ایک اور جام (مضمون) کی ضرورت ہوگی البتہ یہاں بطور نمونہ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ پہلے یہ دعا (۳)

یارب درون سینہ دل باخبر بدہ — در بادہ نشہ را نگرم، آں نظر بدہ
ایں بندہ را کہ بانفس دیگراں نزیست — یک آہ خانہ زاد مثال سحر بدہ
سیلم، مرا بجوئے تنک مایہ پیچ — جولانگہے بوادی و کوہ و کمر بدہ
سازی اگر حریف یم بیکراں مرا — با اضطراب موج، سکون گہر بدہ

---

(۱) بال جبریل ص ۹۱ (دعا) (۲) بال جبریل ص ۹۲ (۳) کلیات اقبال فارسی۔ زبور عجم ص ۲

شاہین من بصید پلنگاں گذاشتی		ہمت بلند و چنگل ازیں تیز تر بدہ
رحمم کہ طائران حرم را کنم شکار		تیرے کہ ناقگندہ فتد کارگر بدہ
خاکم بہ نغمہ دواؤد بر فروز		ہر ذرہ مرا پر و بال شرر بدہ

وہ ایک مناجات میں اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ وجود عالم میں 'خدا کی ہستی ہی جلوہ فرما ہے' میری اپنی ذات میں بھی اسی کا پرتو ہے مگر بد نصیبی یہ ہے کہ پھر بھی وہ ہستی مجھ سے دور ہے 'اے خدایا زندگی کے ساز کا ہر نغمہ تیرا فیض ہے اور تیری راہ میں جاں سپاری 'رشک زندگی ہے۔ ایسا کر کہ دل ناشاد کی تسکین کا تو ہی ذریعہ بن جا 'سینوں میں تیرا ہی دوبارہ بسیرا ہو 'ہمارا وجود تیرے ہی نام اور عظمت کا ثنا خواں ہو 'اس لئے اے خدا اپنے خام کار عاشقوں کو پختہ تر بنا 'تیری تقدیر سے ہمیں یہ شکوہ ہے کہ تیری محبت اور عشق کا نرخ بالا و فزوں ہے اور یہی پونجی ہمارے درمیان نایاب ہے یہی عطا فرما تا کہ شکوہ کا کوئی موقع نہ رہے' وہ فرماتے ہیں۔(۱)

اے چوں جاں اندر وجود عالمی		جانِ ما باشی و از ما می رمی
نغمہ از فیض تو در عود حیات		موت در راہ تو محسود حیات
باز تسکین دل ناشاد شو		باز اندر سینہ ہا آباد شو
باز از ما خواہ ننگ و نام را		پختہ تر کن عاشقان خام را
از مقدر شکوہ ہا داریم ما		نرخ تو بالا و نادار یم ما

اقبال کو یہ احساس ہے کہ ان کے جام میں فطرت کے خم خانہ سے 'خدا نے جو شراب عشق و معرفت انڈیل دی ہے وہ رگ زندگی کے ہر تار کو چھیڑنے اور اس میں زندگی کی لہر پیدا کر دینے کے لئے کافی ہے 'اس لئے ان کی خواہش یہ ہے کہ خدا اس صہبا کی تندی اتنی بڑھا دے جس سے ان کی مینائے حیات یعنی جان و تن گداز ہو جائیں' وہ فرمائش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے خداوند! میری فریاد کی تاب و تپش سے عشق الٰہی کا سرمایہ چن دے 'میرے جسم کے بے آب ریگستان کی خاک کو بے باکی اور جرأت کا شعلہ بنا دے اور ایمان و کردار میں ایسی تجلی بھر دے جو حق کے نور سے روشن ہو اور باطل کے خاشاک اور جذبات کو تباہ کر دے 'میں فنا کے خمیر سے بنا ہوں لیکن جب موت آئے تو میرے عشق کی پونجی اور میری زندگی کے غبار سے چراغ لالہ پیدا فرما دے مرے داغ محبت کو زندگی نو عطا کر 'میری تشنگی کی آگ کو ہر طرف بھڑکا دے' پھیلا دے(۲)

اے کہ از خم خانہ فطرت جامم ریختی		ز آتش صہبائے من بگداز مینائے مرا

---

(۱) کلیات فارسی اسرار خودی ص ۷۵   (۲) کلیات فارسی۔ پیام مشرق ص ۸۴

عشق را سرمایہ ساز از گرمئ فریاد من | شعلہ بے باک گرداں خاک مینائے مرا
چو ہمیرم از غبار من چراغ لالہ ساز | تازہ کن داغ مرا' سوزاں بجائے مرا

اقبال کے فارسی کلام کو باغ اردو میں زبان ترکی کا شیل سمجھئے جس کے نمونوں کو پیش کرنے کے لئے' ان کے آہنگ اور سخن سے آشنائی درکار ہے یا ایسی ترجمانی اور وضاحت کہ ان کے سخن کا ساز ہماری اپنی زبان میں بھی اپنی ترنگ اور تندی کو قائم رکھ سکے' اس لئے ہم پھر اردو کے بازار میں آتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ اقبال نے اس میں حمد و مناجات اور دعا کی صنف میں اپنے نالہ کو کس طرح بلند اور اپنی آہ کو کس طرح رسا اور اثر انگیز بنا دیا ہے۔

اقبال کا فن' شعر و ادب کی مختلف صنفوں میں' آپ بیتی کے ساتھ جگ بیتی سنانے چلا تو انہوں نے اپنے تخیل کی مدد سے وہ بھی سن لیا جو ممکنات کی بستی میں کہہ سکتا' نظام کفر میں اگر کہیں کچھ تاب و تپش ہے تو وہ بوئے ایماں ہی کا پر تو ہے' اقبال نے لینن کے معقول تخیلات میں انکار کج کی پیدار نمائش دیکھی تو وہ لینن کو اپنے تخیل کی مدد سے وہاں لے گئے جہاں یعلم خائنۃ الاعین وما تخفی الصدور (۱) (وہ خدا آنکھ کے اشاروں اور سینہ کے بھیدوں سے آگاہ ہے) کی عکس ریزیاں اور مالک کون و مکان کی جلوہ طرازیاں تھیں' کمیونزم نے بیسویں صدی کی نویں دہائی میں اب جو دیکھا ہے' وہ اقبال نے لینن کی زبان سے خدا کے حضور میں پہلے ہی سن لیا تھا' مادیت اور نفس کے سحر میں گرفتار دنیا سے لینن کی فطرت آزاد ہوئی تو اس پر سب سے بڑی حقیقت کا انکشاف ہوا اور وہ بول اٹھا (۲)

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات | حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات
میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے | ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات
محرم نہیں فطرت کے سرود ازلی سے | بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات
آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت | میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات
ہم بند شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے | تو خالق اعصار و نگارندہ آنات

مادی دنیا کے پیچ و خم کو درست کرنے کے لئے لینن نے جو کارگزاری دکھائی اس سے انسانی مسائل میں گرہ پر گرہ پڑتی گئی' ان گرہوں کو کھولنے کے جو اہل تھے وہ روبہ زوال تھے اور جو نااہل تھے وہی میدان عمل کے شہ سوار تھے' ان کی شہ پاکر ابلیس کے لمس نے نظام زندگی کو غیر متوازن بنا دیا تھا' لینن نے مغرب کے علم و ہنر کی ان کمزوریوں کو واشگاف کر دیا ہے۔

یہ علم' یہ حکمت' یہ تدبر' یہ حکومت | پیتے ہیں لہو' دیتے ہیں تعلیم مساوات

---

(۱) سورۃ المومن آیت ۱۹

(۲) کلیات اردو۔ بال جبریل (لینن خدا کے حضور میں) ص ۱۰۶

بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس — کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم — حد اس کے کمالات کی برق و بخارات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت — احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

لینن کو مغرب کے زوال کے آثار بھی نظر آئے وہ کہتا ہے۔

آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر — تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات
میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل — بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیران خرابات
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سر شام — یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات

لینن گزارش احوال واقعی کے بعد انسانیت کے درد کے درماں کے لئے بارگاہ الٰہی میں عرض کرتا ہے۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں — ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ — دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

جاہلیت اور مادیت کے طوفان میں کشتی کو ساحل مراد تک لانے کا کام ان لوگوں کا تھا جو عالمان دین ہیں مگر ان کی صفوں میں ملائے قیل و قال کی دراندازی نے بحث و جدال کا ماحول پیدا کر دیا اور اصل حقیقت نظروں سے اوجھل ہو گئی' اقبال نے اپنی ایک نظم میں اس کی بھی شکایت کی۔ اسے مناجات کہیں یا مناجات کا ساطرز سخن' بہر حال بارگاہ الٰہی میں اقبال کا یہ شکوہ بھی(۱)

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبط سخن کر نہ سکا — حق سے جب حضرت ملا کو ملا حکم بہشت
عرض کی میں نے' الٰہی مری تقصیر معاف — خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لب کشت
نہیں فردوس' مقام جدل و قال و اقول — بحث و تکرار اس اللہ کے بندہ کی ہے سرشت
ہے بد آموزی اقوام و ملل کام اس کا — اور جنت میں نہ مسجد' نہ کلیسا نہ کنشت

اقبال نے ملائے قیل و قال کو اگرچہ' حضرت حق سے حکم بہشت دلوا دیا ہے' شاید اس کے خلوص اور دین خداوندی سے اس کی گہری وابستگی کی بنا پر' اس کی زاہدانہ زندگی اور مذہبی غیرت کی وجہ سے' مگر اس کی تیز حس جو بات بات پر بھڑک اٹھتی ہے اور اس کی ملی حمیت جو رونق اسلام کے لئے کفر و شرک کی ذرا سی بھی آہٹ پا کر چوکنا ہو جاتی اور بحث و تکرار کا موقع تلاش کر لیتی ہے اور جو اقوام و ملل کے ساتھ خوش گواری اور حسن معاملہ کی اسلامی تعلیمات کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ اقبال کو اس ادا پر اعتراض ہے اور وہ بد آموزی اقوام و ملل کو حسن اخلاق سے اور بحث و تکرار کو ساز دل کے پر سوز نغموں سے بدلنا چاہتے ہیں' گویا حضرت ملا کے حسن نیت اور حسن عمل میں خوش گفتاری اور خوش آموزی کا بھی جوہر چاہئے ورنہ

---

(۱) بال جبریل (ملا اور بہشت) ص ۱۱۷

اقبال یا اقبال کے شناسا ایسے موقعوں پر ضبط سخن نہ کر سکیں گے۔

اقبال اپنی مناجات' حمد و شکوہ اور دعا کے علاوہ اپنی غزلوں' نظموں' رباعیات اور قطعات میں جب شوخی اور سر مستی کا کیف پاتے ہیں تو ان کے مقام ناز و نیاز کی رفعتیں دیدنی ہوتی ہیں۔ اس میں ان کے اسلوب کا تنوع' ان کے مچلتے جذبات کی دھوپ چھاؤں' رحمت حق کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے انداز و طور یہ پتہ دیتے ہیں کہ ان کی بلند حوصلہ طبیعت کے شانہ بشانہ ان کی مناجات کو بام بلند تک پہنچانے میں ان کے سوز دروں کا کس قدر حصہ رہا ہے ان کی مناجاتیں جو غزل کے بادہ سے سرشار ہیں ان میں ان کی سر مستی اور سرشاری اس قدر فزوں ہوئی کہ اس نے راز درون خانہ کو نہاں نہیں رہنے دیا۔ غزل کے لطیف لباس میں سرگوشیوں کی صدا ایسی مسلسل اور واضح ہے کہ اس سے اقبال کے جذب و کیف کا راز عیاں ہو جاتا ہے' وہ خود بھی جا بجا اس کا اقرار کرتے ہیں۔

غزل آنچناں سرودم کہ بروں فتاد ازم | بکسے عیاں نکردم' ز کسے نہاں نکردم

کسی پر عیاں بھی نہ کیا اور کسی سے نہاں بھی نہ رکھا اور ایسی غزل چھیڑی کہ جو سربستہ راز تھا وہ کھل کر سامنے آگیا' ایک اور شعر میں وہ یہ کہتے ہیں کہ مجھ کو غزل خواں سمجھا جاتا ہے' حالانکہ میں لالہ صحرائی کا عاشق ہوں اس کے چہرہ زیبا اور حسن دل ربا کے نظارہ کے سوا مجھے کچھ خبر نہیں' اے خداوندا! میرے سینہ میں شبنم کی طرح یہ کس کی آمد ہے؟ کیسی بارش ہے جو تیری بارگاہ سے میرے دل پر ہو رہی ہے۔

ایں چیست کہ چوں شبنم بر سینہ من ریزی | جزء لالہ نمی دانم' گویند غزل خوانم

ایک غزل میں ان کا انداز تخاطب کچھ اس طرح ہے۔

اک دانش نورانی' اک دانش برہانی | ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی
اس پیکر خاکی میں اک شی ہے سو وہ تیری | میرے لئے مشکل ہے اس شی کی نگہبانی
اب کیا جو فغاں میری پہنچی ہے ستاروں تک | تو نے ہی سکھائی تھی مجھ کو یہ غزل خوانی
ہو نقش اگر باطل' تکرار سے کیا حاصل | کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی

اقبال کو بارگاہ الٰہی سے جو خودی اور سرشاری عطا ہوئی ہے' اور ان کے لئے جس جوہر ادراک کو ارزاں کر دیا گیا ہے وہ اسے بھی تمام انسانوں کا مشترک سرمایہ بنانا چاہتے ہیں' ساقی نامہ کی ابتدا تو اس طرح ہوتی ہے(۱)

شراب کہن پھر پلا ساقیا | وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا | مری خاک جگنو بنا کر اڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر | جوانوں کو پیروں کا استاد کر

---

(۱) بال جبریل (ساقی نامہ) ص ۱۲۳

مگر اسی نظم میں ان کی نظر جب اس عنایت ربانی پر پڑتی ہے جو مسلسل ان پر ہوتی رہی تو وہ درخواست کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ عام انسانوں کو بھی عطا ہو (۱)

جوانوں کو سوز جگر بخش دے　　مرا عشق، میری نظر بخش دے

مرے دیدہ تر کی بے خوابیاں　　مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں

مرے نالہ نیم شب کا نیاز　　مری خلوت و انجمن کا گداز

امنگیں مری، آرزوئیں مری　　امیدیں مری، جستجوئیں مری

مری فطرت آئینہ روزگار　　غزالان افکار کا مرغزار

مرا دل، مری رزم گاہ حیات　　گمانوں کا لشکر، یقیں کا ثبات

یہی کچھ ہے ساقی، متاع فقیر　　اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹا دے اسے

لٹا دے، ٹھکانے لگا دے اسے

اقبال کے غزلوں میں حمد کا ایک رنگ تو یہ ہے (۲)

چمک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں، شرارے میں

جھلک تیری ہویدا چاند میں، سورج میں، تارے میں

اور کہیں شوق دید میں اس طرح محو کلام ہیں (۳)

کبھی اے حقیقت منتظر، نظر آ لباس مجاز میں

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

اور اس دریا رتبہ تک رسائی کے بعد ان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ گنہگار اور پریشان انسانیت کے لئے یہی جائے امان ہے۔ کون و مکان کا خالق اور رب، ستم رسیدہ، بے چین اور شرمسار انسانوں کی سب سے بڑی اور آخری پناہ گاہ ہے۔ (۴)

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی

مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں

اقبال کو خوبی احساس ہے کہ ان کا نالہ رسا ہے 'ان کی غزل ہنگامہ آفریں ہے 'ان کے الفاظ اگرچہ دیر و حرم کی اصطلاحوں سے ترجمانی کا سلیقہ حاصل کرتے ہیں مگر ان لفظوں کے ذریعہ وہ جو نغمہ پیدا کر

---

(۱) بال جبریل (ساقی نامہ) ص ۱۲۵　　(۲) بانگ درا (غزل) ص ۱۳۸

(۳) ایضاً (غزل) ص ۲۸۰　　(۴) ایضاً ص ۲۸۱

رہے ہیں اس سے فرش اور عرش دونوں کے مکیں یکساں طور پر متاثر اور مخمور ہو جاتے ہیں۔(۱)

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں

گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقش بند
میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں

ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ اپنے بارے میں خود فریبی کا شکار ہوں، اپنی بلندی و پستی دونوں کا شعور رکھتے ہیں۔

گاہ مری نگاہ تیز، چیر گئی دل وجود
گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

اقبال کی مناجات میں حمد اور حمد کے اشعار میں مناجات، جب تغزل کی لے اور غزل کے ترنم سے دو آتشہ ہو جاتے ہیں تو اس بادہ کی تندی، پڑھنے والوں کو بھی سرشار اور بے خود کر دیتی ہے اور وہ بھی شریک مناجات ہو کر اقبال کے اشعار گنگنانے لگتے ہیں۔(۲)

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر

عشق بھی ہو حجاب میں، حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

تو ہے محیط بیکراں، میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہر شاہوار کر

نغمہ نو بہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دم نیم سوز کو طائرک بہار کر

اقبال اس حقیقت سے بھی باخبر ہیں کہ انسان کو خدا کی نظر میں، ساری کائنات کے مقابلہ میں جو کرامت حاصل ہے اس کی وجہ سے یہ بشر گوہر تخلیق کی حیثیت رکھتا ہے، اپنے خالق کی نظر میں یہ انسان ہی محبوب ترین ہے، اسی لئے یہ "مور ناتواں" اپنے پروں کو دیکھ کر نازاں ہو جاتا ہے اور جب قدموں پر نظر جاتی ہے تو شرم ساری کے جذبات بھی پیدا ہوتے ہیں، مذکورہ غزل کے دو آخری شعر، اس منظر کی عکاسی کرتے ہیں۔

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

روز حساب جب مرا پیش ہو دفتر عمل
آپ بھی شرم سار ہو، مجھ کو بھی شرم سار کر

رباعیات اقبال میں دانش اقبال نے اپنے فکر و فن کے اظہار کے لئے مختصر پیمانہ اپنے ہاتھوں میں لیا ہے مگر اس ذرا سی آب جو میں، محیط اقبال اسی طرح موجیں مار رہا ہے جس طرح وہ دوسرے پیمانوں (اصناف سخن) میں چھلکتا اور موجیں مارتا ہے یہاں حسن طلب نے شکوہ کی صورت بھی اختیار کی ہے اور اپنے درد و کرب اور بے بسی کا بھی اظہار کر دیا ہے اور پھر وہ اعتراف حق اور تحدیث نعمت کے طور پر اپنی آہ سحر

---

(۱) بال جبریل (غزل) ص ۵   (۲) ایضاً (غزل) ص ۔

اور نور بصیرت کے موتی کو بھی مناجات کی لڑی میں پرو کر پیش کر دیتے ہیں۔(۱)

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے ۔۔۔ بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے؟
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم ۔۔۔ بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

دلوں کو مرکز مہر و وفا کر ۔۔۔ حریم کبریا سے آشنا کر
جسے نان جویں بخشی ہے تو نے ۔۔۔ اسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

عطا اسلاف کا جذب دروں کر ۔۔۔ شریک زمرہ لایحزنون کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں ۔۔۔ مرے مولا! مجھے صاحب جنوں کر

جوانوں کو مری آہ سحر دے ۔۔۔ پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا! آرزو میری یہی ہے ۔۔۔ مرا نور بصیرت عام کر دے

اقبال کے ادب مناجات کے اس جائزہ کا اختتام ایک فارسی رباعی پر موزوں معلوم ہوتا ہے 'وہ بارگاہ الٰہی سے مخاطب ہیں مگر آخری مصرع میں انہوں نے جس خوبصورتی سے 'ذات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر کیا ہے اس میں حمد و نعت کا ایک دلکش تخیل' ایسا دے گئے ہیں جو قلب کو گرما دے اور روح کو تڑپا دے (۲)

بپایاں چو رسد ایں عالم پیر ۔۔۔ شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضور خواجہ ﷺ مارا ۔۔۔ حساب من ز چشم او نہاں گیر

یہ سن رسیدہ جہان آب و گل 'جب ختم ہو اور تقدیر کے تمام بھید بے پردہ ہو جائیں تو اس وقت خواجہ مدینہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حضور میں 'اے خداوند! مجھے رسوا نہ کیجئے گا ان کی نظروں سے بچا کر ہی میری حساب فہمی کر لیجئے گا۔

---

(۱) مذکورہ رباعیاں بال جبریل ص ۹۰۶ ـ ۸۶۸ سے ماخوذ ہیں۔

(۲) کلیات فارسی۔ ارمغان حجاز ص ۱۸، علامہ اقبال کی ایک اور رباعی بھی بانداز دگر' اسی تخیل کی ترجمانی کرتی ہے اور وہ یہ ہے

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر ۔۔۔ روز محشر عذر ہائے من پذیر
گر حسابم را تو بینی ناگزیر ۔۔۔ از نگاہ مصطفیٰ پنہاں بگیر

ڈاکٹر محمد اقبال حسین (بھارت)

بہزاد لکھنوی کی حمد و مناجات کا تنقیدی مطالعہ

سردار احمد خاں بہزاد جو اپنے نعتیہ کلام اور منفرد پُر سوز ترنم کی وجہ سے آزادی سے قبل اور اس کے بعد ایک عرصہ تک آسمان شعر و ادب پر چھائے رہے۔ ۱۹۰۰ء میں امین آباد لکھنؤ میں پیدا ہوئے انھیں کسی درسگاہ سے باقاعدہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا، پھر بھی اردو، عربی اور فارسی کی اچھی لیاقت پیدا کرلی تھی اور ساتھ ہی انگریزی سے شُدبُد بھی۔ اسکول کی تعلیم صرف مڈل تک حاصل کی تھی۔ ریلوے میں بحیثیت ٹی ٹی آئی ایک عرصہ تک ملازمت کی، خرابی صحت کی وجہ سے اس سے الگ ہو کر آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے۔ پھر پنچول فلم کمپنی لاہور۔ اس کے بعد راج کلا سند بمبئی سے بھی وابستہ رہے۔ ۱۹۵۱ء میں پاکستان منتقل ہو گئے اور کراچی میں قیام پذیر ہوئے اور وہیں پاکستان ریڈیو کی ملازمت بھی کرلی۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو کراچی میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ان کی ادبی خدمات کا دائرہ نظم و نثر دونوں ہی میدانوں پر محیط ہے، لیکن مقبولیت شعر کے میدان ہی میں حاصل ہوئی۔ بہزاد صاحب نہایت زود گو شاعر تھے۔ اس کا اندازہ ان کے شعری مجموعے کی کثرت سے کیا جاسکتا ہے۔ کتب خانوں کی فہرستوں میں ان کے تیرہ شعری مجموعوں کے نام درج ملے۔ نقش بہزاد، نغمۂ انور، وجد و حال، آہ ناتمام، ثنائے حبیب، بیان حضور، سوگیت، نعت حضور، کیف و سرور، موج طہور، مصحف بہزاد، نغمات بہزاد اور کفر و ایمان۔ حیدرآباد کے تمام اہم کتب خانوں میں تلاش بسیار کے بعد نقش بہزاد، وجد و حال، کیف و سرور، موج طہور، بیان حضور، نغمات بہزاد اور کفر و ایمان کے علاوہ کوئی اور شعری مجموعہ ہاتھ نہیں لگا۔ ان سات مجموعوں میں سے نقش بہزاد اور بیان حضور حمد سے خالی ہیں، باقی پانچ میں ایک ایک حمد موجود ہے۔ وجد و حال کے علاوہ تمام مجموعے جو میری نظروں سے گذرے ان کا کلام ۱۹۵۱ء یعنی پاکستان منتقل ہونے سے پہلے کا ہے۔ وجد و حال میں پاکستان منتقل ہونے کے بعد کا کلام ہے۔ اندازہ ہے کہ ان کے شعری مجموعے کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے، جن کا میں نے ذکر کیا ہے اور ان کے اکثر مجموعوں کی ابتداء ذات باری تعالیٰ کی حمد سے ہوتی ہے۔ اس لئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اردو کے کم ہی شعراء ایسے ہوں گے جن کے کلام میں حمد کے اشعار کی اتنی تعداد ہو گی جتنی بہزاد صاحب کے شعری مجموعے میں ہے۔

بہزاد صاحب گرچہ فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے لیکن مذہبی خاندان اور دینی ماحول میں تربیت

پانے کی وجہ سے یادِ الٰہی سے غافل کبھی نہیں رہے۔ ہمیشہ نماز روزے کے سختی سے پابند رہے۔ ان کے تین شعری مجموعے منشائے حبیب، بیانِ حضور، نعتِ حضور اور دوسرے مجموعے میں نعتیہ کلام کی کثرت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی عقیدت و محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تصوف سے بھی ان کو خاص دلچسپی تھی، ان کی غزلوں میں تصوف کا رنگ پایا جاتا ہے۔ وہ بریلی کے سلسلۂ نیازیہ چشتیہ سے بیعت تھے۔ بہزاد صاحب کو اپنے پیر و مرشد شاہ محمد تقی المعروف بہ عزیز میاں صاحب سجادہ نشین خانقاہ نیازیہ بریلی سے اس قدر عقیدت تھی کہ اپنے اکثر شعری مجموعے کو ان ہی سے انتساب کیا۔ ان کے انتقال کے بعد مرشد زادے حسن کے نام معنون کیا۔ ان کے دو مجموعے آدھا تمام اور وجد و حال میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ خاص طور سے آدھا تمام میں سلوک و معرفت اور درد و غم کے معنوی خوبیاں نمایاں ہیں، بہزاد صاحب خود آدھا تمام میں 'عرضِ حال' کے زیرِ عنوان تحریر کرتے ہیں "میرے پہلے دو دواوین جس عالم کی پیداوار ہیں، یہ دیوان اس عالم سے کہیں دور ہے۔"(۱)

بہزاد صاحب نے حمد و نعت، سلام، گیت، فلمی نغمے، مکالمے اور اسکرپٹ سب ہی کچھ لکھا لیکن ابتداء میں شہرت، غزل اور ترنّم کی وجہ سے ہوئی۔ ماہر القادری مرحوم رقم طراز ہیں کہ بہزاد صاحب کی شہرت کا آغاز ان کی غزل

ع دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے

سے ہوا۔ ان کی دو تین غزلیں فلم میں بھی مقبول ہوئیں۔ خاص طور سے یہ غزل

ع اس وقت مجھے چونکا دینا جب رنگ پہ محفل آجائے(۲)

لیکن بہزاد صاحب کی مقبولیت ان کے نعتیہ کلام کی وجہ سے ہوئی۔ مالک رام تحریر کرتے ہیں کہ "ان کی خصوصی شہرت نعت نگار کی حیثیت سے ہوئی اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کی نعت میں خاص کیفیت اور درد ہے، لحن سے پڑھتے بھی خوب تھے۔"(۳)

اور بقول عرفان عباسی "بہزاد صاحب ویسے تو غزل، نعت، گیت وغیرہ پر اچھی قدرت رکھتے تھے لیکن نعت گو کی حیثیت سے مشہور و مقبول تھے۔ اچھے اشعار اور پُرسوز و پُردرد ترنّم سے سننے والوں کو بیخود کر دیتے تھے۔"(۴)

بہزاد صاحب کی شاعری میں کوئی فکر و فلسفہ نہیں ہے بلکہ انہوں نے اپنے کلام میں آسان اور

---

(۱) بہزاد لکھنوی۔ آدھا تمام، مکتبہ سلطان، بمبئی اشاعت اول ص ۱

(۲) ماہر القادری، یادِ رفتگاں، جلد اول ص ۱۳۶

(۳) مالک رام، تذکرۂ معاصرین، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۷۸ء، ۳/ ۱۳۵

(۴) عرفان عباسی، شعرائے اتر پردیش، نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۴ء، ۱۸/ ۷۷

سادہ زبان، شگفتہ و دلکش اسلوب میں اپنے خیالات واحساسات کا اظہار کر دیا ہے۔ ماہر القادری تحریر کرتے ہیں کہ "وہ نہ مفکر تھے نہ مبلّغ تھے اور نہ انھیں علم و فن کا دعویٰ تھا ان کی شاعری ہلکی پھلکی شاعری ہے جس میں بلندیٔ فکر کی کمی کے باوجود لطف اور چٹخارہ ملتا ہے۔" (۱)

بہزاد صاحب کی شاعری کی امتیازی خوبی درد و غم کا اظہار ہے اور اس خوبی نے ان کی شاعری کو ابتذال سے پاک رکھا ہے۔ سید مسعود حسین رضوی ادیب لکھتے ہیں کہ "رہا غم تو وہ شاعری کے لئے خوشی سے کہیں بہتر موضوع ہے، خوشی انسان کے پست جذبات کو متحرک کرتی ہے اور غم بلند ترین حسیات کو بیدار کرتا ہے۔" (۲)

غزلوں کے علاوہ بہزاد صاحب کی حمد میں بھی یہ دونوں محاسن یعنی زبان و بیان کی سادگی اور درد و غم کی عکاسی نمایاں ہیں۔ خشیت الٰہی کے احساس نے حمد میں سوز اور زبان کی سادگی نے دلکشی پیدا کر دی ہے۔ وہ خود تحریر کرتے ہیں "مجھے نہ کبھی استاد ہونے کا دعویٰ ہوا اور نہ انشاء اللہ کبھی ہوگا اتنا ضرور ہے کہ شعر کہتا ہوں اور رو لیتا ہوں۔" (۳)

اپنے سوز دروں اور شاعری کے متعلق بہزاد صاحب لکھتے ہیں "میں جو کچھ نظم کرتا ہوں میری کیفیت ہے لہٰذا اس کے متعلق کچھ لکھنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔" (۴)

بہزاد صاحب کی یہی عاجزی، فروتنی، بے کسی، بے بسی، انکساری اور تواضع کا احساس ان کے مومن صادق ہونے کی علامت ہے۔ اور واقعہ ہے کہ جب انسان میں مخلوق و محکوم ہونے کا احساس ابھرتا ہے، تو انسان کے اخلاق و کردار اس کو بلند و شریفانہ فعل و عمل پر ابھارتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احسان و اکرام اور اس کے فضل و عنایات کا گیت گانے لگتا ہے۔ بہزاد صاحب کو اپنے مالک حقیقی رب العزت کے عظمت و جلال اور اس کے رحم و کرم دونوں ہی قسم کے اوصاف پر یقین کامل ہے۔ ان کی حمد میں الایمان بین الخوف والرجا، کی تصویر صاف نظر آتی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے جن اوصاف حمیدہ کا تذکرہ موجود ہے۔ بہزاد صاحب کا ان پر ایمان صادق ہے، اور ان کی حمد میں یہ بات صاف طور پر جھلکتی ہے کہ ان کا دل جو خشیت الٰہی سے معمور ہے اس کی عبادت و بندگی، اطاعت و فرمانبرداری اور ذکر و فکر میں مشغول ہے۔ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے عنایات اور کرم کا جو سر چشمۂ عام ہے، ہر کس و ناکس، شجر و حجر، جاندار و بے جان غرض کہ تمام اشیاء یاد الٰہی میں تسبیح خواں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے تمام صفات سے ہی اس کی عظمت و جلالت کا اظہار ہوتا ہے۔ شعری مجموعہ آہ نا تمام میں جو حمد ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کے اوصاف حمیدہ ھو الظاہر و الباطن (حدید۔۱) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بہزاد صاحب لکھتے ہیں۔

---

(۱) ماہر القادری، یاد رفتگاں، جلد اول، ص ۱۲۶

(۲) سید مسعود حسن رضوی ادیب، ہماری شاعری، کتاب نگر لکھنؤ ۱۹۷۹ء، ص ۱۰۲-۱۰۳

(۳) بہزاد لکھنوی، آہ نا تمام، ص ۱

(۴) بہزاد لکھنوی، وجد و حال، نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۵۵ء، ص ۳

ہے تو ہی نہاں' ہے تو ہی عیاں' تری شان جلّ جلالہٗ
تو کہاں نہیں' نہیں تو کہاں تری شان جلّ جلالہٗ

اسی حمد کے دوسرے شعر میں اللہ نور السموات والارض اور وله ما فی السموات والارض کے موضوع کو اس طرح ادا کیا ہے۔

ترے نور ہی کا ظہور ہیں' یہ جو جنّ وانس و طیور ہیں
یہ شجر حجر' یہ زمیں زماں' تری شان جلّ جلالہٗ

پھر رحمتی وسعت کل شی سے خیال کو اس طرح ادا کیا ہے۔

تو ہی ڈوبتوں کا سہارا ہے' تو ہی بحرِ غم کا کنارا ہے
تو ہی دکھیوں کا ہے پاسباں تری شان جلّ جلالہٗ

قرآن کریم کی ان آیات کریمہ میں جن میں عبادت کو مومن صادق کی زندگی کا حقیقی مقصد قرار دیا گیا ہے اور یادالٰہی سچے مومن ہونے کی علامت بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: الآبذکر الله تطمئنّ القلوب۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا یذکرون الله قیاما و قعوداً و علی جنوبهم (عمران۔ ۲) اور فرمایا والذین آمنوا اشدّ حبّاﷲ (بقرہ۔ ۲۰) بہزاد صاحب کہتے ہیں۔

تری فکر مذہب صادقاں تری یاد جوہر عاشقاں
ترا ذکر مسلک عارفاں' تری شان جلّ جلالہٗ

اور قرآن کریم کی آیت وفی الارض آیت للموقنین و فی انفسکم افلا تبصرون اور عالم الغیب والشهادة (انعام۔ ۹) کے مفہوم کو اس طرح ادا کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔

یہی رنگ دیکھ کے دنگ ہے' جسے کچھ شعور ہے ذھنگ ہے
تو ہی راز ہے' تو ہی رازداں' تری شان جلّ جلالہٗ

اللہ تعالیٰ کی رحمت جو ہر چیز پر عام ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کتب علی نفسه الرحمة (انعام۔ ۳) بہزاد کہتے ہیں۔

ہے ترا کرم ہی چمن چمن' ہے تری عطا ہی روش روش
ہے تو ہی تو خلق کا مہرباں' تری شان جلّ جلالہٗ

اور اس حمد کا آخری شعر ہے۔

ہے ترا ہی نور یہاں وہاں' ترا آستاں ہے ہر آستاں
ہے جب ہی تو خم سر عاشقاں' تری شان جلّ جلالہٗ

بہزاد صاحب کے ایک اور مجموعہ کفر و ایمان میں بھی ایک حمد ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے رحم، کرم اور شفقت و محبت ہی کی تفصیل ہے۔ مصائب و آلام میں اللہ تعالیٰ کی رحمت و عنایت اور اپنے مہربان و محبوب پر عنایت اعتماد کے اظہار کے ساتھ کامیابی و کامرانی کی التجا بھی ہے۔ الا ان اولیاء اللّٰہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (یونس۔ ۶۲) اور لا تقنطو امن رحمۃ اللّٰہ (زمر۔ ۶) اور فلا تکن من القانطین (حجر۔ ۶) کی تعبیر و تفسیر بھی ہے۔ آخری شعر میں للّٰہ یسجد اور انما الاعمال بالنیات کا اقرار اور اعتراف بھی۔ بہزاد صاحب کہتے ہیں۔

حمد پاک

پایا نہ جب سہارا لے دو جہاں کے مالک
میں نے تجھے پکارا اے دو جہاں کے مالک

مغموم ہوں بدل دے اب تو مسرتوں سے
تقدیر کا ستارا اے دو جہاں کے مالک

طوفاں کی تیزیوں میں جب ڈگمگائی کشتی
تو نے دیا سہارا اے دو جہاں کے مالک

مخلوق کی اذیت مخلوق کی مصیبت
تجھ کو ہے کب گوارا اے دو جہاں کے مالک

گر دور ناخدا ہے، شامل تری عطا ہے
ہر موج ہے کنارا اے دو جہاں کے مالک

حقّا ہمارے بگڑے کاموں کو ہے بناتا
ادنیٰ ترا اشارا اے دو جہاں کے مالک

دنیائے بندگی میں بہزؔاد نے ہمیشہ
سجدہ تجھے گزارا اے دو جہاں کے مالک

بہزاد صاحب کے شعری مجموعہ "کیف و سرور" میں بھی ایک حمد ہے جس میں پانچ اشعار ہیں۔ پہلے شعر میں بندگی کا اعتراف اور اللہ رب العزت کے خالق کائنات ہونے پر ایمان و یقین کا اظہار ہے۔ شعر یہ ہے۔

تیرا ہی ہر طرف یہ تماشا ہے اے کریم
جو بھی یہاں پہ ہے تیرا بندہ ہے اے کریم

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو نعمتیں عطا کی ہیں اور اپنے لطف و کرم سے انسان کو جو بیش بہا نعمتوں سے نوازا ہے 'ایک مومن صادق کی حیثیت سے اس کا اظہار تشکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ترے ہی لطف سے ہے یہ راحت بھی عیش بھی
دنیا ترے کرم ہی سے ہی دنیا ہے اے کریم

پھر اللہ تعالیٰ کے قادر مطلق ہونے اور حیات و ممات اسی کے دست قدرت میں ہونے پر بہزاد اپنے ایمان و یقین اور عقیدۂ توحید کا بیان اس طرح کرتے ہیں۔

یہ مرگ یہ حیات یہ غم یہ خوشی یہ کیف
ادنیٰ سا سب یہ تیرا کرشمہ ہے اے کریم

اس کے بعد تعزمن تشاء و تذل من تشاء بیدك الخير انك على كل شئ قدير (آل عمران۔ ۳) کا بیان اس طرح شعر میں کیا ہے۔

عزت بھی تیرے ہاتھ ہے ذلّت بھی تیرے ہاتھ ہے
جو چاہتا ہے جس کو تو دیتا ہے اے کریم

شاعر اللہ تعالیٰ کے معبود حقیقی، رحمٰن، رحیم، محی و ممیت، معزّ و مذلّ کے صفات کے اقرار و اظہار کے بعد اپنے عجز و انکساری کا اظہار کرتا ہے اور اپنے رحم و کرم کے لئے اس طرح دست بدعا ہے۔

بہزاد پر بھی اک نگہ مہر ہو ذرا ۔۔۔ بہزاد بھی تو "اک" ترا بندہ ہے اے کریم

اسی طرح "موج طہور" میں جو حمد ہے اس میں بھی دوسرے حمد کی طرح صفات باری تعالیٰ اور اس کی نعمتوں کا ذکر ہے۔ اس کے بے پایاں انعام و اکرام کا شکر ادا کرنے سے عاجزی اور بے بسی کا اظہار ہے۔ شاعر اللہ عزّ و جل کے قادر، خالق، شافی، حق، رب، کریم، سمیع، بصیر، غفور، رحمٰن، رحیم، واسع، مجیب، بدیع، قدوس، سلام، سبحان اور دوسرے اوصاف حمیدہ جو بے شمار ہیں ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

حمد

شکر کس طرح سے ہو تیرا ادا رب کریم ۔۔۔ تو نے دینے سے سوا ہم کو دیا رب کریم
تمی قادر تمی خالق تمی شافی تمی حق ۔۔۔ ہر طرح لیتے ہیں ہم نام ترا رب کریم
ترے ہی نام سے ملتی ہے تسلی دل کو ۔۔۔ تو ہی سنتا ہے غریبوں کی دعاء رب کریم
تیرے ہی فیض و کرم سے ہے دو عالم کی بہار ۔۔۔ تیرے ہی دم سے ہے گلشن میں ہوا رب کریم
پتّے پتّے میں نظر آتے ہیں تیرے انوار ۔۔۔ ذرّہ ذرّہ میں ہے تو جلوہ نما رب کریم
دکھ میں اٹھتی ہے تری سمت زمانہ کی نظر ۔۔۔ تو ہی کرتا ہے زمانہ پہ عطا رب کریم
تیرے ہی فیض سے بہزاد نے پائی عزت ۔۔۔ تیرے ہی فیض سے بہزاد بنا رب کریم

بہزاد صاحب کا ایک اور مجموعہ "وجد و حال" جس میں پاکستان منتقل ہونے کے بعد کا کلام ہے، اس مجموعہ میں ایک حمد اور ایک نعت کے علاوہ باقی غزل کے اشعار ہیں۔ جو تصوف کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس مجموعہ کی حمد میں بھی گزشتہ مضامین کا انداز ہے۔ جو شاعر کے ذہن و دماغ اور قلب و احساس میں پہلے سے موجود ہیں۔ حق تعالیٰ سبحانہ کی اس کارزار حیات کا مالک حقیقی اور معبود حقیقی سمجھتے ہیں لیکن جذبہ عشق کا رنگ تیز ہے، عبدیت اور رضاجوئی کا احساس غالب ہے۔ پہلا شعر ہے۔

ہے تو ہی اَلم ہے تو ہی خوشی، تری شان جلّ جلالہٗ
تو ہی موت ہے تو ہی زندگی تری شان جلّ جلالہٗ

دوسرا شعر ولکن اللہ یفعل ما یرید کی تعبیر ہے۔

تجھے چاہے ہوش میں لادے تو، جسے چاہے مست پھرائے تو
تو ہی ہوش دے تو ہی بے خودی تری شان جلّ جلالہٗ

تیسرا اور چوتھا شعر وحدۃ الوجود کے فکر کا ترجمان ہے۔

تو ہی دیر و بیت صنم میں بھی تو ہی مت کدے میں حرم میں بھی
ہے ترا ہی ذکر گلی گلی، تری شان جل جلالہٗ

تو ہی رنگ برگ شجر میں ہے تو ہی غنچہ و گل تر میں ہے
یہی کہہ رہی ہے کلی کلی، تری شان جل جلالہٗ

باقی دو شعر میں وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء و یقیموا الصلوٰۃ ویؤتوا الزکوٰۃ و ذلک دین القیمۃ کے معانی کی طرف اشارہ ہے۔

ترا ذکر ہی تو نماز ہے تری یاد ہی تو نیاز ہے
بڑی سہل ہے تری بندگی، تری شان جل جلالہٗ

ترے فضل نے یہ پتا دیا، ترے لطف نے یہ بتا دیا
مری بے بسی نہیں بے بسی، تری شان جل جلالہٗ

آخری شعر رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کا خلاصہ ہے۔

مجھے اپنے رنگ پہ ناز ہے، مری زیست صرف نیاز ہے
جو تری خوشی وہ مری خوشی، تری شان جل جلالہٗ

بہزاد نے گیت بھی لکھے ہیں، ان کے گیتوں میں بھی ایمان و یقین کی باتیں ہیں۔ نغمات بہزاد جو گیتوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں ایک حمد اور کئی نعتیں ہیں، ان کے گیت جو سلاست و روانی، الفاظ کی بندش اور مدہم موسیقیت کی وجہ سے نہایت دلآویز و دلکش ہیں چھوٹی بحروں، آسان اور سادہ الفاظ میں اظہار خیال نہایت مؤثر ہیں، وہ گیت جو حمد پر مشتمل ہے معنوی اعتبار سے الحمدللہ رب العلمین اور ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔ اور لہ مافی السموٰت والارض کی تعبیر ہے۔

حمد

تو ہے جگ کا پالن ہار

سن لے جیون کی پکار جیون نیا ہے منجدھار
جیون نیا کر دے پار ۔ تو ہے جگ کا پالن ہار
مشکل کیا تیں پہچان تیرے عالم تیرے جہان
تیرے ہیں یہ سب سنسار تو ہے جگ کا پالن ہار
تجھ سے یہ تیرا بہزاد کرتا ہے رو کر فریاد

سن لے تو اس کی بھی پکار   تو ہے جگ کا پالن ہار

حمد کا موضوع دوسرے اصنافِ سخن سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے فکر و خیال اور لب و لہجہ کو برتنے کا جس قدر پاس و لحاظ اس صنفِ شاعری میں کرنا پڑتا ہے' دوسرے اصناف میں اس اجتہاد کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی ہے' حمد کا موضوع ذاتِ باری تعالیٰ کے اوصاف' انسان اور اس کے معبود حقیقی کے درمیان تعلق الٰہ و معبود کا ہوتا ہے اور اس کا تعلق عقیدۂ توحید اور اس کے حدود سے ہے یہ شاعر کا کلام اس کسوٹی پر کھرا اترتا ہے تو یقیناوہ شاعری قابل تعریف ہے۔

بہزاد صاحب کی ہر ایک حمد مختصر ہے' لیکن ان میں عقیدۂ توحید کی بھر پور عکاسی ہے' اور احتیاط واعتدال کا دامن کہیں چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ تقدیس کا پہلو موجود ہے۔ عظمت و جلالت اور شفقت و محبت اللہ تعالیٰ کے دو بنیادی اوصاف ہیں' اس کی بھی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ان کی حمد سے ایمان کو تازگی' اور روح کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے' اور اس صنفِ شاعری کی دلکشی و دلآویزی کا سبب یہی خوبی ہے۔ بہزاد صاحب کی حمد میں موضوع کا تنوع' فکر و خیال کی وسعت زیادہ نہیں ہے۔ موضوع و معانی کے اعتبار سے تمام حمدؤں میں یکسانیت ہے۔

بہزاد صاحب نے حمد میں اظہار خیال کے لئے نہایت آسان اور سادہ اسلوب اختیار کیا ہے۔ ثقیل اور دقیق الفاظ کے استعمال سے گریز کیا ہے۔ یہ ان کی شاعری کی خاص خوبی ہے۔ بقول انور سمسوانی ان کے کلام میں "لکھنؤ کی نازک اور پاکیزہ زبان کی چاشنی' حلاوت اور جذبات کی ترجمانی ایک نرالے اور اچھوتے انداز سے پائی جاتی ہے۔"(۱)

---

(۱) بہزاد لکھنوی ' نقش بہزاد' ص ۸

پروفیسر حفیظ تائب

حافظ لدھیانوی کی حمدیہ شاعری

حمد ذکر الٰہی کی فنی صورت ہے اور قرآن مجید کی سورہ (الشعرآء) میں جہاں ایمان لانے والے اور اچھے کام کرنے والے شعراء کا ذکر ہے وہاں ان کی شناخت یہ بھی بیان فرمائی گئی ہے وذکروا اللہ کثیرا (پارہ ۱۹' سورہ الشعراء' آیت ۲۲۷) کہ انہوں نے بکثرت اللہ کی یاد کی۔

ترمذی کی ایک حدیث میں جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر الٰہی کے حلقوں کو جنت کے باغات فرمایا ہے۔ ترمذی ہی میں حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت درج ہے "ایک شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اخیر کے تو بیشمار دروازے ہیں اور میں ان سب پر عمل کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا لہٰذا مجھے کوئی ایک بات بتایئے جو میں حرز جاں بنالوں لیکن اتنی لمبی بات نہ ہو جو میں یاد نہ رکھ سکوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ذکر الٰہی میں ہمیشہ تر زبان رہو۔

حمد و تسبیح میں اپنے فکر کا اضافہ کرنے کی حضور علیہ السلام نے بطور خاص تحسین فرمائی' چنانچہ مسلم ترمذی اور نسائی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت یوں مذکور ہے۔

"ہم لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز ادا کر رہے تھے کہ جماعت کے ایک شخص نے تکبیر یوں ادا کی (ترجمہ) اللہ کبریائی میں سب سے بڑھ کر ہے اللہ کے لیے بیشمار حمد ہے' ہم اللہ کی تسبیح اس کی حمد کے ساتھ صبح و شام کرتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے (بعد از نماز) پوچھا کہ یہ کلمے کس نے کہے ہیں؟ جماعت میں سے ایک شخص نے عرض کیا کہ میں نے یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! حضور علیہ السلام نے فرمایا مجھے ان سے مسرت آمیز تعجب ہوا ہے کیونکہ ان کلمات کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے یہ فرماتے سنا میں نے ان کلمات کو کبھی ترک نہیں کیا۔"

دوسری طرف سید عالم ﷺ نے حمد و ثنا کے موضوع کے بارے میں فرمایا

لااحصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک (میں تیری حمد و ثناء کا احاطہ نہیں کر

سکتا' تو وہی ہے جس طرح تو خود اپنی ذات کی ثنا کرے)

چنانچہ حمد باری تعالیٰ کے باب میں کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنا نہایت ضروری ہے جو حمد و ثنا کے مضامین سے معمور ہے۔ احادیث کے سفینوں میں بھی حمد الٰہی بکثرت ملتی ہے اس لیے قرآن و حدیث ہی حمد کے سب سے معتبر ماٰخذ ہیں۔

جناب حافظ لدھیانوی نے اپنے پہلے حمدیہ مجموعۂ کلام "ذوالجلال والاکرام" کا نام سورۂ "رحمٰن" کی آیۂ مبارکہ سے لیا ہے اور سورۂ رحمٰن کو حمد کی معراج کہا جا سکتا ہے جو بقول حضرت علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ آہنگ میں بھی یکتا ہے' دوسرے اور تیسرے حمدیہ دواوین کے نام ایک حدیث مبارکہ سے اخذ کیے ہیں جس کا متن یوں ہے:

كلمتان خفيفتان على اللسان حبيبتان على الرحمن ثقيلتان فى الميزان

"دو کلمے ہیں زبان پر نہایت آسان ہیں' رحمٰن کو بہت محبوب ہیں' میزان میں بہت بھاری ہیں۔"

دو کلمے ہیں سبحان اللّٰہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم

گویا حافظ لدھیانوی صاحب نے قرآن و حدیث سے اپنی حمدیہ شاعری کی بنیادیں اٹھائی ہیں وہ حمد کو ذکر الٰہی کی سطح پر لے گئے ہیں اور وہ اس میں کچھ اس طرح ڈوبے ہیں کہ ان کا نفس نفس اور لفظ لفظ ذکر بن گیا ہے وہ خود بھی حمد میں اپنے ممدوح کے اسم ذاتی کی تسبیح کرتے نظر آتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیتے ہیں:

ہر منظر میں نور ہے تیرا' سارا نور ظہور ہے تیرا
تجھ سے روشن شام سویرا اللہ اللہ' اللہ اللہ

اک پل بھی غافل نہ رہو تم یاد سے اپنے خالق کی
روح میں اس کا نام اتارو اللہ اللہ کیا کرو

اس کا ذکر ہی وجہ سکوں ہے اس کے نام میں لذت ہے
اپنے سارے کام سنوارو اللہ اللہ کیا کرو

ان اشعار کو پڑھتے ہوئے دھیان ان آیات کریمہ کی طرف جاتا ہے:

الا بذكر الله تطمئن القلوب (۲۸ ۱۳)

خبر دار رہو اللہ کا ذکر ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔

واذكروا الله كثير لعلكم تفلحون (۱۰ ۴۵)

"اور یاد کرو اللہ کو بہت تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔"

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیجا تو بوقت رخصت انہیں تاکید فرمائی:

اذهب انت و اخوك بايتي ولا تنيا في ذكري (۱۶: ۴۲)

"(جاتو اور تیرا بھائی فرعون کے پاس) میری نشانیاں لے کر اور (دیکھنا) میری یاد میں سستی مت کرنا۔"

ذکر کے ساتھ ساتھ فکر کی ضرورت پر قرآن حکیم میں اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے کہ فکر کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

ترجمہ: "بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور گردش لیل و نہار میں ان ارباب دانش کے لیے نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ذکر الٰہی کرتے ہیں وہ آسمان اور زمین کی تخلیق میں فکر کرتے ہیں۔" (پارہ ۴ آیت ۱۹۱)

حضرت حافظ لدھیانوی پر ذکر و فکر کی اہمیت منکشف ہے اسی لیے وہ ذکر سے اپنے فکر کو جلا دیتے ہیں اور یوں مرشد رومیؒ اور حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے مقلد بنتے ہیں۔

ذکر آرد فکر را در اہتزاز ذکر را خورشید ایں افسردہ ساز (رومی)

فتیر قرآں اختلاط ذکر و فکر فکر را کامل ندیدم جز بہ ذکر (اقبال)

حافظ لدھیانوی صاحب کتاب کائنات پر بہت گہری نظر ڈالتے ہیں اور اس میں ذات واجب کی گوناگوں صفات کی جلوہ گری کو محسوس کرتے ہیں۔ مشاہدۂ فطرت میں وہ دیدۂ باطن کو بھی شریک کر لیتے ہیں اور یہ مرحلہ ان کے سینے کے اندر موجزن قرآنی نور کی بدولت نہایت سہولت سے طے ہوتا چلا جاتا ہے ان کی حمدوں میں خالق کائنات کی ظاہری قدرتوں کے تذکرے کے ساتھ ساتھ باطنی کیفیات کا اظہار بھی ملتا ہے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور انعاموں کے ذکر سے حمد کو خوب آراستہ پیراستہ کرتے ہیں۔ یہاں ان کا معجزانہ اسلوب حمد کو ادب عالیہ کے درجہ پر فائز کر دیتا ہے۔ صرف چند مثالیں دیکھتے چلیے۔

کوئی نہ کر سکا اندازہ اس کی وسعت کا کوئی نہ جان سکا وشت جاں کی پنہائی
کمال حسن کا منظر ہے تیری ہر تخلیق تری ثناء نے سجائی ہے دل کی تنہائی
ہر ایک منظر شاداب ہے ترا شہکار ہر ایک شے میں ہے تیری ہی نقش آرائی

تو نے شب تاریک سے کی صبح نمودار تیرے شفق شام میں ہوتے ہیں اشارے

ہیں گرم سفر حلقہ منزل میں شب و روز
پابند ترے حکم کے ہیں چاند ستارے
گلشن گلشن صحرا صحرا تو نے رنگ بکھیرے ہیں
تجھ سے سطح فلک پہ روشن چاند ستارے تیرے ہیں

نظر آتی ہے ہر منظر میں تیری جلوہ آرائی
ہویدا ہے جہان رنگ و بو میں تیری یکتائی

شان ہر روز ہے نئی تیری
حیرتی ہے ہر اک نشاں تیرا

جناب حافظ لدھیانوی کے ایسے اشعار پڑھتے ہوئے میرؔ، دردؔ، غالبؔ، اصغرؔ، فانیؔ اور اکبر کے وہ اشعار یاد آتے ہیں جن میں انھوں نے ذات واجب کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ اکابر کے چند اشعار دیکھیے۔

گل و رنگ و بہار پردے ہیں
ہر عیاں میں نہاں ہے وہ ٹک سوچ
(میرؔ)

جمع میں افرادِ عالم ایک ہیں
گل کے سب اوراق برہم ایک ہیں
(دردؔ)

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
(غالبؔ)

کثرت میں دیکھتا جا تکرار حسن وحدت
مجبور یک نظر آ مختار صد نظر جا
(فانیؔ)

حافظ لدھیانوی کے معاصرین میں سے اگر ان کا رنگ کسی سے کسی حد تک مماثل ہے تو صرف باقی صدیقی ہیں ان کی حمد کے دو شعر پیش کر رہا ہوں۔

ایک تیرے ظہور کا انداز
یہ زمانہ یہ کارواں کیا ہے
نقش ہے ایک تیری قدرت کا
اور یہ رنگ گلستاں کیا ہے

حافظ لدھیانوی صاحب کتاب فطرت اور آئینہ باطن ہی پر نظر نہیں رکھتے وہ معاشرے کی اونچ نیچ اور افراد کے دکھ درد کو بھی محسوس کرتے ہیں۔ ذاتی اور کائناتی دکھوں کے گہرے احساس اور عصری شعور نے حمد میں رنگ مناجات پیدا کر دیا ہے جس میں درد ملت خاص طور پر نمایاں ہے۔ یہاں میں بھی شکایت کی جائے تشکر کا پہلو نمایاں ہیں۔

تیرا در ہی وجہ سکوں ہے، تو سب کا رکھوالا ہے
ہم دکھیارے، ہم بچارے، غم کے مارے تیرے ہیں

تیرا لطف نہ ہو جو شاملِ سانس بھی لینا مشکل ہے
سارے کام بنائے تو نے سارے سہارے تیرے ہیں

کب سے اسیرِ رنج و محن ہے مری حیات زندانِ غم سے اے مرے مولا رہائی دے

دے حلقۂ ذلت سے رہائی مرے مولا دنیا کے مسلمان ہیں زندانیٔ حالات

ذاتی طور پر غمِ دنیا کے مقابلے میں انہیں غمِ عقبیٰ زیادہ رہتا ہے اور وہ جابجا آخرت کی بھلائی مانگتے نظر آتے ہیں۔

مجھ کو ہر لحظہ رہے منزلِ عقبیٰ کا خیال ہر عمل کی ترے احکام پہ بنیاد رہے

میرے ہر اک گناہ پہ آقا میری محشر میں پردہ داری ہو

کامیابی ہو مقدر میں مرے راہِ حق میں جو شہادت ہو جائے

مجھ کو حاصل رہے رضا تیری ہو میسر مجھے بقائے دوام

ان کی نعت کا بڑا موضوع "شوقِ حضوری" حمد میں بیت اللہ کی زیارت کی تڑپ بن کر سامنے آتی ہے۔

پھر ترے گھر کی زیارت ہو جائے مجھ کو حاصل یہ سعادت ہو جائے
گر میسر ہو حضوری کا شرف شاد افسردہ طبیعت ہو جائے

دورِ جدید کی غزل میں جس تسلسل پر زور دیا جاتا ہے وہ حافظ صاحب کی حمدیہ غزلوں میں کچھ اس بیساختگی سے در آیا ہے کہ ان کی حمد کا امتیاز بن گیا ہے۔ ثبوت کے طور پر پوری کتاب قارئین کے سامنے ہے۔
جناب حافظ لدھیانوی کی حمد میں ہر رنگ، ہر ذائقہ اور حسن موجود ہے ان کے ہاں شعرائے متقدمین کی عظیم روایات، دورِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر سامنے آئی ہیں تو نئی روایت کی تشکیل ہوئی ہے۔ جس میں غزل کی کیفیت بھی ہے اور نظم کا تسلسل بھی۔ حافظ صاحب کا اپنا دلنشیں درد آمیز اسلوب ہر کہیں نمایاں ہے انہوں نے قرآن واحادیث کے استفادے سے حمد کو معتبر بنایا ہے اس کے صدقے شعر لطافتوں کے آئینے بنتے چلے گئے ہیں۔ کمیت کی زیادتی کیفیت کی کمی کا موجب کہیں نہیں بنی اس لیے پورے اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ حافظ لدھیانوی صاحب کا یہ حمدیہ مجموعہ ان کے اپنے فن کو بھی آگے بڑھا رہا ہے اور اس سے اردو کی حمدیہ شاعری میں ایسا رفیع و وقیع اضافہ ہوا ہے جس کی مثال مشکل سے ہی پیدا ہوگی۔

مظفر وارثی کا حمدیہ آہنگ

حمدیہ شاعری کا قدیم دور بیانیہ شاعری کا دور تھا جس میں رب ذوالجلال والاکرام کی حمد و ثناء کو مظاہر کائنات کی روشنی میں منظوم کر دیا جاتا تھا یا عجز بیان کا تاثر ابھارا جاتا تھا۔ تصوف کی روایت سے منسلک شاعری میں البتہ دروں بینی کی روش عام تھی جس میں بندے کا تعلق مع اللہ کا احساس جلوہ گر ہوتا تھا۔ پھر بھی تمام متصوفانہ شاعری کو حمد کا نام دینا ذرا مشکل ہوتا تھا۔ اللہ رب العزت کی تعریف ویسے بھی انسان کے بس کی بات نہیں ہے اس لئے بیشتر شعراء تو حیرت و استعجاب میں ڈوب ڈوب جاتے تھے۔ مثلاً خسرؔو نے کہا۔

ما ایم و تحیر و خموشی و آفاق ہمہ بگفتگویت

(ہم تو حیرت و استعجاب کے زیر اثر خاموش ہیں جبکہ تمام کائنات تیری ہی گفتگو (یا تذکرہ) کر رہی ہے۔)

اردو میں ایسی شاعری جس میں شاعرانہ اپیل بھی ہو' ادبی اسلوب بھی ہو اور تفہیم یا ابلاغ کے زاویے سے سہل بھی ہو بہت کم ہوئی تھی۔ مروج شعری رویوں اور عصری تقاضوں سے ہم رنگ شاعری تو حمدیہ شعری کاوشوں میں خال خال ہی ہو سکی تھی۔

مظفر وارثی کا حمدیہ شعری مجموعہ "الحمد" بہر حال ایسی شاعری پر مشتمل ہے جس میں بیشتر حمدیہ شاعری' جدید لب و لہجے' منفرد آہنگ اور متنوع خیالات کی وجہ سے مافیہ و اسلوب (Content and Style) دونوں اعتبارات سے قابل قدر اور لائق توجہ ہے۔

مظفر وارثی کی شاعری میں مترنم بحروں' صوتی مناسبتوں' لفظیاتی نغمگی کے التزام اور معنوی بوقلمونی سے ایک صحیفہ عقیدت بھی وجود میں آیا ہے اور رنگا رنگ فنی نگار خانہ بھی۔ مظفر کے ہاں عظمت رب کائنات کا ادراک' حمد و ثناء' شکر و سپاس' تعلق مع اللہ' احساس عجز کا سمک وژن اور متصوفانہ تفہیم توحید کے مختلف رنگوں کے ساتھ ظاہر ہو کر ایک طیف (Spectrum) بنا رہا ہے۔

حمدیہ شاعری اس لئے مشکل ہوتی ہے کہ شاعر کے سامنے صرف مظاہر کائنات اور دین کی عطا کردہ معلومات تو ہوتی ہیں لیکن محبوب حقیقی کا سراپا نہیں ہوتا۔ سراپا ہو بھی کیونکر کہ اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات تشبیہہ سے پاک ہے۔ اگر کوئی سراپا تصور کی گرفت میں آجائے تو وہ تشبیہہ کی صورت میں ہوگا جو بندے کا خالق نہیں بلکہ اس کی مخلوق ہوگا جو تصور تنزیہہ کے سراسر منافی بھی ہے اور شرک تشبیہہ سے

آلودہ بھی۔ مظفر وارثی خالق ہستی کے ادراک سے اس طرح اظہار عجز کرتے ہیں

مقام اس کا شعور و مثال سے بھی پرے
وہ ہے رسائی لفظ و خیال سے بھی پرے

شاعر کا اپنا ایک ذہنی کلچر ہوتا ہے جس کے سہارے وہ اپنے لاشعور میں پوشیدہ تہذیبی اور ثقافتی سرمائے کی روشنی میں صوت و صدا اور حرف و نوا کی زبان میں تمثال آفرینی سے مجرد (Abstract) خیال کو تجسیمی (Concrete) شکل دے دیتا ہے جس سے بیان میں خوبصورتی اور ابلاغ میں سہولت ہو جاتی ہے۔ تمثال آفرینی (Imagery) کا یہ عمل مجرد خیالات کو شعری پیکر میں تشکیل کر دیتا ہے۔ مظفر وارثی حمد کہہ رہے ہیں تو ان کے تحت الشعور سے مسجد کی تمثال شعور میں آئی اور ایک خوبصورت امیج بنا گئی ،

مسجد الفاظ میں بھی دے رہا ہوں میں اذاں
میرا فن، میرا ہنر، میرا ادب تیرے لیے

مظفر وارثی کی شاعری میں ایک کاسمک وژن (Cosmic Vision) بھی ملتا ہے۔ یہ کاسمک وژن سائنسی کاسمک سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ سائنس داں اور شاعر کا فرق یہی ہے کہ سائنس داں کائنات کا وجود، مادے کی جزئیات کے ساتھ دائرہ تحقیق میں لاتا ہے اور کائنات میں کارفرما مختلف قوانین کو سمجھتا ہے لیکن مادی کائنات کو مابعد الطبیعاتی پیمانوں سے نہیں دیکھتا جبکہ شاعر کائنات کی تمام جزئیات کو احساسات کی سطح پر دریافت کر کے اس میں مابعد الطبیعاتی عنصر شامل کرتا ہے اور کائنات کے ذرے ذرے کو زبان دے دیتا ہے۔ مظفر وارثی کی امیجری اور ان کے کاسمک وژن کی صباحت درج ذیل شعری نمونوں میں ملاحظہ فرمائیے۔

دنیائے رنگیں کی دلہن
جاتے لمحوں کی ڈولی میں
شبنم کی ابرق پھولوں پر
موتی دریا کی جھولی میں

یہ کس کی مینا کاری ہے!
کون ایسی خوبیوں والا ہے؟

ہمدو! اللہ تعالیٰ ہے

زمین تیرہ کے منہ سے لگا دیا تو نے مہ و نجوم بھرا آسمان کا پیالہ

مظفر وارثی کا کاسمک وژن ان کو مظاہر کائنات کا اس طرح مشاہدہ کرواتا ہے کہ ہر نفس رب

ذوالجلال کی قدرت و عظمت کا اثبات ہونے لگتا ہے۔

کوئی مقصود نہیں تیرے سوا

خوشبوئیں روشنیاں رنگ ہوا

خامشی قہقہے الفاظ نوا

چاندنی دھوپ ستارے شبنم

زندگی حسن نظارے موسم

فانی چیزوں کی طلب فانی ہے

اک تری ذات ہے برحق مولا

تو ہے بس عشق کے لائق مولا

کوئی مقصود نہیں تیرے سوا

..... یا .....

یہ بستیاں یہ صحرا یہ کوہ یہ سمندر

رنگوں کا یہ تبسم ہریالیوں کے اندر

فطرت کے ہیں نمونے

کیا کیا بنائے تو نے

نقش و نگار عالم

پروردگار عالم

ہر سحر پھوٹتی ہے نئے رنگ سے

سبزہ و گل کھلیں سینہ سنگ سے

گونجتا ہے جہاں تیرے آہنگ سے

جس نے کی جستجو مل گیا اس کو تو

سب کا تو رہ نما اے خدا اے خدا

رنگ خوشبو روشنی صحرا سمندر کوہسار

لالہ و گل ماہ و انجم برق و باراں برگ و بار

تیری صناعی کے شاہد تیری قدرت کے امین

یا شفیق یا رفیق و نحن من کل یقین

گل میں خوشبو تری سورج میں اجالا تیرا　　　پائے ہر شے میں تجھے ڈھونڈنے والا تیرا

ذہن و دل سے اک پردہ سا ہٹتا جائے　　　اوراق روز و شب وقت پلٹتا جائے

پڑھتا جاؤں قدرت کا رنگین مجلّہ

اللہ ہی اللہ

ہے بس یارو

اللہ ہی اللہ

دنیا اک شہکار ہے مولا کی ندرت کا

کرتے ہیں اعلان سبھی اس کی قدرت کا

مٹی پانی آگ ہوا پھل میوے غلہ

اللہ ہی اللہ

ہے بس یارو

اللہ ہی اللہ

درج بالا شعری مثالیں ایک طرف تو کاسمک وژن کی شاعرانہ تمثال نگاری کی اچھی مثالیں ہیں دوسری طرف صوتی حسن اور حروف کی منبت کاری کا نمونہ بھی ہیں۔ منبت کاری پر مجھے میرزا مظہر جان جاناں بے ساختہ یاد آگئے۔ فرماتے ہیں؀

از دخل گرچہ کاستہ اجزائے تن مرا

بالید ہمچو نقش منبت سخن مرا

مظفر وارثی چونکہ ایک سلسلہ تصوف سے منسلک ہیں۔ اس لئے خاصی حد تک وحدت الوجودی فکر ان کے نگار خانہ شعر میں منعکس ہو رہی ہے۔ اللہ رب العزت کی ذات کائنات کی تخلیق اور ذی روح مخلوقات کی پیدائش سے بھی قبل موجود تھی اور ان کی ذات میں کلیت کے تمام سامان موجود تھے۔ وجودِ آدم و کائنات اللہ رب العزت کی ذات سے باہر نہ قبل از ظہور تھا نہ بعد از ظہور ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کل کو محیط تھی، ہے اور رہے گی اور ان کی ذات میں کوئی خلاء نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی ذات میں خلا تسلیم کر لیا جائے تو تصور رب ناقص ٹھہرتا ہے۔ کائنات تمام مخلوقات کے ساتھ 'اپنا وجود پانے (یا ظاہر کرنے) سے قبل بھی اللہ تعالیٰ کی ذات کا حصہ تھی اور ظاہر ہو کر بھی اسی کی ذات میں سمائی ہوئی ہے۔ اگر یہ تصور کیا جائے کہ کائنات کو مکان (Space) فراہم کرنے کے لئے اللہ رب العزت نے کوئی خلاء پیدا کیا

اور پھر اس کائنات کو وہاں رکھ دیا تو یہ بات بھی تسلیم کرنے پڑے گی کہ نعوذباللہ یہ کائنات اپنے خالق کے احاطہ قدرت سے باہر آگئی۔ یہ تصور خالق کائنات کا ناقص تصور ہے۔ امر کن سے تو اللہ رب العزت نے ان صورتوں یا اشیاء کو جو ان کے علم میں تھیں (اعیان ثابتہ یا صور علمیہ) حکم اظہار تشخص دیا تھا۔ اپنے اپنے وجود کے ساتھ ظاہر ہونے کا اشارہ فرمایا تھا۔ ان حقائق کی روشنی میں ذرا درج ذیل شعری حوالے ملاحظہ فرمایئے۔

ملک عدم موجود ہے اس میں
ہر اک حد محدود ہے اس میں

یہ کثرت یکتا کے لیے ہے

ہر اول سے پہلے ہر آخر کے بعد   جتنا ظاہر ہے اتنا پوشیدہ ہے

ماورائے عدم و ہست ہے ہستی تیری   بے نشانی میں بھی تیرا ہی نشاں دیکھا ہے
اے خدا اور بھی پختہ ہوا ایماں میرا   نگہ غور سے جب سوئے جہاں دیکھا ہے

دیتا ہے اپنے عشق کی توفیق بھی وہی   گم ہیں جو اس کی ذات میں مظہر اسی کے ہیں

اللہ تعالیٰ کے محیط کل ہونے کا یقین مظفر وارثی کے اشعار میں جگہ جگہ جلوہ نما ہے۔

نہ میں نکل سکوں تری حدود سے نہ کر سکوں جدا عدم وجود سے
ہر ایک شے ہے جب فنا کی منتظر میں عرصہ بقا کہاں سے لاؤں گا

کائنات کے آئینے میں اللہ رب العزت کی ذات منعکس ہے لیکن مظاہر کائنات کی کثافت ہی آئینے میں نظر آرہی ہے۔ جوہر آئینہ کو عام زندگی میں بھی نہیں دیکھا جاتا ہے۔ محض آئینے میں نظر آنے والی اشیاء اور صورتیں ہی دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس نکتے کو مظفر وارثی نے کس خوبی سے شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔

کون مظفر دیکھ سکا آئینے کو   جو کچھ آئینے میں ہے وہ دیکھا ہے

علامہ رزی جے پوری مرحوم نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ شیخ اکبر محی الدین عربی نے عدد کی تعریف یہ کی ہے کہ "عدد اپنے طرفین کے مجموعے کا نصف ہوتا ہے۔" مثلاً ایک اور تین کا مجموعہ چار ہوا اور دو ان کے درمیان آیا چنانچہ ایک اور تین کے مجموعے کا نصف دو ہو گیا۔ اس طرح دو "عدد" ہے۔ میں نے عرض کیا جناب اس تعریف کی رو سے تو "ایک" عدد کے ذیل میں آتا ہی نہیں۔ فرمایا یہی نکتہ تو سمجھانا مقصود تھا کہ "ایک" عدد نہیں ہے لیکن تمام اعداد میں شامل ہے۔ وحدت الوجودی فکر کے صوفیاء اس نکتے کو

اپنے مسلک کی تشریح کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ اس پس منظر میں ذرا درج ذیل شعر ملاحظہ فرمایئے۔

خدا ہے ایک مگر ایک کی بھی حد میں نہیں اکائی اس کی کسی زمرہ عدد میں نہیں

مظاہر کائنات کا مشاہدہ کر کے توحید کا اثبات کرنے اور کو سمک وژن کے سارے شعر کہنے کی اہمیت اور جمالیات اپنی جگہ لیکن اس قسم کی شاعری میں شاعر کی ذات کا تداخل اتنا نہیں ہوتا جتنا اس شاعری میں ہوتا ہے جو شاعر اپنی ذات کے عرفان کے ساتھ کرتا ہے۔ شاعر جب اپنی ذات کے تناظر میں رب کائنات کی عظمتیں سمجھنا چاہتا ہے تو شعر میں اس کے شدید احساسات کا برجستہ اظہار (بقول ورڈز ورتھ (Spontaneous overflow of powrful feelings ممکن ہوتا ہے۔ مثلاً مظفر وارثی کہتے ہیں۔

اس برف سی جاں کو بھی پگھلتے ہوئے دیکھوں دریوزہ گر شعلہ دیدار ہوں مولا

ہر ایک سانس سے آواز آرہی ہے تری مرا دھڑکتا ہوا دل پیام تیرا ہے

رات کے پچھلے پہر جب بھی کروں یاد تجھے اپنی تنہائیوں کو روشنی کرتے دیکھوں

کیسے ہو سکتا ہے مجھ سے منحرف اک سانس بھی وقف میں نے کر دیا ہے خود کو جب تیرے لیے

شاعر کو جب رب کائنات کی عظمتوں کا ادراک ہوتا ہے اور خود اپنی ذات پر اللہ تعالیٰ کی عنایتوں اور بے کراں الطاف کا احساس ہوتا ہے تو اس کے لبوں پر شکر و سپاس کے کلمات آنے لگتے ہیں۔

جو ملے حیات خضر مجھے اور اسے میں صرف ثنا کروں
ترا شکر پھر بھی ادا نہ ہو ترا شکر کیسے ادا کروں
ترے لطف کی کوئی حد نہیں گنوں کس طرح کہ عدد نہیں
نہیں کوئی تیرے سوا مرا کسے یاد تیرے سوا کروں

کیوں بارگاہ حق میں نہ ہوں سربسجدہ ہم احسان جس قدر بھی ہیں ہم پر اسی کے ہیں

مظفر وارثی کی شاعری میں تلمیحات کا برجستہ استعمال ان کی روایت آگاہی کی دلیل بھی ہے اور شعری جمالیات سے ہم آہنگ ہنر مندی کی عکاس بھی مثلاً

اک سوت کی انٹی مرے سانسوں کا اثاثہ اور یوسف ہستی کا خریدار ہوں مولا

اسی طرح مظفر کے ہاں غزل کی بھرپور روایات جھلک رہی ہیں۔ غزل کا تیکھا پن محبوب سے براہ

راست یابالواسطہ نسیم صبح کے لہجے میں تخاطب 'ایمائیت' احساس کی نرمی 'لفظوں کی صباحت' تراکیب کی برجستگی 'قوافی کا برمحل استعمال' جذبات کی شدت اور لفظیات کی طرفگی 'مظفر وارثی کی حمدیہ غزلوں میں نمایاں ہیں۔

یہ آب و گل یہ خلق یہ منظر اسی کے ہیں — اس کی جسے طلب ہے مقدر اسی کے ہیں
دیتا ہے اپنے عشق کی توفیق بھی وہی — گم ہیں جو اس کی ذات میں منظر اسی کے ہیں

چشم ظہور' تحت الشعور ہو نور نور تجھ سے — تیرا انصاب' حکمت مآب' رحمت صفات تیری
لیل و نہار پت جھڑ بہار سجدہ گزار تیرے — یہ رنگ روپ یہ تیز دھوپ یہ چاند رات تیری

ٹانکے سے لگاتا ہے ترے عفو کا ریشم — ہر دامن عصیاں کا رفو بول رہا ہے

مرے ایک دامن عمر میں ہیں نہ جانے کتنی ندامتیں
مرا خاتمہ بھی بخیر ہو یہی رات دن میں دعا کروں

آج کی شعری لغت میں بہت معمولی اور بظاہر غیر شاعرانہ الفاظ اس قدر شعری قوت اور ہنت کی نفاست کے ساتھ استعمال ہو رہے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ مظفر وارثی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ اپنی شعری لغت کی ندرت حمد و نعت میں بھی ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً۔

سیاہی غم دل میں چمک کا طالب ہوں — ہر احتیاج میں اس کی کمک کا طالب ہوں

کمک کے قافیے کا تناظر ملاحظہ فرمائیے کس جہان سے کس جہان کی تخلیق میں یہ لفظ ممد ہوا ہے۔

سچائی وردی طاقت کی
نیکی پگڈنڈی جنت کی
سجدہ سیڑھی ہے رفعت کی
تقویٰ ہے پگڑی عظمت کی
دھن سے ہو کب اونچا بندہ
اے مالک میں تیرا بندہ

نظم کے اس بند میں "وردی" "پگڈنڈی" "سیڑھی" اور "پگڑی" جیسے الفاظ کا برجستہ استعمال اور پھر شاعرانہ کمال ملاحظہ فرمائیے کہ الفاظ اپنی انفرادی حیثیت سے جدا ہوئے بغیر معنوی سطح پر

مثبت کاری کے ہنر کی طرح ابھر ابھر کر سامنے آرہے ہیں۔

اچھوتے قوافی بنانا اور انہیں معنوی چکا چوند پیدا کرنا مظفر وارثی کے ہنر کا خاصہ ہے۔

تاریخ بھی میری نہیں پہچانتی مجھ کو — کیسا میں یہ جغرافیہ بردار ہوں مولا

جغرافیہ بردار کی ترکیب میرے خیال میں حمدیہ شاعری میں صرف مظفر نے استعمال کی ہے۔ اس شعر میں بردار قافیہ ہے۔ جغرافیہ کے ساتھ بردار کا قافیہ ایسے آیا ہے جیسے کسی نے گلوب سر پر اٹھا رکھا ہو۔ شعر میں تاریخ اور جغرافیہ کے الفاظ ایک ساتھ آنے سے جو لفظی اور معنوی مناسبت پیدا ہوئی ہے اس کا احساس تو شعر کی قرات (Reading) ہی سے ہو جاتا ہے لیکن قافیہ پیمائی کی ندرت کے ساتھ دیکھئے معنوی حوالے سے شعر کس قدر بلیغ اور وسیع المفہوم ہو گیا ہے۔ اس وقت کرہ ارض پر مسلمانوں کی تعداد ایک ارب سے متجاوز ہے اور یہ مسلمان کئی چھوٹے بڑے ملکوں میں بستے ہیں۔ یہی ہے وہ جغرافیائی حقیقت جسے مظفر نے شعری لینڈ اسکیپ کے لیے منتخب کیا ہے۔ مسلمانوں کے جغرافیائی نقشے میں کتر بیونت بھی ہوتی رہتی ہے اور اس جغرافیہ کو دیگر اقوام عالم کی طرف سے ہمیشہ خطرات بھی لاحق رہتے ہیں۔ یہ خطرات اس لیے زیادہ گمبھیر ہوتے جا رہے ہیں کہ مسلمان اپنی تاریخ (روایات' عظمت رفتہ' ماضی کی سی ایمانی قوت اور تاریخ میں نظر آنے والا جذبہ جہاد وغیرہ) سے اتنے مختلف ہیں کہ تاریخ کے آئینے میں دیکھا جائے تو مسلمان' مسلمان لگتے ہی نہیں۔

اس طرح ایک شعر کے کینوس میں قافیے کی ندرت' تاریخی تناظر کی وسعت' حال کی شکایت اور ماضی کی شوکت سب ہی کچھ تو آ گیا ہے۔ عصری آشوب کی جھلک میں طنز کی شرکت نے ایک الگ فضا پیدا کر دی ہے۔ اس طرح حمد ہی میں ملی درد کی شمولیت نے عصر حاضر کے مسلمانوں کو آئینہ تاریخ کے روبرو لا کھڑا کیا۔ امت کو آئینہ تاریخ کے روبرو کھڑا کرنے کا عمل مظفر کے ہاں جا بجا نظر آتا ہے۔ مثلاً

تیغ و تبر و خود و زرہ تھے مرا زیور
اب بشیفتہ جبہ و دستار ہوں مولا

پھر سے مرے اسلاف کی جانب مجھے لے چل
میں لمحہ آئندہ کو درکار ہوں مولا

تشکیک کا مرض اور لاادریت کا سرطان دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ الحاد کا عفریت پہلے بھی تھا لیکن آج کی دنیا میں اس الحاد نے مختلف صورتیں اختیار کر رکھی ہیں۔ حمد گزاری کے عمل میں آج کا شاعر ایسی مسموم فضاؤں کو بھی دھیان میں رکھتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی ہستی کا انکار کر کے نابکار انسان پکار اٹھتا ہے "پڑھ کلمہ لاالہ الاانسان" (نعوذباللہ) مظفر وارثی نے بھی تشکیک کے اژدر مارنے کے لیے دلائل کا عصا

دست سخن میں دے دیا ہے۔

کوئی تو ہے جو نظام ہستی چلا رہا ہے۔ وہی خدا ہے
دکھائی بھی جو نہ دے، نظر بھی جو آرہا ہے۔ وہی خدا ہے

وہی ہے مشرق وہی ہے مغرب سفر کریں سب اسی کی جانب
ہر آئنے میں جو عکس اپنا دکھا رہا ہے۔ وہی خدا ہے

نظر بھی رکھے سماعتیں بھی وہ جان لیتا ہے نیتیں بھی
جو خانہ لاشعور میں جگمگا رہا ہے۔ وہی خدا ہے

سفید اس کا سیاہ اس کا نفس نفس ہے گواہ اس کا
جو شعلہ جاں جلا رہا ہے، بجھا رہا ہے۔ وہی خدا ہے

قبضہ ہے جس کی چٹکی کا
شہ رگ پر ہم انسانوں کی
وہ جس کے آگے جھک جائے
پیشانی نافرمانوں کی

ہر منظر جس کا پرتو ہے
ہر اک تحریر حوالہ ہے
حمدو اللہ تعالیٰ ہے

مظفر کی شاعری میں لفظوں کی ہم آہنگ موسیقی (Symphony) کا تاثر شعری عمل میں Under-current کے طور پر داخل ہے۔ شاعر لفظوں کے داخلی آہنگ اور صوتی نغمگی سے جو ردھم (Rhthm) پیدا کر دیتا ہے وہ شعر اور موسیقی کے سنگم سے صوتی جمال کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ شعر میں معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اگر صوتی نغمگی بھی ہو تو شاعری کا درجہ بہت بلند ہو جاتا ہے (جبکہ حمد کا مقام تو اپنے موضوع (Content) کی وجہ سے ویسے ہی بلند ہوتا ہے) شاعری میں یہ حسن کوشش سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ "الحمد" کے شاعر کی شعری کاوشوں میں نغمگی کے انداز ملاحظہ ہوں۔
دریا، صحرا، سورج، چاند ستارے اس کے

منظر اور رتیں اس کی ہم سارے اس کے
اپنی پونجی اک پیشانی ایک مصلی

اللہ ہی اللہ
بے بس یارو
اللہ ہی اللہ

نور ہی نور بکھرا ہے کالک نہیں
دوسرا کوئی حد گماں تک نہیں
تیری وحدانیت میں کوئی شک نہیں
لاکھ ہوں صورتیں
ایک ہی رنگ میں
تو ہے جلوہ نما
اے خدا اے خدا

مہکار جدا آواز جدا
دھن اپنی اپنی ساز جدا
چہرے سے نہیں ملتا چہرہ
ہر پیکر کے انداز جدا
شہکار بنائے یہ جس نے
ہاں وہ فنکار نرالا ہے
ہدو اللہ تعالیٰ ہے

نہ صدف نہ ماہ منیر دے
مجھے روشنی ضمیر دے
مجھے پیار دے تو کثیر دے
میں ہوں نقطہ مجھ کو لکیر دے
ترے ہاتھ ہے مری آبرو
تری شان جل جلالہ

سینہ ہو مرا شیشے کی طرح
اور بینائی جھرنے کی طرح
آواز بھی ہو شعلے کی طرح
چمکوں میں سدا ہیرے کی طرح
مجھے لگنے نہ پائے زنگ خدا
مجھے اپنے رنگ میں رنگ خدا

قدم قدم تجھے صدا نہ دوں اگر تو کیسے طے کروں گا عمر کا سفر
جو دیدہ گماں سے دیکھتا رہا یقیں کا ذائقہ کہاں سے لاؤں گا

چراغ ذہن، ضیائے نگاہ، نور جبیں
جمال عشق، وقار خودی، اساس یقیں
متاع صبر و رضا لا الہ الا اللہ

کسی بھی شعری مجموعے میں ایسی نغمہ ریز شاعری کے نمونے اس بات کے ضامن ہو سکتے ہیں کہ شاعر کو لفظیاتی موسیقی اور داخلی آہنگ کا گہرا شعور ہے۔ اور یہ کہ شعر میں نغمگی پیدا کرنے کا یہ ملکہ اکتسابی نہیں وہبی ہے۔

مظفر وارثی کی حمدیہ شاعری میں ہنر مندی کے متنوع پہلو اور نغمہ پردازی کے بو قلموں انداز اس بات کے شاہد ہیں کہ مظفر کو مبدءِ فیاض سے شاعری کا جو ملکہ حاصل ہوا ہے وہ اس کو حمد رب ذوالجلال والاکرام کے لیے وقف کر کے جریدۂ عالم پر اپنے دوام کی مہر ثبت کر رہے ہیں۔

پروفیسر آفاق صدیقی

آفتاب کریمی کی حمدیہ شاعری

پاکستان ٹیلی ویژن سینٹر کے ایک ممتاز پروڈیوسر بھائی مرغوب احمد صدیقی ہیں جو زیادہ تر کلاسیکی موسیقی، حمدیہ و نعتیہ کلام اور قوالی کے پروگرام بڑے سلیقے سے پیش کرتے ہیں۔ ایک شام کو ہماری ملاقات ہوئی تو خوبصورت سی فائل میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے "یہ ہمارے دوست آفتاب کریمی کا حمدیہ و نعتیہ کلام ہے، تم پیش لفظ لکھ دو۔"

میں نے کہا "ابھی لکھتا ہوں ذرا دیکھوں تو انداز بیان کیا ہے اور......"

مرغوب بھائی کے فون کی گھنٹی بجی۔ میں خاموش ہو گیا اور تھوڑا سا وقت مل گیا کہ ورق گردانی کر کے کچھ اشعار کا انتخاب کر لوں لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ مغرب کی اذان ہونے والی تھی اس لئے طے ہوا کہ فائل میں اپنے ساتھ گھر لے جاؤں اور قدرے اطمینان سے متعلقہ حمدیہ و نعتیہ کلام کا مطالعہ کر کے کچھ لکھوں۔

آفتاب کریمی صاحب کا نام تو سنا تھا مگر دید و شنید سے محرومی کا احساس رہا۔ فائل پر جلی حروف میں کتاب کا نام "آنکھ بنی کشکول" لکھا ہوا تھا۔ مجھے یہ نام اتنا اچھا لگا کہ دیر تک اس کی لفظی و معنوی جمال آفرینی اور کیف پروری کے انبساط میں کھویا رہا پھر جستہ جستہ کلام سے بھی لطف اندوز ہوا مگر رہ رہ کر یہ خیال ضرور آیا کہ اگر ملاقات ہو جاتی تو اس آنکھ کو بھی دیکھ لیتا جسے معبود حقیقی اور محسن انسانیت سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چاہتوں کا کشکول ہونے کی سعادت حاصل ہے۔

کچھ دنوں بعد محبی صبیح رحمانی میرے پاس آئے تو ان کے ساتھ ایک صاحب اور تھے۔ سفید ریش، جاذب نظر سج دھج، کھلتی رنگت، دلکش خدوخال، سرتاپا نستعلیق اور روشن تر مخمور آنکھیں۔ دل کی گہرائیوں سے صدا آئی "یہی ہیں آفتاب کریمی" سبحان اللہ۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے پیر و مرشد حضرت محمود علی شاہ نہ صرف آئینہ خانہ تصور میں جلوہ گر ہوں بلکہ میں ان کو جیتی جاگتی صورت میں اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔

سلسلۂ روز و شب میں کیسی کیسی صورتیں نظر آتی ہیں مگر ان میں سے کچھ کا عکس دروں بینی

احساس میں سدابہار ہو جاتا ہے۔ آفتاب کریمی سے میری قلبی وابستگی کا مسئلہ کچھ ایسا ہی ہے۔ اگر ان کا حمدیہ و نعتیہ کلام نظر نواز نہ ہوتا اور صرف دید و شنید کی رفاقت ہی میرے نصیب میں آتی تب بھی میں اپنے آپ کو ایسی دولت سے مالا مال سمجھتا جس کی قدر و قیمت لفظ و بیاں سے بالا تر ہے۔

حیر سے جولائی ۱۹۹۷ء میں یہ کتاب بھی منظر عام پر آگئی جسے 'اقلیم نعت' کا نقش جمیل کہنا چاہئے۔ کتاب کے فلیپ پر واقعی صبیح رحمانی نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ "جناب آفتاب کریمی کا حمدیہ و نعتیہ کلام ان کی روح کا نغمہ ہے۔"

حضرت جگر مراد آبادی کا ایک شعر ہے۔

نغمہ وہی ہے نغمہ جس کو روح سنے اور روح سنائے

روح کیا ہے اور وہ کیسا نغمہ سننا اور سنانا چاہتی ہے؟ اس سوال کا جواب حرف و صوت سے نہیں بلکہ نواہائے راز کی محرمیت ہی سے مل سکتا ہے لیکن خواجہ الطاف حسین حالی کہتے ہیں۔

محرم بھی ہے ایسا ہی جیسا کہ ہے نامحرم کچھ کہہ نہ سکا' جس پر یاں بھید کھلا تیرا

بہر کیف معرفت کا درجہ علم سے برتر و بالا ہے اور ہم انسانوں کو معرفت کی تھوڑی بہت جھلکیاں لفظ و بیان کی صورت میں بھی مل جاتی ہیں اور بھائی آفتاب کریمی کا حمدیہ و نعتیہ کلام ایسی ہی جھلکیوں سے عبارت ہے۔ نعتیہ کلام کے بارے میں تو اپنے تاثرات اگلے مضمون میں پیش کروں گا فی الوقت حمدیہ کلام کا نقش اول میرے سامنے ہے جسے موصوف نے "ترانۂ حمد" کا نام دیا ہے اور اس کا ابتدائیہ کچھ یوں ہے۔

اللہ ھو اللہ ھو اللہ ھو اللہ ھو وحدہٗ لاشریک لہٗ وحدہٗ

ترانہ کیا اچھی خاصی حمدیہ نظم ہے جس میں دس بند ہیں اور ہر بند چھے چھے مصرعوں پر مشتمل ہے۔ ہر بند کا آخری مصرعہ یہی "اللہ ھو' اللہ ھو' اللہ ھو' اللہ ھو" ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس سے پہلے کا ہم قافیہ مصرعہ "اللہ ھو" کی صدائے روحانی کا پیش لفظ بن کر ابھرتا ہے مثال کے طور پر چند مصرعے ملاحظہ ہوں۔

جس طرف دیکھئے اس طرف تو ہی تو نور میں نار میں خش دی خاص خوٗ

تو یہاں تو وہاں تو عیاں چار سو

اس ترانہ حمد کی نغمگی ایک ایسے دریائے معرفت کا سماں پیش کرتی ہے جس کی صد رنگ موجوں میں الفاظ سچے موتیوں کی طرح جگمگا رہے ہیں۔

یہ زمیں' کہکشاں' بے ستوں آسماں چاند' تارے' فضا' آفتاب جہاں

کوہ و غار و ختن اور آب رواں شان تخلیق کے سارے بیّن نشاں

خیر و شرّ' بحر و برّ' برگ و گل اور ثمر آب و گل' جان و دل' ماہ و سال و قمر

خار و خش رنگ و بو نور و نار و شرر کیسے جھٹلائے گا کوئی جن و بشر

حقیقت وہی ہے جو کلام ربانی کے سورۂ رحمٰن میں بیان فرمائی گئی ہے اور جس کی تشریح و توضیح کے لئے دفتر کے دفتر بھی ناکافی ہیں۔ تاہم آفتاب کریمی نے اپنی ظاہری و باطنی بصیرت و بصارت کے حوالے سے جو کچھ بیان کیا اس میں حیات و کائنات اور ماورائے امکانات کے چند ایسے استعارے و اشارے مل جاتے ہیں جو صرف شاعری نہیں بلکہ کچھ اور بھی ہیں۔

یہ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوع بشر کو اپنے رسولوں، نبیوں اور صحیفوں کی صورتوں میں عظیم نعمتوں سے سرفراز کیا اور ان عظیم نعمتوں میں عظیم ترین نعمت ختم المرسلین ﷺ کی رحمتوں اور برکتوں سے عبارت ہے۔ اس نعمت بے بہا کی بے پناہ چاہت ہی میں دنیا و آخرت کی حقیقی فلاح و بہبود مضمر ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ آفتاب کریمی نے ترانہ حمد میں اس چاہت کا اظہار کیسے کیا ہے۔

سب کتابیں، صحیفے سبھی مرسلیں — لے کے آئے ہیں وحدت کا تیری یقیں
آخری جو نبی آیا سب سے حسیں — ہے وہی میرا دیں میرے دل کا مکیں

تو کرے گا یقیناً اسے سرخرو

اللہ ھو اللہ ھو اللہ ھو

معرفت الٰہی کا اوّلیں و آخریں وسیلہ اور سب غایتوں کی غایت اولیٰ آقائے نامدار سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی تو ہیں۔ اگر حضور پُر نور کی سیرت طیبہ اور اسوۂ حسنہ کا عشر عشیر بھی کسی کے دیدہ و دل میں سما جائے تو وہ حقیقتاً بہت ہی خوش نصیب ہے۔ علامہ اقبال نے ایک فارسی شعر میں فرمایا:

بہ مصطفیٰ بہ رساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبیست

اس فرمودۂ اقبال کی مناسبت سے آفتاب کریمی کا یہ کہنا کہ "ہے وہی میرا دیں میرے دل کا مکیں" کیا معنی رکھتا ہے اپنے دلوں سے پوچھئے اور سوچئے کہ خالق برحق کے سب سے پیارے نبی اور معبود حقیقی کی محبت کو قلب و جاں میں کس طرح بسایا جاتا ہے۔

کریمی صاحب نے "عرض حال" کے طور پر جو حقائق بیان کئے ہیں ان میں پہلی بات تو یہ اچھی لگی کہ ان کے جد امجد عظیم المرتبت پیر رومی کے دیس سے آکر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی دہلی میں بس گئے تھے۔ وہ پیر رومی جنہیں علامہ اقبال نے ہی نہیں قدیم زمانے سے اب تک بڑے بڑے صوفی شعراء نے عرفانیات کے سلسلے میں خراج عقیدت پیش کیا ہے مثلاً حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام سے عقیدت و محبت کی روشن مثالیں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ شاہ صاحب مثنوی معنوی کو روح کی راحت کہتے ہیں۔ بقول ان کے یہ 'روح کی راحت' ان کے وجدان میں 'چشمۂ حقیقت' بن کر موجزن رہی۔ آفتاب کریمی کا حمدیہ و نعتیہ کلام پڑھ کر بھی مجھے یہ احساس ہوتا رہا کہ "از کجا می آید ایں آواز دوست" وہ "آواز دوست" جو رگ رگ میں رباب محبت کی نغمگی پیدا کر دیتی ہے اور پھر۔

کچھ اشک بکھر جاتے ہیں تحریر کی صورت
لکھتی ہیں کبھی حمد، کبھی نعت یہ آنکھیں

سخن سنجی، سخن فہمی اور سخن شناسی تو ان کی میراث ہے جیسا کہ عرض حال سے واضح ہوتا ہے۔ "شاعری مجھے ورثے میں ملی۔ میرے والد، صاحب دیوان شاعر تھے ان کا دیوان "دیوان کریم" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں ایک اور کتاب "انوار طریقت" بھی شائع ہوئی۔ والد صاحب کے مطب پر اکثر اہل علم کی بیٹھک رہتی تھی۔"

اس ضمن میں موصوف نے حضرت جگر مراد آبادی کا ذکر بھی کیا ہے جن کی مشفقانہ قربت نے انہیں شعر گوئی کی جانب مائل کیا۔ جگر صاحب کا ذکر خیر آیا ہے تو ان کے اس شعر پر بھی دھیان دیتے چلیں۔

اے کمال سخن کے دیوانے مادرائے سخن بھی ہے اک بات

کریمی اپنے اشکوں سے جو کچھ لکھتے ہیں اسے ماورائے سخن ہی کے زمرے میں رکھنا چاہئے۔ "نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا" اور یہ پروا ہو بھی کیوں جب قلب و نظر ایک ہی دُھن اور ایک ہی لگن میں مست الست ہوں۔

ہر طرف ذکر ہے نور ہی نور ہے بس خدا پاس ہے ہر کوئی دور ہے

کہتے ہیں کہ "مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔" اس دنیائے فانی میں مظاہر فطرت کی جو کثرت ہے اس میں اصل شہود و شاہد و مشہود کی یکتائی کا عرفان حاصل ہو جائے تو عارف یہ کہنے میں حق جانب ہوتا ہے کہ۔

"میرا سینہ دیکھ لو موجود ہے وہ ہو بہو"

مجھے یقین ہے کہ کریمی نے نہ صرف شاعری کا ذوق و شوق اپنے والد بزرگوار سے پایا بلکہ طریقت' کے آداب عبودیت بھی وراثت میں پائے۔ ان آداب کا اظہار ان کے حمدیہ کلام میں کتنی والہانہ کیفیات کے ساتھ ہوا ہے اگر تفصیلی طور پر بیان کرنا چاہوں تو چند صفحات ناکافی ہوں گے۔ اس لئے چند مثالیں ہی پیش کر سکتا ہوں اور ان مثالوں کے لئے ضروری نہیں کہ پورے پورے اشعار کی صورت میں ہوں۔

وہ نظر ہے کیا نظر جس کو نہ آئے وہ نظر اس کا جلوہ ہر طرف ہے دیکھ لو تم چار سو

تو رب جہاں میں عبد عبد ہے بندہ ترا ہر فرد فرد
میں حمد کہوں بس حمد حمد

لفظ کچھ بھی رہیں حمد تیری کروں لوگ کچھ بھی کہیں حمد تیری کروں
قبر میں جب رکھیں حمد تیری کروں اور سب جب اٹھیں حمد تیری کرو

تمنا تمنا تمنا شکریہ

ہر سمت اس کو دیکھو تو بے شوئی سوئی ہر ہے کون سی جگہ جہاں موجود وہ نہیں

یہ چند جھلکیاں پیش کرنے کا مقصد لفظ و بیان کی صناعی اور شاعری کے فن پر کریمی کی کرم فرمائی نہیں بلکہ میں اس وارفتگی اور خود سپردگی کی کیفیت کو محسوس کرنے پر زور دے رہا ہوں جو حمد کہتے وقت اس حمد یہ کلام کے شاعر کو اپنی تحویل میں رکھتی ہے۔

کریمی نے غزل کی ہیئت میں خوبصورت حمد یہ اشعار کہے ہیں اور اس ہیئت (Form) کے علاوہ نظم اور گیت کی ہیئتوں کو بھی برتا ہے۔ حمد یہ منظومات مسدس، مخمس اور کئی دوسری صورتوں میں ہیں۔ ان میں سے بیشتر کے عنوانات بھی ہیں مثلاً ایک نظم کا عنوان ہے "حمد و ثنا تیرے لئے ہے" اور اس کے ابتدائی حصے میں وہ کہتے ہیں۔

ہر وقت تیری یاد میں یوں محو رہوں میں بس حمد کہوں حمد کہوں حمد کہوں میں
زیبا ہے تجھے حمد و ثنا تیرے لئے ہے تو قائم و دائم ہے بقا تیرے لئے ہے
یہ تیرا کرم ہے کہ تجھے یاد کروں میں بس حمد کہوں حمد کہوں حمد کہوں میں

حمد یہ نظم "زالی شان" میں فرماتے ہیں۔

کیا خوب تری شان ہے ہر روز نرالی توفیق ملے حمد کہوں میں بھی مثالی
ہر شرک سے ہر عیب سے تو پاک ہے مولی جتنا کہ دیا تو نے وہ ادراک ہے مولی
تو واحد و یکتا ہے تری ذات ہے عالی کیا خوب تری شان ہے ہر روز نرالی

ایک نظم "یا رحیم و یا کریم" کے زیر عنوان ہے جس میں قلب شاعر کی بے خودی یہ صدائے دل نواز سناتی ہے۔

"شک نہیں ہے اس میں ہر شئے قبضۂ قدرت میں ہے" اور وہ قبضۂ قدرت سوائے قادر مطلق کے اور کس کا ہو سکتا ہے جو واحد و یکتا ہے۔

انت خالق انت واحد انت تواب الرحیم

چند اور روح پرور حمد یہ نظمیں اور نغمے "تمنائے خاص" "نغمۂ روح" یا پھر کسی عنوان کے بغیر ہیں۔ کوئی عنوان ہو یا نہ ہو اصل مسئلہ تو رشتۂ عبودیت کی استواری کا ہے اور کریمی کا رشتہ اپنے محبوب حقیقی سے کتنی گہرائی و گیرائی لئے ہوئے ہے اس کا اندازہ ان اشعار سے لگایئے جو حمد و نعت کی صورت میں جلوہ گر ہیں اور اس رنگ و آہنگ سے کہ۔

انجام میں تو آغاز میں تو پوشیدہ ہر اعجاز میں تو
آواز میں تو ہے ساز میں تو سب راز ترے ہر راز میں میں

دیکھا، تو کہیں پر جان لیا

ممکن ہے کہاں ہر بات لکھوں

جو باتیں لکھنے میں نہیں آتیں وہ بھی تو انسان کسی سے کہنا چاہتا ہے پھر کیوں نہ کریمی ان راز کی باتوں کو ایسے رازداں سے کہیں جو خاموشی کی زباں سے پوری طرح باخبر رہتا ہے۔ ایسی باتوں کو ان راتوں سے خاص نسبت ہے جو راتیں عابد و عارف کو بیدار رکھتے ہوئے ذکر و فکر، عبادت و ریاضت اور مجاہدۂ نفس میں مصروف رکھتی ہیں۔ آنکھیں اشکوں سے وضو کر کے معبودِ حقیقی سے لو لگاتی ہیں تو کیا کچھ ہوتا ہے جس کا اشارہ ان اشعار میں موجود ہے۔

اشکوں سے وضو کرتی ہیں جس رات یہ آنکھیں — کہہ دیتی ہیں اللہ سے ہر بات یہ آنکھیں

بیداری میں حد سے بھی آگے نہیں جاتیں — ہوں بند تو کرتی ہیں کمالات یہ آنکھیں

وہ کمالات کیا ہیں ان کی وضاحت و صراحت تو میرے خیال میں کریمی بھائی بھی نہ کر سکیں گے بس یوں سمجھ کر جھوم گئے۔

نظر آیا تماشائے جہاں جب بند کیں آنکھیں

صفائے قلب سے پہلو میں ہم نے جامِ جم پایا

"صفائے قلب" کا مسئلہ آسان نہیں۔ آنکھیں بند ہوں یا کھلی رہیں یہ ظاہری آنکھیں تماشائے جہاں سے بالاتر ہو کر جب دل کی آنکھیں کھول دیتی ہیں تو واقعی کایا پلٹ جاتی ہے۔ "آنکھ بنی کشکول" اسی پلٹی ہوئی کایا کا استعارہ ہے۔ "جامِ جم" نے تو صرف تماشائے جہاں دکھایا تھا کریمی کے قلب و نظر نے تماشائے جہاں سے بالاتر ہو کر قادرِ مطلق کی حمد و ثنا میں وہ پُرخلوص دعائیں بھی شامل کر لی ہیں جو روح کی پکار بن کر کلامِ ربانی کی ترجمانی کرتی ہیں اور جہانِ غیب تک رسائی پاتی ہیں۔

قرآن میں دعائیں جو تعلیم کی گئیں — بس وہ دعائیں ہوں ادا میری زباں سے

زبان بھی ایسی کہ سادگی، سلاست، روانی، بےساختگی اور بےتکلفی میں عام بول چال کی دلکشی کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔ اس زبان میں تصنع، تکلف اور ثقالت سے ہٹ کر وہ اسلوبِ بیان بہت ہی پُرکیف ہے جو حضرت امیر خسرو سے لے کر آج تک عوامی مقبولیت میں لاجواب و لاثانی کہا جائے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

رب ہو مورے تم رب ہو سبھی کے ناؤ سبھی کی کھیوت ہو

پار لگاؤ جس کو بھی چاہو قادرِ مطلق، قدرت ہو

وہ نہیں جس کی نہ خبر ہو عرش بریں سے زیرِ زمیں

بات کوئی ہو من میں کسی کے، خوب مگر تم جانت ہو۔

شان تمہاری روز نرالی روز جگا ہے ہر دل پہ
جھولی بھر دو کشکول بھر دو تم روز ہی سب کو دیتے ہو
پاک ہے تو ہر عیب سے مولیٰ حمد کرے کونین تری
تیرے لئے تعریف ہے ساری تم ہی تو رب العزت ہو

اس لہجے میں جو سوز و گداز، حلاوت و لطافت اور کیف و سرور ہے اس کی جھلک "دعائے دل" سے ہندی میں پھر اس طرح اپنی چھب دکھاتی ہے۔

اے رب جی! موری تم لاج رکھو ہیں اپنا مجھے محتاج رکھو
میں بندہ مرے معبود ہو تم میں سجدہ کروں مسجود ہو تم
منزل ہو مری مقصود ہو تم قرآں کو مری منہاج رکھو

بھائی آفتاب کریمی کہتے ہیں۔

جب آنکھ بنی کشکول پھر اشک لٹے انمول

خدا کرے انمول اشکوں سے دھلی دھلائی من بینا کے تار اسی طرح روح پرور نغمے عطا کرتے رہیں۔

عزیز احسن

ایک حمدیہ نظم کا تجزیاتی مطالعہ

ساختیاتی مفکرین کسی متن کی کثیر المعنویت کو اس متن کے تلازمات' حوالوں اور اس میں پوشیدہ مناسبات کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ رولاں بارتھ ایک متن سے دوسرے متون کے اس قسم کے رشتوں کو Intertexts (بین المتنیت) کا نام دیتا ہے۔ کوئی ادبی متن ہواؤں میں معلق نہیں ہوتا اس کا تعلق ضرور اس لسانی نظام میں موجود دوسرے متون سے ہوتا ہے۔ اس متن کی قرأت سے کوئی بھی باذوق قاری یا نقاد اس متن کے دوسرے متون سے انسلاک کو پہچان کر ان کی نشاندہی کر سکتا ہے۔

روسی ہیئت پسندوں کے نزدیک ادب اجنبیانے Defamiliarisation کا عمل ہے۔ شکلووسکی کہتا ہے کہ آرٹ کی تکنیک یہ ہے کہ وہ اشیاء کو اجنبیا دے۔ فارم میں اشکال پیدا کر دے تاکہ محسوس کرنے اور سمجھنے کے عمل میں قدرے دقت ہو اور کچھ زیادہ وقت صرف ہو' کیونکہ محسوس کرنے کا عمل فی نفسہ جمالیاتی کیفیت کا حامل ہے۔

جدید شاعر بیشتر ادب کی رومانوی تحریک کے زیر اثر عقل پرستی کی روایت' اصول فن کا کلاسیکی مزاج بلکہ مذہبی قیود تک سے خاصی حد تک آزاد ہونا چاہتا ہے۔ اس لیے اس کے تصور شعر میں حمدیہ نغمہ بھی اس کے ذاتی جذبے' مخصوص لہجے اور داخلی آہنگ میں گونجتا ہے۔ اس شاعرانہ رویّے کے تحت جو تخلیق وجود میں آتی ہے اس میں نئی شعریات کا عمل کارفرما ہوتا ہے۔ جدید شاعر جب حمد کہتا ہے تو اس میں بھی مذہبی تقدس سے زیادہ شعری جمالیات کی باز آفرینی کی آرزو کا عکس پڑ رہا ہوتا ہے۔

اس پس منظر میں ایک جدید تر شاعر کی ایک حمدیہ نظم کا تجزیہ پیش کر رہا ہوں تاکہ اجنبیانے اور تجدید متن کے عمل کو سمجھا جا سکے۔

میری آنکھیں' میری جان

تیرا عبادت خانہ

اور اپنے لیے اک نارِ جحیم

میرا دل ہرنوں سے لیے

میدان عظیم

اور اپنے لیے اک خانۂ غم

میرا دل تورات کی شان

میرا دل قرآن کریم

میں نے اپنی مٹی اپنا پانی

اپنا خون نہ سمجھا اپنا خون

دیکھ یہ دیوانہ شخص

جس کے لیے لایا ہے کوئی

ایک وصال دوام

ایک چراغ مبین

(قمر جمیل)

قمر جمیل کی یہ نظم مذہبی روایت کی بازگشت، متصوفانہ شعری رویے کی گونج اور مُحکم نظام فکر سے انسلاک کے باوجود نئی شعریات کی باز آفرینی کی عمدہ مثال اور تجدید متن کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس نظم میں جن مضامین کو چھیڑا گیا ہے ان کا تعلق ہماری کلاسیکی شاعری کے غالب رجحان اور صوفیانہ مزاج سے رہا ہے۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ اس نے بین المتنیت (Intertextuality) کے اس عمل میں اپنی بھرپور شاعرانہ صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک وسیع منظر نامہ تخلیق کیا ہے اور اتنی چابک دستی سے مختلف متون کو یکجا کیا ہے کہ روایتی مذاق شاعری رکھنے والے لوگ تو کجا جدید اسلوب اظہار سے مانوس قاری بھی حیرت زدہ ہو جائیں۔

اب ذرا دیکھئے کہ شاعر نے کن کلاسیکی خیالات کی تشکیل نو کا فریضہ انجام دیا ہے اور کس فنکارانہ انداز سے۔

کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے "عنقریب ہم انکو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے نفس میں بھی (حٰم السجدہ آیت نمبر ۵۳) آفاق یعنی کائنات میں جاری و ساری نظام میں اللہ کی نشانیاں ہیں جن میں غور کرنے کی دعوت قرآن کریم نے بارہا دی ہے۔ ہماری کلاسیکی روایات میں تصوف کے زیر اثر جو شاعری ہوئی ہے اس میں جو خیال Under Current کے طور پر مسلسل گردش میں رہا ہے اس کا اظہار بھی اسی طرح ہوا ہے کہ یہ کائنات اپنے خالق کی ذات پاک کی جلوہ گری ہے۔

ایں نقش ہا کہ ہست سراسر نمائش است   اندر نظر بہ صورت دیدار آمدا

ایں کثرتیست لیک ز وحدت عیاں شدہ   ویں وحدتیست لیک بہ اطوار آمدہ!

(مغربی)

غالب نے کہا۔

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے   پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

جب کائنات اسی کی جلوہ گاہ ہے تو اس کو بہ نگاہ تامل دیکھنا بھی عبادت ٹھہرا اور کائنات کا مشاہدہ کرنے والی آنکھیں عبادت خانہ قرار پائیں۔ کلاسیکی شاعر نے کہا۔

جگ میں آکر ادھر اُدھر دیکھا   تو ہی تو آیا نظر جدھر دیکھا

(خواجہ میر درد)

قرآنی زبان میں آفاق کے مشاہدے، فارسی اور اردو کلاسیکی شعری روایت کے اس پس منظر میں قمر جمیل کی نظم کی صرف دو لائنیں دیکھئے۔

میری آنکھیں میری جان

تیرا عبادت خانہ

اگلی لائن میں شاعر کہتا ہے۔

اور اپنے لیے اک نار جحیم

اس لائن میں شاعر نے آفاق کے مشاہدے کے بعد انفس کی جانب توجہ کی ہے اور فراق کی اس آگ کی تپش محسوس کی ہے جس میں مولانا رومؒ سے غالب اور بعد کے کلاسیکی شعرا کے دل جلتے رہے ہیں۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند   وز جدائی ہا شکایت می کند

(مولانا رومؒ)

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا   کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

(غالبؔ)

تیرا ملنا ترا نہیں ملنا   اور جنت ہے کیا جہنم کیا

(آسی غازی پوری)

یہ تمام روایتی متون قمر جمیل کی ایک لائن میں سما گئے اور احساس کی زیادہ شدت کے ساتھ۔

اس دوری اور ناری کا اثر یہ ہوا کہ شاعر کا دل سخت وحشت زدہ ہو گیا۔ اس وحشت کا عملی مظاہرہ اور متحرک منظر نامہ دکھانے کے لیے شاعر نے اپنے دل کو ہرنوں کے لئے ایک وسیع میدان بنا کر پیش کیا۔ آہو کی وحشت زدگی ضرب المثل ہے اور آہوئے رم خوردہ ڈرے ہوئے اور سہمے ہوئے ہرن کو کہتے ہیں۔ غالب نے کہا تھا۔

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں　　میں دشت غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں

اور وحشت کا نتیجہ وہی خوف نایافت۔ یعنی اقبال کی زبان میں

وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی　　مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی

اس تمام کہانی کو قمر جمیل نے ایک لائن میں سمیٹا ہے۔

اور اپنے لیے اک خانۂ غم

آفاق کا نظارہ کرنے والی آنکھوں کے بعد انفس کی نمائندگی کرنے والے دل کی مختلف کیفیات کا شعری مرقع بناتے ہوئے دل کی عظمتوں کا خیال آیا تو شاعر نے مذہبی تقدس اور روایت کا تسلسل ظاہر کرنے کے لیے تورات اور قرآن کریم سے دل کو تشبیہ دے کر روحانی نظام کے زمانی پھیلاؤ کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ یہ شاعر کی منزل عرفان ہے۔ اس کے بعد مشاہدۂ ذات کا مرحلہ اپنی ہستی سے گزر جانے پر آسکتا ہے کہ۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

لہٰذا شاعر کو اپنی مٹی، اپنے پانی اور اپنے خون کی اس ذات کے سامنے بے وقعتی کا احساس ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ مذہبی روایت کی رو سے آدمیت کی عزت کے لیے قربانی کا تصور بھی بڑا مقدس ہے جس نے شہادت کو اعلیٰ مقام عطا کیا۔ دیوانۂ ذات کا حال یہ ہے کہ

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق　　عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

(اقبال)

دیوانگی کا حوالہ دے کر شاعر نے نظم کو کاملیت سے ہمکنار کر دیا جس کے لیے کوئی یعنی خالق کائنات (دیکھیے اس "کوئی" میں روایتی تجاہل عارفانہ بھی موجود ہے) وصال دوام کا مژدہ لایا ہے۔ اس مرحلے پر سورۂ فجر کی دو آیات یاد آرہی ہیں جن میں نفس مطمئنہ کو اللہ رب العزت نے اس طرح مخاطب فرمایا ہے

"اے نفس مطمئنہ! چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو (اپنے انجام نیک سے) خوش (اور اپنے رب کے نزدیک) پسندیدہ ہے۔ شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔"

اور جنت وصال محبوب حقیقی کا مقام ہے۔

پھر وصال دوام کا مژدہ جس ہستی کے طفیل ملا وہ سراج منیر ہے۔ (سراجا منیرا ..... روشن چراغ ..... سورۂ احزاب آیت ۴۶) صلی اللہ علیہ وسلم

قمر جمیل نے "ایک چراغ مبین" کہہ کر بات ختم کر دی جو روحانی نظام فکر کی تکمیل کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہے اور ختم نبوت پر شاعر کے ایمان کا برملا اظہار بھی۔

یہ ہے وہ مذہبی اور ادبی روایات و خیالات کی بوقلمونی (یا وہ طیف Spectrum) جس کے

تناظر میں قمر جمیل نے یہ نظم تخلیق کی ہے۔ اس نظم میں قمر جمیل نے بہت سارے نتائج اور بیان شدہ متون (Texts) کو ایک نئے متن میں ڈال کر بین المتنیت (Intertextuality) کا ایک بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔

قمر جمیل کی اس نظم میں ان کی جذبہ پرستی، تخیل کی آزادہ روی، روایتی طرز اظہار سے گریز اور تصوف سے ان کی دلچسپی کے آثار نمایاں ہیں جو رومانویت (Romanticism) کی طرف ان کے میلان طبع سے آئینہ دار ہیں۔

یہ نظم اپنے منفرد اسلوب اور مکمل شاعرانہ اظہار (Poetical Expression) کے باعث حمدیہ شعری ادب میں ایک اضافہ ہے۔

حمدیں

عمر خیام / صبا اکبر آبادی (مرحوم)

حاصل اسرار وجود

کنہ خردم در خور اثبات تو نیست
و اندیشہ من بجز مناجات تو نیست
من ذات ترا بواجبی کے دانم
دانندۂ ذات تو بجز ذات تو نیست

کیا عقل تری ذات کے پہلو جانے
کیا فکر، صفت تیری سر مو جانے
میں اور بھلا دعویٰ عرفاں تیرا
تو کیا ہے؟ یہ راز فقط تو جانے

جانہا ہمہ آب گشت و دلہا ہمہ خوں
تا چیست حقیقت از پردہ دروں
اے باعلمت خرد رد و گردوں دوں
از تو دو جہاں پر و تو از ہر دو بروں

دل ہوگئے پانی پانی اور خون، جگر
لیکن نہ ہوئی تیری حقیقت کی خبر
ہے عقل کی کیا تاب کہ سمجھے تجھ کو
تو ہے دو جہاں میں، دو جہاں سے باہر

چوں بود من از بود تو آمد بوجود
بے بود تو بود من کجا خواہد بود
تو بودی و بودہ باشی و خواہی بود
بے نبود من از زوال کے خواہد بود

ہونے سے ترے ہوئی ہے یہ بزم بپا
ہوتا نہ اگر تو تو یہاں کیا ہوتا
تو تھا، تو ہے، رہے گا پیہم تو ہی
مٹ جائے گی ہر چیز تجھی کو ہے بقا

ای ذات تو سر دفتر اسرار وجود
نقش صفتت بر در و دیوار وجود
در پردہ کبریا نہان گشتہ ز خلق
بنشستہ عیان بر سر بازار وجود

ہے ذات تری حاصل اسرار وجود
آراستہ تجھ سے در و دیوار وجود
گو پردۂ کبریائی میں ہے لیکن
تو سب پہ عیاں ہے سربازار وجود

ای از حرم ذات تو عقل آگہہ نی
و ز معصیت و طاعت ما مستغنی
مستم ز گناہ و از رجا ہشیارم
اُمید بر رحمت تو دارم یعنی

حالانکہ تری ذات کا عرفان نہیں
جز ذوق گنہ اور کوئی دھیان نہیں
ہوں مست گناہ، پھر بھی اُمید ہے
تو مجھ کو نہ بخش دے یہ امکان نہیں

☆

وقار صدیقی اجمیری (مرحوم)

تو احد ہے تو صمد ہے قادر و قیوم ہے
خالق ہر ہستی معلوم و نامعلوم — ہے

پردہ دار جملہ مخلوقات ستاری تری
عفو کا دریائے بے پایاں ہے غفاری تری

تو حلیم ایسا کہ تیرے حلم سے پست و بلند
ایک ہی انداز الطاف و عطا سے ارجمند

تو علیم علم ہر عالم خبیر مضمرات
تجھ پہ روشن قلب و احساسات کی ہر واردات

تیرے ہی دست تصرف میں عناصر کی لگام
تیرے ہی قبضے میں ہے کونین کا رائج نظام

تیری یکتائی سے روشن ہے ضمیر کائنات
تیری عظمت کے صحیفے کے ورق ہیں شش جہات

حاکمیت تیری ہر شے پر بصد وقعت محیط
کیا فراز عرش و کرسی اور کیا ارض بسیط

برتر از وہم و گماں، باہر حد تفہیم سے
پاک شرک و عجز سے تجسیم سے ترمیم سے

ذرّہ ذرّہ تر زباں ہے صدق سے تسبیح میں
عقل و دانش گم ہیں تیری ذات کی توضیح میں

آرزوؤں کا ہے کعبہ تو دلوں کا مدعا
مالک و مختار ہستی کون ہے تیرے سوا

مہربانی خلق ہے تیرا محبت ہے صفت
بخش دیتا ہے کریمی سے متاعِ مکرمت

شاکروں کا قدر داں ہے صاحبِ حکمت ہے تو
آشکارا ہے جو ہر اک شے سے وہ قدرت ہے تو

فکر کی قسمت ہزیمت کے سوا کچھ بھی نہیں
حاصلِ عرفاں تو حیرت کے سوا کچھ بھی نہیں

کوئی دم خم ہی نہیں اب جرأت انکار میں
اعتبارِ مصطفیٰؐ کام آ گیا اقرار میں

ذوقِ سجدہ کو بھی ہے تسلیم تو مسجود ہے
بندگی تیرے لیے ہے صرف تو معبود ہے

☆

حفیظ تائب (لاہور)

اللہ تعالیٰ ہے جہانوں کا اُجالا
ہر آن ہے روپ اُس کا نیا اور نرالا

ہر موج نفس اُس کی عنایات پہ شاہد
ہر رنگ سحر اُس کی صداقت کا حوالا

سیاروں پہ آثار نمو اُس کے کرشمے
صحرا میں جھلک اُس کی دکھائے گل لالہ

جنگل میں شجر اُس کی توجہ سے ہرے ہیں
ہر نوع خلائق کا وہی پالنے والا

کرتا ہے مداوا وہ پریشانیٔ دل کا
دیتا ہے وہی بیکس و بے بس کو سنبھالا

حق اُس کے محامد کے بیاں کیسے ہوں تائب
وہ فہم سے برتر ہے وہ ادراک سے بالا

☆

حافظ لدھیانوی (فیصل آباد)

چمک دمک ہے ساری تیری سب نظارے تیرے ہیں
ارض و سما میں جتنے ہیں آئینے سارے تیرے ہیں

موج ہوا میں تیری خوشبو، نغمہ نغمہ حسن ترا
ہرے بھرے سب کھیت ہیں تیرے سبز کنارے تیرے ہیں

گلشن گلشن، صحرا صحرا تو نے رنگ بکھیرے ہیں
تجھ سے سطح فلک ہے معاش چاند ستارے تیرے ہیں

تیرا در ہی وجہ سکوں ہے تو سب کا رکھوالا ہے
ہم دکھیارے ہم بیچارے، غم کے مارے تیرے ہیں

حیرت میں عالم ہے سارا دیکھ کرشمے قدرت کے
تیرت پھرتے ہیں جو فضا میں سب نہ یارے؟؟ ہیں

تیرا لطف نہ ہو جو شامل سانس بھی لینا مشکل ہے
سارے کام بنائے تو نے سارے سہارے تیرے ہیں

حمد و نعت میں تو ہی اس کو مضمون نئے بجھائے
حافظ کے اشعار ہیں جتنے سب شہ پارے تیرے ہیں

☆

حفیظ اسعدی (کراچی)

حواس بیش و کم کرکے بہم لکھے تو کیا لکھے
تری توصیف اور میرا قلم لکھے تو کیا لکھے

کسی فکر و نظر کی دست رس میں تو نہیں آتا
تو لکھنے والا تجھ کو بیش کم لکھے تو کیا لکھے

مرے مولا تری حمد و ثنا میں تیرے بارے میں
کوئی کتنا بھی ہو معجز رقم لکھے تو کیا لکھے

قدیم ایسا کہ تیرے ماسوا جو کچھ ہے حادث ہے
کوئی حادث تری شان قدم لکھے تو کیا لکھے

نظر سرشار، دل بوجھل ہے احساس عقیدت سے
سوائے آنسوؤں کے چشم نم لکھے تو کیا لکھے

طبیعت کا تقاضا ہے کہ جو ممکن ہے وہ لکھ دے
قلم کا یہ تکلف کم سے کم لکھے تو کیا لکھے

حنیفؔ اُس کا کرم توفیق کی صورت میں ڈھل جائے
وگرنہ عجز میں ڈوبا قلم لکھے تو کیا لکھے

☆

شبنم رومانی (کراچی)

جو تو نہ بخشے تو دل چاک چاک ہوجائیں
جو تو نہ رحم کرے، ہم ہلاک ہوجائیں

کیا ہے ظلم بہت ہم نے اپنی جانوں پر
گھٹا کرم کی جو برسے تو پاک ہوجائیں

جو تو نے ہم کو ملائک سے بھی کیا افضل
زمیں بھی ناز کرے، ہم جو خاک ہوجائیں

کریں جو ذکر ترا، تیرے شرق و غرب میں ہم
ہمارے شام و سحر تابناک ہوجائیں

خدائے عرش! دعا اہل فرش کی ہو قبول
ترے حبیبؐ کے قدموں کی خاک ہوجائیں

(حوالہ سورۃ الاعراف آیت ۲۳)

اسلم انصاری (ملتان)

بادباں تیرے، ہوا تیری، سفینے تیرے
موج دریا میں بنائے ہوئے رستے تیرے

ذرّے ذرّے کو کیا تو نے چمن زار وجود
نقش عالم پہ بکھرتے ہیں اُجالے تیرے

سب زمینوں پہ اترتے ہیں تری یاد کے چاند
ہر بلندی پہ چمکتے ہیں ستارے تیرے

ہر دبستان تمنا میں ہے تیرا مذکور،
شاخیں تیری ہیں، شجر تیرے، پرندے تیرے

آرزو تیری ہے دریاؤں کے سینوں کا خروش
کف ہر موج لٹاتی ہے خزینے تیرے

کس سے ممکن تری قدرت کے صحیفوں کا شمار
کوہ وصحرا میں درخشاں ہیں جریدے تیرے

ناتوانا کو تواں تو ہی عطا کرتا ہے،
حوصلہ دیتے ہیں ہر دل کو اشارے تیرے

کون اس ورطۂ حیرت سے نکل سکتا ہے
سب مناظر میں کبھی دیکھنے والے تیرے

نقش ہر رنگ میں تیرا ہی بیاں کرتا ہے
رنگ ہر حال میں لکھتا ہے قصیدے تیرے

ذکر کرنے کو ترا پھول زباں بنتے ہیں
تھامے رکھتا ہے ہر اک برگ نوشتے تیرے

وہ فنا ہو کہ عطا، تیری ہی قدرت کا ظہور
وہ خلا ہو کہ ملا، رنگ ہیں سارے تیرے

دل ہر سنگ میں ہے تیرے ہی نغموں کا وفور
سنگ تیرے ہیں، گہر تیرے ہیں، جھرنے تیرے

ہر عبارت کا ہے مقصود ترا ذکر جمال
ہر ستائش کو ہیں منظور ترانے تیرے

☆

علیم ناصری (لاہور)

یارب یہ تمام ارض و سما تیرے لیے ہے
یہ بحر و بر و ابر و ہوا تیرے لیے ہے

یہ عظمت و اجلال تجھی کو ہے سزاوار
یہ مملکت ہر دوسرا تیرے لیے ہے

ہے ذات تری جملہ عبادات کا محور
ہر ولولۂ صدق و صفا تیرے لیے ہے

میری یہ نمازیں مرے سجدے مرے اذکار
ہر قسم کی توصیف و ثنا تیرے لیے ہے

ہیں تیرے لیے گلشن عالم کی بہاریں
یہ بوئے گل و باد صبا تیرے لیے ہے

ہے تیرے لیے ہر شجر و برگ کی تسبیح
ہر طوطی و بلبل کی نوا تیرے لیے ہے

قربانی بز ہو کہ ہوں صدقات و ہدایہ
سب مال و زر و جود و سخا تیرے لیے ہے

تیری ہی عطا ہے مرا سامان خور و نوش
آئینۂ نیت کی جلا تیرے لیے ہے

جینا تری خاطر مرا مرنا تری خاطر
یعنی یہ بقا اور فنا تیرے لیے ہے

ہر لحظہ و ہر لمحہ تری شان کی تغییر
رد و بدل صبح و مسا؟؟ تیرے لیے ہے

ہر خاکی و نوری کی جبیں خم ترے آگے
ہر جذبۂ تسلیم و رضا تیرے لیے ہے

نادم ہے علیم اپنے گناہوں پہ خدایا
کر رحم کہ یہ نغمہ سرا تیرے لیے ہے

☆

ظفر مراد آبادی (بھارت)

جب اجنبی ہو فضا آشنائی دے، تو ہی
گھٹن کے لمحوں سے مجھ کو رہائی دے، تو ہی

و نجوم میں موجود تیرے حسن کی ضو
ہر ایک پھول کے رُخ پر دکھائی دے، تو ہی

کسی کا ذکر کروں، لب پہ تیرا نام آئے
کسی سے بات کروں اور سنائی دے، تو ہی

ترا ہی منشا ہے حاوی مرے ارادوں پر
قدم اُٹھاؤں تو میں، رہنمائی دے تو ہی

ترے ہی حسن کا جادو ہے سارے عالم پر
ہر ایک روپ میں اکثر دکھائی دے، تو ہی

سبب کوئی ہو مسبب مگر ہے تو، یارب
سبھی کو باب اثر تک رسائی دے تو ہی

اُسی کی راہ سے، تجھ کو گریز بھی ہے ظفرؔ
کہ جس کے نام کی اکثر دہائی دے، تو ہی

☆

قمر عباس وفا کانپوری (کراچی)

فکر بشر حیران ہے کیسے وصف خدا تحریر کرے
ایسا کوئی پھول نہیں جو خوشبو کو زنجیر کرے

جادۂ حق پر چلنے والو، صدق طلب کی بات نہیں
منزل اس کے ہاتھ لگے گی جو خود کو تسخیر کرے

ذرّہ ذرّہ تابع فرماں تاب کیسے سرتابی کی
ہوگا وہی جو وہ چاہے گا لاکھ کوئی تدبیر کرے

سہو خطا انساں کی جبلت اور وہ مبرا علت سے
اس کی ذات سے ناممکن ہے بھولے یا تقصیر کرے

اس کی مدحت کا حق شاید تھوڑا بہت ہوجائے ادا
حسن شکوہ لہجہ قرآں کوئی اگر زنجیر کرے

شک وہ کرے اس کی قدرت پر جو یہ قدرت رکھتا ہو
ظلمت شب کو روشنی بخشے سورج بے تنویر کرے

دنیا کی چاہت میں ہم نے توڑ دیا پیمان ازل
خوف خدا ہو دل میں تو کیسے کوئی بشر تقصیر کرے

☆

سید رفیق عزیزی (علیگ) (کراچی)

تو نے تقدیر لکھ دی نفس در نفس
حکمرانی ہے تری نفس در نفس
روز تخلیق ہی مرتسم ہوگئی
تیری عالی جنابی نفس در نفس
تو ہے مختار کل جو بھی چاہے کرے
اپنی مسند سجالی نفس در نفس
ہم ہیں کیا سر بہ سر اک تماشا ترا
تو نے لیلا رچالی نفس در نفس
ہے محاسب بھی اُس کا فقط تو ہی تو
جو قلم رو ہے تیری نفس در نفس
سب کو مختار اعمال بھی کردیا
اور عدالت لگالی نفس در نفس
خود کہانور ارض و سماوات ہوں
رمز وحدت چھپا دی نفس در نفس
اک تجلی فنا اک تجلی بقا
چھب نرالی یہ رکھی نفس در نفس
اے رفیقؔ آپ "کن" کہہ کے چپ ہوگئے
اور وہ آواز گونجی نفس در نفس

☆

اشفاق انجم (بھارت)

ہزاروں رنگ کے منظر ابھارنے والا
وہ ایک لفظ سے پیکر تراشنے والا
اسی کے نام سے کھلتے ہیں بادبانوں کے پر
سمندروں میں وہ کشتی سنبھالنے والا
اندھیری رات میں جگنو کی مشعلیں اس کی
گلوں پہ اوس کے موتی اتارنے والا
ہوا کے دوش پہ بجرے رواں ہیں بادل کے
صدف کی کوکھ میں دریا اتارنے والا
فلک پہ چاند ستاروں کی خوشنما قندیل
گلوں سے خاک کی قسمت سنوارنے والا
مسافران حقیقت کا حوصلہ وہ ہے
وہ پائے عزم سے کانٹے نکالنے والا
صلیب و وادیٔ سینا سے، کوہ فاراں سے
دکھی دلوں کو ادا سے پکارنے والا
زمیں کو کشت کیا، رات نیند سے بھر دی
وہ بے نیاز ہمیشہ وہ جاگنے والا
اُتر رہا ہے وہ، انجمؔ مرے رگ و پے میں
وہ نور، عالم امکاں اُجالنے والا

☆

ثنا گورکھ پوری (کراچی)

حمدیہ رباعیات

تنویر کو وہ رنگ بنا دیتے ہیں
رنگ کو آہنگ بنا دیتے ہیں
جن سات سروں میں گیت گاتی ہے یہ روح
دل لے کے مرا چنگ بنا دیتے ہیں

☆

انوار معانی کو پیمبر کھولے
اسرار معانی کو سخن ور کھولے
تپتی دوپہر میں پھڑپھڑاتی چڑیا
اُڑتی ہے سمندر پہ ثنا پر کھولے

☆

ہر لفظ کے سینے میں اتر جاتی ہے
پھر حد معانیؔ سے گزر جاتی ہے
لیکن ترے آگے مری شعری نخوت
جاتی ہے تو پھر شرم سے مرجاتی ہے

☆

جب ساز اُٹھاتا ہوں صدا دیتے ہیں
گیتوں کی مرے دھن وہ بنا دیتے ہیں
کرتا ہوں میں جب ان کی ثنا تو وہ بھی
آواز میں آواز ملا دیتے ہیں

☆

محمد اظہار الحق (اسلام آباد)

شہنشاہوں کو جس دن بے سروساماں کرے گا
فقیران تہی کیسہ کو بھی حیراں کرے گا

وہ جس نے روشنی اڑتے ہوئے جگنو کو بخشی
مری مشکل بھی اک دن دیکھنا آساں کرے گا

مرے دست دعا پر یہ جو اک قطرہ گرا ہے
اسی قطرے کو اس کا فضل بے پایاں کرے گا

اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں چہرے کے اعضا
وہی اس چشم گریاں کو لب خنداں کرے گا

☆

عزیز احسن (کراچی)

تیرے گواہ ہیں سبھی، شام و سحر، شجر حجر
تیرے ہی ذکر میں مگن، برگ ہوں، پھول یا ثمر

حمد کو تیری چاہیے ایک حیات جاوداں
اور مری حیات ہے لمحوں کی طرح مختصر

دشت تحیر آج بھی پھیلا ہوا ہے ہر طرف
تیری طرف مرے خدا! ہو بھی تو کس طرح سفر

تو ہے محیط کل تو میں ذرّۂ بے عیار ہوں
مجھ کو تو چاہیے فقط ایک ہی لطف کی نظر

قید ہوں میں مکان میں دائرۂ زمان میں
مجھ کو بھی بے کراں بنا ایک نگاہ ڈال کر

رب جہاں دکھا مجھے میری اسی حیات میں
میری تڑپ کے آب و رنگ میری دعاؤں کا اثر

مجھ کو بھی ہوں نصیب کچھ تیرے جہاں میں وسعتیں
تیرے ہی کوہسار ہیں تیرے ہیں سب یہ بحر و بر

مالک کل! بنا مری عمر گریز پا کو تو
اپنے کلام کی طرح دونوں جہاں میں معتبر

تو ہے خبیر تحت و فوق، تو ہے علیم جز و کل
تیری طرح ہیں کوئی کون و مکاں میں باخبر

حمد تیری لکھا کروں، حمد تری پڑھا کروں
تیری ثناء بنی رہے میرے لیے میرا ہنر

☆

شوکت عابد (کراچی)

سازِ دل بھی حمد ہے، سوزِ نہاں بھی حمد ہے
دل ہے گر زندہ تو پھر آہ و فغاں بھی حمد ہے

ہم نفس یہ دل کی دھڑکن ہی نہیں مصروفِ حمد
سن ذرا یہ گردشِ سیارگاں بھی حمد ہے

حمد میں مشغول ہے سارا جہانِ آب و گل
شورِ دریا اور سکوتِ آسماں بھی حمد ہے

حمد ہے ہر اک نظارہ چشمِ روشن کے لیے
لفظ جب خاموش ہوں، دل کی زباں بھی حمد ہے

دین اور دنیا کی منزل ایک ہوجائے اگر
کارِ دل بھی حمد اور کارِ جہاں بھی حمد ہے

☆

ثاقب انجان (کراچی)

امبر مہر کواکب ماہ	لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
لاکھ شواہد لاکھ گواہ	لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
شاخ شجر گل برگ گیاہ	لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
پربت ٹیلے میداں راہ	لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
ندی نالے پوکھر چاہ	لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
جھیل سمندر تھاہ اَتھاہ	لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
بادل بجلی سبز و سیاہ	لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
دھرتی، امبر راہ بہ راہ	لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
بستی ہو یا شہر پناہ	لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
کیسی فوج اور کس کی سپاہ	لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
کیسی حکومت کس کے شاہ	لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
انجاؔن ان سے لاگ نہ چاہ	لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

☆

حافظ عبدالغفار حافظ (کراچی)

تار رگ جاں چھیڑا یہ کس نے آیا لبوں پر "الحمدللہ"
ذکر خدا سے ہوگئیں سانسیں میری معطر الحمدللہ

الحمدللہ، الحمدللہ، الحمدللہ، الحمدللہ

ملتی ہے ہم کو بھیک اُسی کی کھاتے ہیں ہم سب رزق اسی کا
صبح ازل سے اُس کے کرم کی سر پہ ہے چادر الحمدللہ

الحمدللہ، الحمدللہ، الحمدللہ، الحمدللہ

مژدۂ رحمت ذکر خدا ہے، باعث نعمت شکر خدا ہے
دل کی بشاشت، روح کی تسکیں، نطق کا جوہر "الحمدللہ"

الحمدللہ، الحمدللہ، الحمدللہ، الحمدللہ

بزم جہاں میں اپنی زباں میں کرتے ہیں سب ہی شکر الٰہی
شاخوں پہ ہیں جو چڑیاں چہکتی، کہتی ہیں مل کر "الحمدللہ"

الحمدللہ، الحمدللہ، الحمدللہ، الحمدللہ

موت کا مجھ کو خوف نہیں ہے، روز جزا کا رنج نہیں ہے
میرے نبی ہیں رحمت عالم، شافع محشر الحمدللہ

الحمدللہ، الحمدللہ، الحمدللہ، الحمدللہ

نہلا چکو جب تم مری میت، تیار جب ہوجائے جنازہ
لکھ دینا یارو بہر عنایت میرے کفن پر "الحمدللہ"

الحمدللہ، الحمدللہ، الحمدللہ، الحمدللہ

دُکھ ہو کہ سکھ ہو، شادی ہو یا غم لازم ہے اُس کا شکر بہردم
کوئی ہو عالم، ورد زباں رکھ حافظ مضطر "الحمدللہ"

الحمدللہ، الحمدللہ، الحمدللہ، الحمدللہ

☆

منصور ملتانی (کراچی)

جو میرے تصرف میں ہے دولت ہے اُسی کی
ہر سانس جو لیتا ہوں عنایت ہے اُسی کی

کم ظرف کو بھی رزق کی کثرت سے نوازے
یہ اُس کا تحمل ہے یہ شفقت ہے اُسی کی

ہر رنگ میں سو رنگ ہیں ہر روپ میں سو روپ
وہ خالق فطرت ہے یہ فطرت ہے اُسی کی

وہ حسن کے جلوے ہوں کہ پرکیف نظارے
ندرت ہے اُسی ذات کی قدرت ہے اُسی کی

چڑیا بھی لڑے سانپ سے بچوں کو بچالے
پر ہاتھ اُسی کا ہے یہ قوت ہے اُسی کی

خود وقت ہے مصروف ثنا روز ازل سے
ہر آن جو بجتی ہے وہ نوبت ہے اُسی کی

محشر میں سوا نیزے پہ سورج ہے تو کیا ہے
جب سایہ فگن بندوں پہ چاہت ہے اُسی کی

پیغام مبیں دے کے جو محبوب کو بھیجا
قرآن اُسی کا ہے یہ رحمت ہے اُسی کی

منصورؔ میں جاں دے بھی چکا دار پہ لیکن
زندہ ہوں جو اب تک یہ مشیت ہے اُسی کی

☆

افضال احمد انور (فیصل آباد)

فکرِ سخن ہے قبلہ رُو   دھرتی ہے رشکِ مینو
یزداں، مولا، رام، گرُو   اندر جملہ اسماء اُو
اللہ اللہ اللہ ھُو
اللہ اللہ اللہ ھُو

ہر آواز میں اُس کی لے   ہر اک چیز ہے اُس کی شے
بستہ اُس کے ذکر سے ہے   مالا، تسبیح اور جنیؤ
اللہ اللہ اللہ ھُو
اللہ اللہ اللہ ھُو

لا معبودَ اِلا ھُو   لا مسجودَ اِلا ھُو
لا مقصودَ اِلا ھُو   ہر شے فانی، باقی اُو
اللہ اللہ اللہ ھو
اللہ اللہ اللہ ھو

انجم انجم نور اُس کا   ذرّہ ذرّہ طُور اُس کا
ہر بربط منصور اُس کا   ہر گل میں اُس کی خوش بو
اللہ اللہ اللہ ھو
اللہ اللہ اللہ ھو

سب سے اونچی ذات اُس کی   ہر ہر جا نفحات اُس کی
ہر بولی میں بات اُس کی   اُس کا ہر صحرا ہر جُو
اللہ اللہ اللہ ھُو
اللہ اللہ اللہ ھُو

خشک و تر کا خالق وہ   نیک و بد کا رازق وہ
ہر اوّل کا سابق وہ   اُس کا ہر اک پہ قابو
اللہ اللہ اللہ ہو
اللہ اللہ اللہ ہو

خود کوزہ خود کوزہ گر   ہر صورت میں جلوہ گر
ہر شے کے اندر باہر   ہر پہلو اُس کا پہلو
اللہ اللہ اللہ ہو
اللہ اللہ اللہ ہو

کوئی نہیں ہے اُس جیسا   دانا بینا بے پروا
مالک مشرق مغرب کا   قائم قادر اور خوش خو
اللہ اللہ اللہ ہو
اللہ اللہ اللہ ہو

☆

افضل الفت (کراچی)

اے خدائے لم یزل اے مالک ارض و سما
خالق برحق ہے تو کوئی نہیں ثانی ترا

یہ نظام بزم ہستی تیری قدرت کا کمال
تو ہے رب العالمیں، تو مالک یوم جزا

ہر جگہ موجود ہو کر بھی نظر آتا نہیں
ذرّے ذرّے میں نمایاں ہے مگر جلوہ ترا

بحر و بر دشت و جبل نخل و ثمر ماہ نجوم
حاصل بزم جہاں ہے تیری عظمت واہ وا

یہ سمندر کا تلاطم اور دریاؤں کا شور
آبشاروں کا ترنم یہ خنک بادصبا

جھومتی کالی گھٹائیں، بادلوں کی گھن گرج
خشک اور پیاسی زمیں کو ابر نہلاتا ہوا

صبح سحر انگیز و دلکش کی ترنم ریزیاں
عندلیبان چمن ہوتے ہیں جب نغمہ سرا

موسموں کا یہ تغیر، روز و شب کا سلسلہ
دن کو سورج کی تمازت، رات کو ٹھنڈی ہوا

یہ مہکتے پھول باغوں میں چہکتی بلبلیں
کیف میں ڈوبے ہوئے موروں کا رقص دل رُبا

یہ سبھی کچھ اصل میں تسبیح تیری ہی تو ہے
کر رہے ہیں در حقیقت سب تری حمد و ثنا

بزم توحید و رسالت میں ہے، ربّ عز و جل!
تیرا ذکر و ورد اور نعت محمدؐ مصطفا

اِک فقط باقی رہے گی تیری ذات باصفات
ختم ہوجائے گی جس دم یہ نمود بے بقا

اوّل و آخر بھی تو ہے افضل و اعلیٰ بھی تو
قادر مطلق ہے بیشک تیری ذات کبریا

☆

عزیز الدین خاکیؔ (کراچی)

یہ روپوش ہے کون؟ جاناں نظر میں
عیاں کس کی ہیں خوبیاں خشک و تر میں

ملا مجھ کو تیرا ہی عرفاں خبر میں
تجھے میں نے دیکھا نمایاں نظر میں

رگ جاں ہے کیا؟ تیرا قرب مسلسل
تو پھر کون ہے یہ نہاں برگ و بر میں

ترے سامنے جب بھی سجدہ کیا ہے
اُتر آئی ہے کہکشاں سنگ در میں

کہوں کیا کہاں تیرا جلوہ نہیں ہے
نہاں شام میں یا کہ پنہاں سحر میں

سوائے ترے اور ہے کون یارب!
بشکل جمال حسیناں نظر میں

الٰہی! ترا بندہ ناچیز خاکیؔ
پھرے آخرش کیوں پریشاں نگر میں

☆

صبیح رحمانی (کراچی)

نشاں اسی کے ہیں سب اور بے نشاں وہ ہے
چراغ اور اندھیرے کے درمیاں وہ ہے

نمود لالہ و گل میں وہی ہے چہرہ نما
شجر شجر پہ لکھا حرف داستاں وہ ہے

اسی کی ذات کے ممنون خدوخال حیات
کہ اور کون ہے صورت گر جہاں وہ ہے

ہر اک افق پہ اسی کا دوام روشن ہے
جو شے ہے فانی ہے بس ایک جاوداں وہ ہے

اسی کی یاد لہو سے کلام کرتی ہے
ہے جس کے ذکر آباد شہر جاں وہ ہے

سکوت نیم شبی میں پکارتا ہوں اسے
کہ میں ہوں درد کی دستک دراماں وہ ہے

زبان اشک سے مانگو دعائیں بخشش کی
بڑا رحیم، نہایت ہی مہرباں وہ ہے

اسی کی مدح میں لو دے رہے ہیں حرف صبیح
سخن کا نور ہے وہ لذت بیاں وہ ہے .

☆

مُبین مرزا

''انتخابِ حمد'': ایک تبصرہ

ہماری شاعری کے سوا کسی اور صنفِ ادب نے کم کم ہی مذہب سے رشتہ اُستوار کیا ہے۔ اس کم اعتنائی کی ذمہ داری اصنافِ ادب پر عائد ہوتی ہے یا مذہب پر، یہ الزام چاہے جس کے سر آئے، واقعہ یہ ہے کہ اس کم تعلقی کے باعث نقصان صرف اور صرف ادب کا ہوا ہے۔ اور معاملہ یہ ہے کہ ادب تہذیبِ انسانی کے ان مظاہر و اقدار میں سے ہے کہ جن کا نقصان براہِ راست تہذیبِ انسانی (عرفِ عام میں انسانیت) کو پہنچتا ہے۔

رہا سوال اُس تعلق کا جو شاعری نے مذہب سے اُستوار کیا ہے تو اس کی مثال بھی اُس دل لگی ایسی ہے جس میں دور سے تاک جھانک اور گاہے گاہے کسی ایک آدھ رمزیہ جملے سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری شاعری میں مذہب ایک جزو، ایک عنصر یا ایک حوالے کے طور پر تو نظر آتا ہے لیکن ایک طرزِ زیست یا مکمل تجربۂ حیات بنتا دکھائی نہیں دیتا... مراد یہ ہے کہ وہ ہماری شاعری میں ایک زندہ اور بھرپور تجربے کی صورت اختیار نہیں کر پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ادب و مذہب کے باہمی تعلق سے تخلیق ہونے والی نگارشات پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ مذہب ہمارے ادب کا زندہ تجربہ کیوں نہیں بن سکا؟ ہم ٹنز پریسٹس ٹیل، ڈیوائن کامیڈی اور پیراڈائز لاسٹ ایسی تخلیقات کیوں نہیں پیش کر سکے؟ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں اہلِ مذہب اور اہلِ ادب کے مابین ایک فصل ہے اور طرفین نے اسے ذمہ داری سے برقرار رکھا ہے۔ ایک طرف مذہب سے مراد ٹخنوں سے اونچی شلوار اور ٹوپی پہننے، سال میں دو چار بار دیگیں چڑھانے اور سماجی قسم کی تقریبات میں کچھ دینی قسم کی باتیں کرنے کے ہیں۔

دوسری طرف اہلِ ادب کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اس رویّے کو دقیانوسی سمجھتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اہلِ ادب اور اہلِ مذہب کے درمیان ایک مسلسل سرد مہری پائی جاتی ہے۔ دونوں طرف کے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ان کی اپنی اپنی الگ دنیائیں ہیں جو الگ الگ اصولِ حقیقت رکھتی ہیں۔ چناں چہ ادب جس زندگی کو پیش کرتا ہے وہ اہلِ مذہب کی زندگی سے مختلف ہے اور ان کے ہاں ممنوعات کے درجے میں آتی ہے۔ اِدھر اہلِ ادب مذہب کے خیالات و افکار سے رجوع کرنا دقیانوسیت پر محمول کرتے ہیں۔ لہٰذا پوری زندگی کا تجربہ اپنی کلّیت میں ان کے یہاں نظر ہی نہیں آتا۔ جہاں کہیں مذہب کی چُھوٹ ادب و شعر پر پڑتی نظر آتی ہے وہ زندگی کے پورے دائرے کو منوّر کرنے کے بجائے اس کے ایک آدھ حصے کو روشن کر کے رہ جاتی ہے۔ ایسے میں بھلا ادب سے یہ توقع کیوں کر رکھی جاسکتی ہے کہ وہ مذہبی تجربہ و احساس سے آمیز ہو کر زندگی کے نئے معانی کی دریافت اور تشکیل کا فریضہ انجام دے۔ یوں بھی اس وقت ہمارے یہاں ادب بجائے خود کوئی مقصد نہیں رہا بلکہ بعض دیگر مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ بن چکا ہے۔ ہمارے بیش تر اہلِ ادب کی ابتری کا عالم یہ ہے کہ وہ لوگ جو ادب کو ذریعہ بنا کر کامرانیوں کی منزلیں سر کرنے میں مصروف ہیں، انھیں ادب کی کامیابی اور اثر آفرینی کی مثال سمجھا جاتا ہے۔ خیر یہ ایک الگ موضوعِ بحث ہے، کہنا اس وقت یہ ہے کہ اس صورتِ حال میں ہم ادب و مذہب کی آمیزش سے جس تخلیقی و معنوی کرشمے کی آرزو رکھتے ہیں، اس کا ظہور کارِ دارد...!

قارئینِ کرام! تمہید طولانی ہوگئی حالاں کہ قصہ مختصر سا تھا۔ مجھے دو چار باتیں ”انتخابِ حمد“ کے حوالے سے کرنی ہیں۔ خیر اب آئیے اس کتاب کی طرف، یہ چھ سو چودہ صفحات پر مشتمل اردو کی حمدیہ شاعری کا انتخاب ہے جسے غوث میاں نے محنت و کاوش سے ترتیب دیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں مرتب کا لکھا ہوا ایک مقدمہ بھی درج ہے جس میں انھوں نے آغاز سے تا حال حمدیہ مجموعوں اور ان کے انتخاب کے بارے میں تحقیقی حوالوں کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ غوث میاں کے معیارِ تحقیق پر تو محققین ہی بات کرسکتے ہیں، میں تو نقد و نظر کے حوالے سے ہی کچھ عرض کرسکوں گا۔ میرا خیال ہے انھوں نے جس انداز سے اور جن تفصیلات کے ساتھ یہ مقدمہ لکھا ہے اس سے واضح طور پر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے موضوع کے سیاق و سباق سے واقف ہیں۔ یہ قابلِ داد امر ہے کہ آدمی جس موضوع پر کام کرے خواہ کام ترتیب و تالیف ہی کا کیوں نہ ہو، وہ اس کے سیاق و سباق کا واضح شعور رکھتا ہو۔

تحقیق و تعارف کی حد تک تو غوث میاں کا مقدمہ ٹھیک نظر آتا ہے لیکن اس مقدمے

سے ہمیں اس بات کا کچھ اندازہ نہیں ہوتا کہ ان کے نزدیک حمد کی علمی، ادبی قدر و قیمت کیا ہے؟ انھوں نے اس مقدمے کے آغاز میں چند ایک مذہبی حوالے جو دیے ہیں وہ تو دوسروں سے اقتباس کی گئی آرا ہیں، اس باب میں ان کا اپنا نقطۂ نظر کیا ہے، اور وہ حمد کو اردو کی شعری روایت میں کس طرح سفر کرتا ہوا دیکھتے ہیں؟ حمدیہ شاعری جس معنویت کی تشکیل کرتی ہے وہ ہماری شعری روایت کے معنوی تسلسل میں کس طور شامل ہوتی ہے؟ بہ حیثیتِ صنفِ سخن اب تک حمد کی فنی و فکری achievements کیا ہیں؟ مختلف ادوار میں حمد کے فکری اور اسلوبیاتی تجربے ادب میں ہوئے ہیں کہ نہیں اور اگر ہوئے ہیں تو ہم اس حوالے سے کیا اسلوبیاتی تغیر دیکھتے ہیں؟ ادب و شعر کی تاریخ میں ہم جن مختلف تحریکوں اور نظریات کو اثرانداز ہوتا ہوا دیکھتے ہیں کیا ان کے اثرات حمدیہ شاعری پر بھی ہوئے ہیں اور اگر نہیں تو اس کی وجہ کیا ہے؟ ان اور ایسے ہی کچھ دوسرے فکری نظری مباحث پر بھی اس مقدمے میں کچھ گفتگو ہوجاتی تو اچھا تھا۔ کیوں کہ اس طرح آئندہ کام کرنے والوں کو اس موضوع پر نہ صرف ایک بہتر نمونہ میسّر آتا بلکہ انھیں نئے زاویے سے کام کرنے کی تحریک بھی ہوتی۔

اس انتخاب کے آغاز میں جیلانی کامران، عزیزاحسن اور صبیح رحمانی کے مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں۔ ان مضامین کا مزاج عمومیت کے ساتھ تعارف و تقریظ ایسا ہے۔ ان میں جن مسائل پر گفتگو کی گئی ہے وہ پیش پا افتادہ ہیں۔ حمدیہ ادب اور اس کے فکری مباحث پر مضمون نگاروں نے جس طور بات کی ہے اس سے نہ تو ادب کی مابعدالطبیعیاتی جہت کا کوئی نیا سوال یا کوئی دقیق نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے اور نہ ہی ہمیں حمدیہ ادب کے تنقیدی مطالعے کی کسی میزان کا سراغ ملتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضامین محض مرتّب کا دل بڑھانے کی غرض سے لکھے گئے ہیں، حمدیہ ادب کے تنقیدی مطالعے سے انھیں کچھ ایسا سروکار نہیں ہے۔ جیلانی کامران صاحب سے بالخصوص یہ توقع تھی کہ وہ اس موضوع کو گہرائی میں جاکر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کریں گے لیکن انھوں نے نہایت سرسری باتوں اور سامنے کے حوالوں سے کام چلایا ہے۔ ان کا مضمون کسی کلاس روم میں دیا گیا ایک ایسا لیکچر معلوم ہوتا ہے جس کا مقصد محض موضوع کا تعارف ہو۔ ان ایسے سینئر لکھنے والوں کی ایسی تحریریں عصری نقد و نظر سے ہماری مایوسی میں اضافے کا سبب بنتی ہیں۔

انتخاب کی بابت گفتگو کی کچھ زیادہ گنجائش نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ انتخاب اصل میں ہر شخص کا ایک ذاتی پسند ناپسند کا معاملہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں اختلافِ رائے کا بہت امکان ہوتا ہے۔ ہر انتخاب میں کچھ نہ کچھ نام ہمیشہ ایسے ہوتے ہیں جو متنازع ٹھہرتے ہیں، کچھ شامل ہونے

کی وجہ سے اور کچھ شامل نہ ہونے کی وجہ سے۔ یہ انتخاب بھی ظاہر ہے کہ اس اختلاف سے مبّرا نہیں ہوسکتا۔ غوث میاں نے اس انتخاب میں متقدمین و معاصرین میں زیادہ سے زیادہ ناموں کو شامل رکھا ہے (خاص طور سے معاصرین میں) ان ناموں کو بھی جن کا ادبی قد وقامت تک ابھی متعین نہیں ہوا۔ یہاں ایک بات اور قابلِ ذکر ہے۔ وہ یہ کہ حمد ونعت کے جو انتخاب ترتیب دیے جاتے ہیں ان میں ہم خاص طور سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ انتخاب کرنے والا زیادہ سے زیادہ ناموں کو شامل کرنا چاہتا ہے۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ حمد ونعت لکھنے والا کوئی نام انتخاب میں شامل ہونے سے رہ نہ جائے۔ اس تگ و دو میں انتخاب کا معیار بھی متاثر ہوتا ہے۔ تاہم اس کی وجہ یہ ہے کہ انتخاب کا یہ سلسلہ اصل میں انتخاب سے اتنا سروکار نہیں رکھتا جتنا کہ اس کا تعلق حمد ونعت کی ضخیم سے ضخیم تر دستاویز کی تالیف سے ہوتا ہے۔ گویا ابھی تو صرف حمد ونعت کی تالیف کا زمانہ چل رہا ہے۔ خیر اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں بلکہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ نہایت موزوں اور قابلِ قدر بات ہے کہ پہلے سب سرمایہ سامنے آجائے اس کے بعد اگلے کسی دور میں ان شاء اللہ اس کے انتخاب کا کام بھی ہوسکے گا ـــــــ اور حقیقی معنوں میں حمد ونعت کا معیاری انتخاب اسی وقت ہمارے سامنے آئے گا جب اس کا زیادہ سے زیادہ سرمایہ ہماری دسترس میں ہوگا۔ غوث میاں نے بڑی لگن اور محبت کے ساتھ اپنا کام کیا ہے۔ اللہ انھیں جزائے خیر اور مزید کام کی توفیق اور ہمت دے۔

OOO

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

"قلم سجدے" ــــــ ایک تاثر

جناب لالہؔ صحرائی اردو شاعری میں اس اعتبار سے ایک عجیب و غریب اور منفرد مثال ہیں کہ چند سال پہلے تک انہوں نے کبھی شاعری نہیں کی تھی، لیکن اب وہ اپنی حمدیہ و نعتیہ منظومات کے چار مجموعے مرتب کر کے شائع کر چکے ہیں جبکہ خالص نعتوں پر مشتمل پانچ مجموعے غیر مطبوعہ صورت میں ترتیب دے چکے ہیں۔ ۱۹۹۰ء تک وہ ایک صاحب طرز اور مرصع کار نثر نگار کی حیثیت سے خاص شہرت رکھتے تھے اور افسانہ، ڈرامہ، تجزیاتی و سوانحی مضامین کے علاوہ وہ طنز و مزاح میں بھی اپنا ایک اسلوب رکھتے تھے اور اس حوالے سے درجنوں غیر مدون تحریروں کے علاوہ ان کے دو نثری مجموعے منصۂ شہود پر بھی آ چکے تھے، لیکن بہر حال وہ شاعر نہیں تھے اور شاعرانہ مزاج کی بہت سی خصوصیات سے تہی دامن تھے۔

لیکن جولائی ۱۹۹۰ء میں موصوف محترم نے یکایک نعت نگاری شروع کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے چار ماہ کے اندر انہوں نے ایک سو سے زیادہ نعتیں لکھ ڈالیں۔ جو "لالہ زار نعت" کی صورت میں شائع بھی ہو گئیں۔ اس کا سبب انہوں نے یہ بیان فرمایا کہ رحمت خداوندی سے انہیں جو بار بار حج اور عمرے کی سعادت حاصل ہوتی رہی، وہ وہاں تواتر سے حضور حق میں دعا کرتے رہے کہ کاش اللہ تعالیٰ مجھے نعت کہنے کی توفیق عطا فرما دے۔" اور حیرت انگیز طور پر یہ دعا قبول ہو گئی اور گزشتہ چند سالوں میں انہوں نے سیکڑوں نعتیں لکھ ڈالی ہیں۔ جن میں نبی اکرم ﷺ سے گہری محبت اور شیفتگی بھی ہے، کمالات سیرت النبی ﷺ کے لئے گہرا ادراک بھی، موضوعات کا تنوع بھی ہے اور فنی پختگی بھی۔ چنانچہ جناب موصوف کے فن نعت گوئی کو احمد ندیم قاسمی، عاصی کرنالی، مشفق خواجہ اور محمد صلاح الدین شہید کے علاوہ متعدد معروف شعرا اور تبصرہ نگاروں نے قدر اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے۔

میرے پیش نظر لالہ صحرائی کی منظومات کا مجموعہ "قلم سجدے" جو تمام تر حمدیہ نظموں پر مشتمل ہے اور اپنے موضوع کے اعتبار سے یقیناً یہ بھی اردو شاعری میں ایک اچھوتی یا شاید اکلوتی مثال ہے کہ کسی شاعر نے اپنا ایک مجموعۂ کلام سارے کا سارا اللہ تبارک و تعالیٰ کی حمد و ثناء کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ جس میں غزل کی ہیئت میں ایک سو نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات اقدس کے

لئے گہرا اخلاص اور احترام پایا جاتا ہے اور مختلف حوالوں سے ذات باری کے بارے میں اپنے احساسات کا اظہار کیا گیا ہے۔ چنانچہ ان میں اللہ کی عظمت و جلالت کا بیان بھی ہے' آیات الٰہی کا گہرا ادراک بھی اور ذات حق کے فضل و احسان کا ذکر بھی۔ پھر جگہ جگہ توحید کی اہمیت' شرک کی تکذیب' عقائد کی درستی اور اعمال کی صحت کا بیان بھی کثرت سے نظر آتا ہے اور اس حقیقت کی جانب اشارے بھی کہ تعلق باللہ سے یقین و ایمان کی نعمت عظمیٰ حاصل ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ منظومات میں شریعت اسلامی کی برکات کا ذکر بھی ہے اور کردار کی ان خوبیوں کا بیان بھی جو توحید کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں۔ متعدد مقامات پر خیر و شر کی جنگ کے حوالے سے مجاہدین اور جہاد فی سبیل اللہ کو بھی خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ جبکہ نفاق اور دورنگی سے بیزاری کا اظہار بھی نمایاں ہے۔

غرض "قلم سجدے" کے مطالعے سے محض خالی خولی رسمی انداز کے تعلق کی جائے اللہ رب العزت سے ایک ایسی وابستگی اور عبدیت کا محکم احساس ہوتا ہے جو ہمہ جہت ہے' متحرک ہے اور جس میں شاعر اللہ تعالیٰ کو حی و قیوم اور سمیع و بصیر ہستی سمجھتا ہے اور پورے یقین اور شعور کے ساتھ سمجھتا ہے۔ اس ضمن میں بطور مثال بے شمار اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں۔ خوف طوالت سے چند پر اکتفا کرتا ہوں۔

دعا:

حرم کے صحن میں بیتِ منور کا حسین منظر　　　سعادت بخش پھر مجھ کو اسی کی دید کی' مولا

بساؤں تیری خوشنودی کا جذبہ اس طرح دل میں　　　کہ جو چاہے تو اے مولا' اسی کو بر ملا چاہوں

عظمت الٰہی

مالک ہے سلطنت کا فقط رب ذوالجلال　　　مصدر تمام طاقتوں کی اس کی بارگاہ

ہیں تیرے معجزات و کمالات بے حدود　　　محمود اپنی ذات میں تو آپ ہی ہوا

آیات الٰہی

آیات رب سے ہو گئی تزئین شش جہات　　　شان خدا کا عکس ہے ہر منظر حیات

جہاں میں جابجا آیات دے کر　　　نقاب رخ کو سرکایا ہے کس نے

اللہ کے فضل واحسان کا ذکر

اپنے ہی اعمال پر اے دل نہ تکیہ کیجیو　　　اس کی رحمت کے بنا ہے مغفرت امر محال

مرے مقدر میں جتنے سجدے ہوئے ہیں، میری ہے وہ سعادت
یہ میرے لب پر ثنا کا نغمہ ہے تیری ہی رحمتوں کا صدقہ

متفرق

میں نے توفیق خدا سے پا لیا نور یقیں　　　چھٹ گیا میری بصیرت سے گمانوں کا دھواں

بے نور اس کی آنکھ ہے، بے نوا اس کا قلب　　　دیکھے نہ جو جہان میں آیات کردگار

بخشا نہ جائے گا کوئی اعمال کے طفیل　　　لازم ہے اس میں ہو تری رحمت کی بھی رضا

"قلم سجدے" کی دو اضافی خصوصیات قابل ذکر ہیں۔ اول تو سو فیصد نظمیں سات اشعار پر مشتمل ہیں۔ ثانیاً ہر نظم کا آخری شعر نعتیہ ہے اور اس میں نبی اکرم ﷺ کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے یا حب نبی ﷺ کے حوالے سے شکر و امتنان کا ذکر ہے۔

لالۂ صحرائی کی شاعری سادگی و پرکاری کا خوبصورت مرقع ہے۔ دلکش، مترنم بحروں کے انتخاب نے اکثر نظموں کو سحر حلال بنا دیا ہے۔